یش پال کی
منتخب کہانیاں

مرتبہ
راجندر یادو

مترجم
راشد سہسوانی



ہندوستانی کتابوں کا سلسلہ

یش پال کی منتخب کہانیاں

مرتبہ
راجندر یادو

مترجم
راشد سہسوانی

نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا

سرورق تصویر © جتن داس

ISBN 81-237-2783-6

پہلا اردو ایڈیشن 1999 (ساکا 1921)

Yashpal Ki Muntakhab Kahaniyan *(Urdu)*

قیمت: 95.00

ناشر: ڈائرکٹر نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا

اے۔۵، گرین پارک، نئی دہلی۔ 110016

فہرست

دیباچہ

1966ء کے پہلے دن، میں کوچین میں تھا، کل ہند مصنفین کانفرنس میں شرکت کے لئے کچھ دوستوں نے کنیا کماری جانے کا پروگرام بنایا تھا۔ ڈیڑھ سو کلو میٹر کے سفر کے لئے بس اور کشتی کا انتظام تھا، لیکن دل نے اچانک فیصلہ کیا کہ وہاں نہیں جانا چاہئے۔ راکیش اور دیگر دوستوں نے بتایا تھا کہ کنیا کماری اب زیادہ قابل دید ہو گئی ہے۔ دویکانند چٹان پر شاندار مندر بن گیا ہے۔ چاروں طرف بازار اور پارک ہیں۔ لیکن مجھے محسوس ہوا کہ یہی بات شاید میں برداشت نہیں کر پاؤں گا۔ میرے دل میں تو بسا تھا 52-1951ء کا غیر ترقی یافتہ اور تصنع سے پاک جزیرہ۔ جب ڈاکٹر رام ولاس شرما، امرت لال ناگر اور میں، ہم تینوں مغربی ساحل سے جنوب کے سفر پر گئے تھے اور ایک دن، ایک رات، کیپ ہوٹل (Cape Hotel) میں ٹھہرے تھے۔ چاروں طرف وسیع ریگ زار، لال اور سفید دھاریوں والا حفاظتی حصار اور مندر ــــ سامنے سرکش سمندر اور اس کے بیچ دویکانند شلا۔ تیز سمندری ہواؤں میں اڑتی ریت اور تین اطراف میں پھیلے سمندر کی گرج.... پندرہ برس سے دل میں بیٹھی اس کنیا کماری کو آج کے جدید میک اپ والے پکنک اسپاٹ میں بدلا ہوا دیکھنا شاید میرے تصور کے لئے ایک صدمہ ثابت ہوتا۔

اس وقت یوں لگ رہا تھا جیسے میں غیر محسوس طور پر یش پال کی ایک کہانی کی عملی تفسیر بن گیا ہوں۔ کسی محبوبہ یا منگیتر نے ایک بانکے سجیلے نوجوان کو دل میں بسایا ہوا ہے۔ مگر جب وہی شخص پندرہ بیس برس بعد پردیس سے (جہاں وہ کسی جیل میں بند تھا) واپس آتا ہے تو اس "ادھیڑ" کے "دیدار" کو وہ برداشت نہیں کر پاتی۔ "کیا اسی "ادھیڑ" کے لئے میں نے اپنی زندگی برباد کر ڈالی؟" (کہانی: "محبت کا صلہ")

اور اب یہی ڈر تھا، چالیس پینتالیس سال بعد خود یش پال کی کہانیوں کے تمام

مجموعوں کو ایک ساتھ پڑھتے ہوئے۔ -- اب کیسی لگیں گی یہ کہانیاں؟ اٹھارہ بیس سال کی عمر میں یش پال کی تخلیقات ہمارے لئے گیتا کا درجہ رکھتی تھیں۔ سرخ گردپوش والی کتابوں کو ساتھ لے کر چلنا "انقلاب" کے "بم" کے ساتھ گومنے کی طرح کا سنسی خیز عمل تھا۔ کہانیوں اور ناولوں سے زیادہ یش پال کی اپنی شخصیت چھائی ہوئی تھی۔ چندر شیکھر اور بھگت سنگھ کے رفیق کار ہونے پر نازاں۔ مڈبھیڑ کے وقت آخری گولی کے بعد ہی پکڑے جانے کا حوصلہ۔ پھانسی کی سزا کا فیصلہ ہوجانے کے باوجود جیل میں ہی پرکاش وتی جی سے شادی کرنے کی تمنا۔ پھر قلم کے سہارے لکھنؤ میں عیش وعشرت اور عزت کے ساتھ بسر اوقات۔ لکھنؤ میں کوٹھی لے کر اپنی تخلیقات یا "بغاوت" کی اشاعت۔ "صاحب" لوگوں کی طرح کوٹ پینٹ' ٹائی اور چروٹ والا رعب دار افسر۔ کرشنا سوبتی کے الفاظ ہیں : کہاں تو ہندی کا پان چباؤ "دھوتی باز رگھوپتیا" مصنف اور کہانی کر پٹین صاحب کی سج دھج••• زندگی کے ہر موڑ پر سرکشی۔-- اور اس کی تصانیف ہمیں بتا رہی تھیں انقلابیوں کی تاریخ' مارکس کے تصورات کا غیر استحصالی سماج•••• راہل جی کے "والگا سے گنگا" اور "بھاگو نہیں' دنیا کو بدلو" کے ساتھ۔ -- بعد میں اسی فہرست میں اور بہت سے لوگ شامل ہوگئے۔ جینندر' اگیئے' بھگوتی شرن اپادھیائے' ایلا چندر جوشی••• مگر اس وقت صرف دو مصنف نوجوان دلوں کے ہیرو تھے۔ یش پال اور راہل سانکر تیاین۔ اقتدار اور سماج دونوں کو چیلنج کرنے کی جسارت کرنے والے مصنفین' لفظ "ایڈونچر" شاید ہمیں ان سے باندھے ہوئے تھا۔ جنوب کے ڈیڑھ مہینے کے سفر کے پیچھے بھی کہیں راہل کا "گھمکڑشاستر" تو کام نہیں کررہا تھا؟

لیکن اب' یش پال کی تمام کہانیوں کو پڑھنا ایک دوسرا تجربہ تھا۔ پرانی چھاپ' اور نئے ردعمل کے درمیان تال میل پیدا کرنے میں یقیناً دشواری ہوئی۔ اعتراف کرنا پڑا کہ یش پال بہت بڑے دانشور ہیں' ایک ایسے ذہین اور بیدار مغز مصنف جن کے یہاں ہمدردی سے زیادہ منطق نظر آتی ہے۔ ان کے ہم عصر' جینندر اور اگیئے بھی کم ذہین نہیں ہیں۔ مگر یش پال ان دونوں سے زیادہ 'روکھے' ہیں۔ جینندر کے یہاں ایک عجیب اور بے لاگ معصومیت ہے۔ وہ بھٹکے ہوئے لگتے ہیں' کسی راہ کی تلاش میں

سرگرداں، وہ راستہ تلاش کرنے کی تحریک پیدا کرتے ہیں۔ لیکن وہ جہاں ہیں وہاں معنی آفرینی کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ تمانت اور غیر محسوس ہمدردی ہی ان کے رخت سفر میں سب سے اہم اشیاء ہیں۔ انہیں وہ باہر سے لیے گئے ہتھیار کی طرح نہیں بلکہ باطنی قوت کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ان کے کرداروں کی دنیا حالات کے سامنے سپر انداز لوگوں سے آباد ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ راضی بہ رضا" رہنے والے کہانی کار ہیں۔ کبھی کبھی جھنجلاہٹ بھی ہوتی ہے کہ ان کی ہیروئنیں بغیر کسی شکایت کے یہ سب کچھ کیوں برداشت کرتی رہتی ہیں۔ بغاوت یا احتجاج کیوں نہیں کرتیں؟ بعد کے افکار یا نگارشات میں تو انہوں نے اس عدم مزاحمت کو ہی اپنا فلسفہ بنالیا ہے۔ ان کے کرداروں کی اذیت ناکی آج بھی دل کو پگھلا دیتی ہے۔ یہی اذیت ناکی دوستوو سکی کو مذہب کی سرحدوں تک پہنچا دیتی ہے۔ جینندر رمزیت کی سرحدوں سے لوٹ آتے ہیں۔ وہ متعدد جہتوں اور پر پیچ راہوں والے کہانی کار ہیں۔ ایک ساتھ کئی کئی پہلو پیش کرنے والے، تراشیدہ ہیرے کی پرتوں والے افسانہ نگار۔ انہوں نے عورت کو بالعموم اذیت کا ہدف بننے والے کردار کے طور پر منتخب کیا ہے۔ دوستوو سکی کے برعکس تیاگ پتر' (استعفیٰ) ان کی اس طویل کہانی کا ہی نہیں بلکہ ان کے سارے ابتدائی افسانوی ادب کا عنوان ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے یہ بے مزاحمت سپر اندازی انہیں گاندھی واد سے ملاتی ہو۔

ایک ہی عہد اور معاشرے میں رہنے والے لوگوں کے مسائل عموماً یکساں ہوتے ہیں۔ یش پال، جینندر، اگیئے، تینوں میں چند باتیں مشترک ہیں۔ متوسط طبقے کی بیداری کا ادراک، برسراقتدار طبقے یا حکومت کے خلاف جدوجہد میں انقلابی شعور، آریہ سماج سے متاثر ذہن اور عورت۔۔ جینندر کی تو ساری تصانیف کی دھری، سیکس، اقتدار اور دولت کے آس پاس گھومتی ہے۔ وہ آریہ سماج اور گاندھی واد کی اقدار کو تسلیم کرنے کے باوجود ان تینوں کی غیر مزاحمتی قوت سے انکار نہیں کرتے۔ اس لئے عموماً وہ ستم رسیدہ لوگوں کی طرف سے عدم مزاحمت کو جائز ٹھہرانے والی کہانیوں کے مصنف کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ مجھے ان کی فکر میں گاندھی وادی اقدار اور آریہ سماجی روایات کو نامنظور کردینے کا پہلو زیادہ نظر آتا ہے۔ وہ فطری نظر آنے کی کوشش

میں زیادہ مشکل اور پیچیدہ بن جاتے ہیں۔ چونکہ ان کے افکار اور غیر متوقع حالات کے درمیان عدم مطابقت ہوتی ہے اس لئے دونوں کو بیک وقت قبول کرلینے سے تصادم یا تناؤ کا بھی احساس ہوتا ہے۔ یہ دو رخی کہیں کہیں روحانیت کا لبادہ پہنے بھی نظر آتی ہے۔

سماجی حالات کو تقدیر کا نتیجہ سمجھتے اور اس طرح رنج و غم کو عظمت کا درجہ دینے یا محض منطق کے سہارے اسے جیوں کا تیوں تسلیم کرنے کے اس جیندری رجحان کو سختی کے ساتھ رد کرتے ہیں یش پال، اور چھوٹ کر بھاگنا چاہتے ہیں اگیئے۔ وہ شاعر بھی ہیں اس لئے حسن کی غیر محسوس اشکال اور اس کے اسرار کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ انجانی راہوں اور غیر معمولی کیفیتوں کی تلاش انہیں بھٹکنے پر مجبور کرتی ہے۔ ان کے افسانے ان ہی "یاتراؤں" میں اکٹھے کیے گئے نمونے ہیں۔ یہ نمونے کبھی تو ہمیں اپنی طرف مائل کرتے ہیں، کبھی حیران و ششدر کردیتے ہیں اور کبھی کبھی تو کوئی خاص اثر چھوڑنے میں ناکام بھی رہتے ہیں۔ لیکن وہ ہمیشہ تلاش، تجسس اور پرکھ کا تقاضا کرتے نظر آتے ہیں۔ کم از کم انہیں مد فاضل سمجھ کر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ جینندر حزن و ملال اور افسردگی و پژمردگی کے کہانی کار ہیں (چیخوف کی طرح) جبکہ اگیئے احتجاج اور ہیجان کے۔ ان کے یہاں یہ احساس ہے کہ "ابھی بہت کچھ ہے۔ بس اس تک جانا اور اسے حاصل کرنا ہے۔" وہ اس بیداری اور شعور کے مالک ہیں۔ ان کے یہاں ترغیب سے زیادہ تحریک ہے۔ ناولوں کے برعکس اگیئے کی کہانیوں میں رفتار کا احساس ہوتا ہے۔ اگرچہ "روز" یا "گنگرین" میں وہ جینندر کی ست روی کے زیادہ قریب ہیں، پھر بھی اگیئے کا جغرافیہ بہت وسیع ہے۔ وقت اور سماج ان کے یہاں انفرادی تجربات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے کردار ذاتی ہمدردی کی بنا پر کھڑے ہوتے ہیں اس لئے وہ دیگر کرداروں سے الگ نظر آتے ہیں۔

ان دونوں کے مقابلے میں زیادہ پختہ زمین پر کھڑے ہیں یشپال۔ ان کی واحد مستثنیٰ کہانی ہے "مکریل" جو اگیئے کے جذبہ ہمدردی کے زیادہ قریب ہے۔ وہ شاید اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ جامد اور مسدود معاشرے کو تبدیلی کیے بغیر یا کم از کم اسے جھنجھوڑے بغیر انسان کی نجات ممکن نہیں ہے۔ اپنے حالات، تعلقات، معلومات اور

حلقۂ اثر کے لحاظ سے یش پال ان سب سے زیادہ وقت بستہ (Dated) کہانی کار ہیں۔ جینندر اور اگیئے اپنے حلقے اور زمانے دونوں سے تجاوز کر جاتے ہیں۔ یش پال کو پڑھتے ہوئے آج بھی اس زمانے اور سماج کو دھیان میں رکھنا پڑتا ہے۔ یہاں مجھے وہ پریم چند کے زیادہ قریب محسوس ہوتے ہیں، حالانکہ پریم چند کے ابتدائی دور کی ناپختگی (بالخصوص، ان کی اب تلاش کرکے نکالی گئی کہانیوں کی جیسی) ان تینوں کہانی کاروں میں نہیں ہے۔ یا تو یہ تینوں شروع سے ہی بالغ رہے ہیں یا پھر بالغ ہونے کے بعد افسانہ نگاری کے میدان میں آئے ہیں۔ اگیئے کی ابتدائی دور کی کہانیاں ناپختہ ہو سکتی ہیں لیکن ان میں بچکانہ پن نہیں ہے۔ کم از کم مجھے ایسا محسوس نہیں ہوتا۔

پریم چند اور یش پال کی کہانیاں زمانہ حال کے سماج اور ذہن کی دستاویزی کہانیاں ہیں۔ دونوں ہی ادب کے ذریعہ سماج کا ذہن بدلنا چاہتے ہیں۔ انداز فکر ایک کے پاس گاندھی وادی ہے اور دوسرے کے پاس مارکس وادی۔۔ کہانیاں ان کی سماجی سرگرمی کا ہتھیار ہیں، تعیش وزیبائش یا ادبی جوہر کی نمائش کا وسیلہ نہیں۔ دونوں کی ادبی کاوش کے موضوع ہیں، استحصالی سماج اور نو آبادیاتی اقتدار۔

یش پال مسلمہ اقدار اور مروجہ نظام کو ایک جارحانہ انداز میں توڑتے ہیں۔ ان اقدار کی لغویت کو نمایاں کرتے ہوئے پریم چند اولاً ادھر ادھر بھٹکتے ہیں پھر واپس وہیں آجاتے ہیں۔ (کفن، سدگتی، سوا سیر گیہوں، ٹھاکر کا کنواں، پوس کی رات، اس کلیہ سے مستثنٰی ہیں)۔ بنیادی طور پر ان کی کہانیوں کی ساخت بہت سادہ ہے۔ غیر مساعد حالات اور ذہنی تناؤ کے سبب فرد اور خاندان میں تصادم ہوتا ہے۔ نوبت رشتے ٹوٹنے تک پہنچ جاتی ہے۔ اچانک کسی ایک کے ضمیر کی بیداری سب کچھ سنبھال لیتی ہے۔ پریم چند کے ناقدین نے اسے "دل کی تبدیلی" یا "ہردیہ پریورتن" قرار دیا ہے۔ چاہیں تو یہاں جین کتھاؤں کے "یکش" یا شیطان کے ذریعہ انسان کی گمراہی اور آخرش "سچائی کی فتح" کے عقیدے کی پرچھائیں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ پریم چند کسانوں اور اچھوتوں کے استحصال سے غمگین ضرور ہیں لیکن استحصالی سماج کی بنیادی اقدار کو "ہندوستانیت" بھی مانتے ہیں۔۔ کم از کم خاندانی رشتوں کے معاملے میں۔ ان کا خیال ہے کہ خود غرضی اور لالچ باہمی رشتوں کے درمیان غلط فہمی کی دیوار کھڑی کر دیتے ہیں

لیکن جذباتیت اور قدامت پرستی کے طوفانوں سے گذرنے کے بعد ان کے کردار ڈرامائی تبدیلی کے ساتھ واپس آجاتے ہیں۔ جذباتی کیفیت اور رشتوں کی نوعیت پھر پرانی سطح پر واپس آجاتی ہے۔ یہاں حقیقی صورت حال اس کے محرکات ولوازمات اور ان تمام حالات کو بدل ڈالنے کی ضرورت کو نہیں دیکھا جاتا بلکہ ان سے وابستہ اقدار کو بچانے اور برقرار رکھنے کی نیک نیت میں روایات وعقائد کو دائمی انسانی قدروں کے طور پر' یا "شیو" کے متبادل کی شکل میں تسلیم کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر شرد چندر کی طرح پریم چند کا "آشیرواد" استحصالی اقدار کے تحفظ اور حمایت کا دوسرا نام ہے۔ حالانکہ وہ استحصالی سماج کے مخالف ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے گویا سماجی نظام اور اسے تشکیل دینے والی اقدار کا باہمی تضاد اور تفاعل ان پر واضح نہیں ہے۔ ان کا خیال ہے کہ سماج بگڑ گیا ہے مگر اس کی قدریں صحیح ہیں۔ بلکہ سماج بگڑا ہی اس لئے ہے کہ ان قدروں پر عمل نہیں ہوتا۔ آج بھی اگر حقیقی اخلاقی قدروں کو زندگی میں اتار لیا جائے تو ساری پریشانیاں دور ہوسکتی ہیں۔ اور تب ہی آئیڈیل انسان' خاندان اور سماج کی تشکیل ہوسکتی ہے۔ شاید یہی گاندھی واد ہے۔ متذکرہ بالا استثنائی کہانیوں کے ستم رسیدہ کردار اپنے مروجہ نظام سے لڑتے نہیں ہیں۔ البتہ اس کے ذریعہ کچل دیے جاتے ہیں۔ یہ مظلوم کردار' شکست ہی جن کا مقدر ہے' طبقاتی نظام کی اس سب سے نیچے کی سطح تک پہنچا دیے جاتے ہیں جہاں خودکشی کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ ان کی زندگی غیر انسانی سلوک اور وحشیانہ طرز عمل کی خوفناک مثال پیش کرتی ہے۔ اس وحشت بربریت نے انہیں جانوروں کی زندگی گذارنے پر مجبور کردیا ہے۔ یہ بے رحمی اور کرداروں کی صلح پسندی ہی مروجہ نظام کے خلاف غم وغصہ پیدا کرتی ہے۔

اور ان ہی اقدار اور عقائد اور مروجہ نظام کو ٹھکرادینے کے رجحان سے شروع ہوتا ہے یش پال کی کہانی کا سفر۔ وہ اس بات کو مانتے ہیں کہ حالات بدلنے سے اقدار بدل جاتی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ انداز فکر بھی۔ وہ عقائد کو ترقی کی راہ میں رکاوٹ سمجھتے ہیں ان کا خیال ہے کہ نیا سماج لانے کے لئے ان تصورات وعقائد سے لڑنا ہوگا۔ اس لحاظ سے یش پال بھی "اصول پسند" یا "آدرش وادی" معلوم ہوتے ہیں۔ اگر پریم چند کا "آدرش" ایک خاص طبقے کے لئے پسندیدہ اور موجودہ نظام کے تحت

قابل قبول ہے اور اسے ارضی حقیقت کہہ کر "ستیہ، شو اور سندر" کی نئے سرے سے تفسیر کی جارہی ہے تو یش پال کا آدرش ہے مارکس وادی انداز فکر پر مبنی، اور تحقیقاتی کشاکش سے آزاد ایک غیر استحصالی سماج کی وکالت۔ ان کے برعکس پریم چند انسان کے بنیادی "شو" میں یقین رکھتے ہوئے قدیم بنیادی نظام کو چند اصلاحات کے ساتھ واپس لینا چاہتے ہیں۔ یش پال ان اقدار کو "ساختی" استحصال پر مبنی، غیر سائنسی اور غیر منطقی کہہ کر ان پر بے رحمانہ حملہ کرتے ہیں تاکہ نئے سماج کی تعمیر کے لئے راستہ صاف ہوسکے۔ اور یہ تبدیلی انداز فکر میں تبدیلی کے ذریعہ ہی لائی جاسکتی ہے۔

یش پال اسی لئے مجھے سماجی موضوعات پر جرح یا بحث کرنے والی کہانیوں کے مصنف زیادہ لگتے ہیں۔ وہ عموماً ہر جگہ موجودہ سماجی نظام کی برقراری کے حامیوں یا "حال پرستوں" سے مناظرہ کی "پرشورامی" کیفیت میں الجھے نظر آتے ہیں۔ اپنی ناقابل تردید اور "حال پرستوں" کے اندرونی انتشار اور باہمی مخالفت کے سبب وہ اتنے حوصلہ مند ہوگئے ہیں کہ حال پرستوں کے قلعے میں گھس کر انہیں للکارتے ہیں۔ پران کتھاؤں پر مبنی تقریباً ایک درجن کہانیاں اس بات کا ثبوت ہیں۔ ان کے بارے میں ان کی زندگی میں ہی شدید مباحث بھی اٹھے ہیں۔ یہاں ان کی کہانیوں کو تین حصوں میں بانٹا جاسکتا ہے۔ پرانوں کے عہد کی کہانیاں، شہری متوسط طبقے کی کہانیاں اور قصبوں اور دیہات، بالخصوص قبیلوں اور پہاڑی علاقوں کی زندگی کی کہانیاں۔ پریم چند کے بعد ہندی کے وہ شاید آخری کہانی کار ہیں جنھوں نے مسلمانوں اور عیسائیوں کی زندگی پر ایمانداری سے لکھنے کی کوشش کی ہے۔

اپنی اس بحث میں یشپال کچھ بنیادی سوال اٹھاتے ہیں جن پر روایت پرست یا تو عام طور پر خاموش رہتے ہیں یا پھر ان حالات کو دوامی یا ناقابل تغیر سمجھ کر مطمئن۔ ان سوالات کی تاریخ انسانی وجود سے وابستہ رہی ہے۔ ان کے بارے میں کسی طرح کا شک وشبہ کیا جائے، یہ بات کوئی بھی ماضی پرست یا رواج پرست برداشت نہیں کرسکتا۔ ان پر بحث یا نظر ثانی کا تقاضا کرنے والی نگارشات انقلابی یا قابل اعتراض مانی جاتی ہیں۔ آدمی کا وجود بجائے خود تین خارجی اشیاء سے وابستہ ہوتا ہے، عورت کے ساتھ، فطرت کے ساتھ اور باقی ماندہ سماج کے ساتھ۔ ان میں سے مقدم کون ہے اور

مؤخر کون؟ یہ انڈا اور مرغی والی بحث ہے۔ البتہ یہ بات عیاں ہے کہ ان تینوں کے ساتھ تعلق اور اس تعلق میں توازن قائم کرنے سے قلب ونظر اور کردار کی ترقی ہوتی ہے۔ اپنے وجود یا عدم وجود کے سوالات اور قدرت کے پراسرار کرشموں کی تلاش وجستجو نے شعور باطن، عبادت وریاضت اور غیبی طاقتوں کے انسانی اشکال میں تجسم کے تصورات کو ترقی دی۔ اور اس کا نتیجہ فلسفیانہ غوروفکر کی صورت میں ظاہر ہوا۔ تولید، نگرانی اور تحفظ نے عورت مرد کے درمیان رشتوں کو "خاندان" یا "کنبہ" نام کی انسٹی ٹیوشن بنادیا۔ اور باہمی تعاون، تحفظ، توازن یا امن کی ضرورت نے دوسروں کے ساتھ سماجی اور کاروباری تعلقات کا تعین کیا۔ مختصرا یہ کہ دھرم، اخلاق اور سیاست، ان تین بنیادی موضوعات سے الجھتے ہوئے انسان نے اپنی تہذیب اور تمدن کو ترقی دی، جس اہتمام کو ہم "نظام" کہتے ہیں، اس کی تشکیل ان ہی تین حقائق سے ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ارتقائی سفر میں فطرت کے ساتھ ہمارا رشتہ ویسا نہیں رہ گیا ہے جیسا ہزاروں سال پہلے تھا۔ اسی طرح عورت، خاندان اور باقی سماج سے ہمارے تعلقات کی نوعیت پہلی جیسی نہیں رہی ہے۔ ارتقائی سلسلے، تبدیلی اور تغیر کے عمل میں ان کی ہیئت اور وسعت میں بھی تبدیلی آئی ہے۔ علاقے بدلے ہیں۔ سرحدیں بدلی ہیں۔ لاتعداد شاخیں پیدا ہوئی ہیں۔ تحفظ، اشتراک عمل، اور امن کی خواہش کے تحت مروجہ نظام کی برقراری کے لئے جو اخلاقی ضابطے وضع کیے گئے ہیں، ان کی تشریح اور ان پر عمل کی خاطر پنچایتیں اور مذہبی درس گاہیں وجود میں آئیں۔ ریاست کی تشکیل ہوئی۔ سیاسی اقتدار کا تعین ہوا۔ جیسے جیسے آدمی اپنے وجود سے متعلق مسائل کو اپنے سے زیادہ اہل افراد کے ہاتھوں میں سونپتا گیا، خود غرضی اور اقتدار کے مراکز ابھرتے گئے۔ اولاً، پراسرار روحانی قوتوں کے دعویدار دھرم نے از خود اور بعد میں طاقتور افراد کے اشتراک سے انسان کی ساری زندگی، کردار، اور انداز فکر پر کنٹرول کے لئے تحفظ فراہم کرنے کے بہانے اقدار، روایات اور اسلحہ جات کی تخلیق وتعمیر کی تاکہ انتظامیہ کے بے روک ٹوک عمل کے لئے راہ ہموار ہوسکے۔ ابتداء میں احکام اور ضابطے ضرورتاً عمل میں آئے لیکن بعد ازاں رفتہ رفتہ تہذیب کا حصہ بنتے گئے۔ ضروری نہیں کہ مروجہ نظام کی برقراری کے حامی لوگ ہمیشہ ہی سیاسی اقتدار اور حکومت میں

شامل رہے ہوں، لیکن اقتدار کے مراکز سے دور رہ کر بھی وہ ایسے اجتماعی قواعد وضوابط کے ذریعہ سماج پر کنٹرول کرتے رہے جو عوام کے مزاج میں سرایت کر چکے تھے۔ ہزاروں برس سے ذہنوں میں پیوست اس توہم پرستی کا نتیجہ یہ ہوا کہ غلاموں کے ہاتھوں کو باندھ کر رکھنے والی ہتھکڑی بدلتے بدلتے "چوڑی، سنگار" بن گئی۔ ثقافت نے چوڑی کو سہاگ کی علامت قرار دیا اور اسے متبرک بنادیا۔

ہزاروں برس سے پیوستہ ان تصورات کو جھنجھوڑنے اور توڑنے والے افراد وقتاً فوقتاً منظر عام پر آتے رہے ہیں، لیکن ان میں خاص طور سے قابل ذکر ہیں ڈارون، فرائڈ اور مارکس۔ ابتداء میں ہم دیوتا تھے لیکن بتدریج بونے ہوتے جارہے ہیں، اس عقیدے کی تردید کی ڈارون کے "نظریہ ارتقاء" نے۔ ہمارے اندر روح اور ایشور نہیں۔ ہمارے تشنگی کے پرتو ہیں۔ اوپر سے لادے گئے اجتماعی ضابطے ہی ذہنی انتشار اور زوال کے لئے ذمہ دار ہیں۔ یہ بتایا فرائڈ نے اور انسانی تہذیب کا ارتقاء، ہمارے تصور کے برعکس، من مانے ڈھنگ سے نہیں ہوتا بلکہ اس کے پیچھے ہوتی ہیں کچھ حریف طاقتیں اور چند محرکات۔ یہ تصور قایم کیا جدلی مادیت کے نظریے کے تحت مارکس نے۔ ظاہر ہے کہ مروجہ نظام کے بنیادی ستون کو منہدم کرنے والے مفکرین ہی انتہا پسند انقلابی مانے گئے اور ان سب ہی نے ماضی کی جنتوں کو موہوم قرار دیا۔ ایسی تصانیف کو "بے حد قابل اعتراض" یا "قابل ضبطی" بتایا گیا۔ یش پال کے انداز فکر کو جاننے اور ان کے کہانی کے تصور کو سمجھنے کے لئے اس جدید ذہن کو سمجھنا بیحد ضروری ہے کیوں کہ ہندی کے افسانوی ادب کو جدید تصورات سے روشناس کرانے والوں میں وہ پہلے بیباک مصنف ہیں۔

یش پال مارکسزم کے اعلانیہ مبلغ ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے اپنے ساتھی سردار بھگت سنگھ کے تصورات کو اپنا رہنما بنایا ہے۔ انہوں نے سماجی تبدیلی کے لئے ذہنی بیداری پیدا کرنے کی خاطر کہانی کا رسالہ منتخب کیا ہے۔ مبلغ ہونے کا الزام وہ بخوشی قبول کرتے ہیں۔ ان کا موقف ہے کہ جس شخص کے پاس اپنا خیال ہے وہ اسے دوسروں تک ضرور پہنچائے گا۔ افکار کی تبلیغ سے بے نیاز ہونے کا مطلب خیالات و افکار سے عاری ہونا بھی ہے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ یش پال اپنے مباحث میں اپنے

آریہ سماج سے وابستگی کے زمانے کے مناظرے اور استدلال کی طرف ہمیشہ راغب رہے ہوں، اس لئے ان کا بحث اور استدلال کا انداز وہی ہے۔

نوآبادیاتی اقتدار یا برطانوی سامراج کی مخالفت انہوں نے "ساگ" (ٹھیک اسی موضوع پر میں نے تیس سال پہلے مہا شویتا دیوی کی ایک کہانی پڑھی تھی۔) اور "انگریز کا گھنگھرو" جیسی ایک آدھ کہانی کو چھوڑ کر اپنے ناولوں میں کیا ہے۔ "دادا کامریڈ، دیش دروہی، میری تیری، اس کی بات" کے کردار انگریزی حکومت سے لوہا لینے والے افراد کی نمائندگی کرتے ہیں۔ انہیں ایک وسیع فضا کی ضرورت ہے۔ کہانیوں میں جاگیر دارانہ طور سے ان کا مضوع رہی ہے۔ پرانوں کے عہد، شہری متوسط طبقے، اور پہاڑوں یا قبیلوں کے غریب لوگوں سے آباد ہے ان کی کہانیوں کی دنیا۔ شاید ان کا موقف ہے کہ جاگیردارانہ انداز فکر، اور عورت مرد کے تعلقات سے متعلق اخلاقی ضوابط ہماری رگ میں سرایت کرچکے ہیں۔ اور انہوں نے ایک تمدن کی شکل اختیار کرلی ہے آدمی کے تحت الشعور میں دھرم اور اخلاق تقریباً ایک ہوگئے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے ان کے حملے کا خاص ہدف رہی ہیں جنسی اخلاقیات اور اس کی مختلف اشکال اور جنسی تقاضوں کو دبانے اور کچلنے سے پیدا ہونے والی خرابیاں اور برائیاں، یا پھر شہری متوسط طبقے کی نمائشی زندگی۔ یہاں وہ سب سے زیادہ بیباک مصنف اور ایک مجاہد نظر آتے ہیں۔ رام ولاس شرما کے جیسے ناقدین نے انہیں غیر مہذب اور جنسی بے راہ روی کا کہانی کار قرار دے کر ان کی شدید مذمت کی ہے۔ جواباً یش پال انہیں "آریہ سماجی" ذہن کا نقاد قرار دیتے ہیں اور اسی ذہن کے خلاف ان کی اصلی لڑائی ہے۔ سیکس (جنسی تعلقات) پریم چند کے یہاں ممنوع ہے اور پہاڑی اور ایلا چندر جوشی کے یہاں داخلی دنیا کا واحد پیچیدہ مسئلہ ہے۔ ان پر فرائڈ سے متاثر ہونے کے الزامات ہیں۔

جہاں تک سیکس کی واضح تصویر کشی کا تعلق ہے، یش پال اس معنی میں "غیر مہذب" نہیں ہیں جس طرح "انگارے" کے عہد کے اردو مصنفین رہے تھے، یا بعد میں عصمت چغتائی اور سعادت حسن منٹو رہ چکے ہیں۔ وہاں سیکس لگ بھگ ایک دھماکے یا ذاتی نوعیت کی رومانی بغاوت کی صورت میں دکھائی دیتی ہے۔ یش پال کے

لئے وہ ایک ایسی سماجی مسئلہ ہے جو تہذیب کا لبادہ پہن کر انسان کی افکار اور سماجی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بن کر کھڑا ہوا ہے۔ یہ بندشیں کہیں تو محض ڈھونگ اور نمائش ہیں اور کہیں مذہبی توہم پرستی۔ اور یہ سب عورت اور مرد کے تعلقات کو بدلتے حالات کی روشنی میں دیکھنے سے گریز کرتی ہیں۔ یہ بنیادی حقائق سے منھ موڑنے کے مترادف ہے۔ سیکس نے نہ تو دھرم کی بندشوں کو قبول کیا ہے، نہ روایات کا احترام کیا ہے اور نہ ہی متوسط طبقے کی وضع داری کو اہمیت دی ہے۔ "منو کی لگام" گیان دان' دھرم رکشا' بھگوان کے پتا کے درشن' شوپاروتی' شمبوک' بھیروی" نام کی کہانیاں ہوں یا نارد پرشورام سنواد" ہو' یا پھر "پرتشٹھا کا بوجھ' اتتھیہ (مہمان نوازی)' سب کی عزت' نقلی مال' اگر ہوجاتا' اتمی کی ماں" وغیرہ کہانیاں ان سب میں متوسط طبقے کے ڈھونگ سے دبے ہوئے اذیت' مایوسی اور نمائش کی دہری زندگی جیتے ہوئے' کھوکھلی عزت کی حفاظت کرتے ہوئے خاندان ایک عجیب کشمکش کی حالت سے گذرتے نظر آتے ہیں۔

جغرافیائی لحاظ سے پریم چند کے عہد کی ہندی کہانی "اس نے کہا تھا" کو چھوڑ کر عام طور پر شمالی ہند کے متوسط اور نچلے متوسط طبقے کے کنبوں تک محدود رہی ہے۔ اسی لئے ان ہی کے اخلاقی اور مادی مسائل سے نمٹنا اس خطے کا خاص موضوع رہا ہے۔ صرف تاریخی اور پرانوں کے قصوں میں کہانی کے مقامات میں تبدیلی کی گئی ہے۔ کہانی کار (افسانہ نگار) کا قصور یہیں اپنا کچھ کمال دکھاتا ہے۔ بعد میں جینندر تو دلی یا آس پاس کے ہی چند خاندانوں تک ہی محدود ہے۔ البتہ یش پال اور اگیئے نے پہلی بار ان سرحدوں کو وسیع کیا۔ انہوں نے افغان قبائل کی زندگی سے لے کر ہمالیہ کی چوٹیوں اور آسام اور بنگال کے جنگلوں تک کو اپنی کہانی کے مقامات کے طور پر منتخب کیا ہے۔ ویدک عہد سے لے کر بودھ عہد تک اور پھر مغل عہد تک ان کا موضوع ہے۔ ان کی کہانیوں کے دائرہ کار میں بڑی وسعت ہے۔ راہل سنکر تیاین نے تو "والگا سے گنگا" میں مکمل انسانی تہذیب کے ارتقاء کی داستان آزاد کہانیوں کی شکل میں لکھ ڈالی۔ یہ وہ دور تھا جب ہندی کہانی ذہنی اور شعوری سطح پر آزاد نہیں ہو رہی تھی بلکہ جغرافیائی اور سماجی طور پر بھی نئے افق تلاش اسے اپنی طرف مائل کر رہے تھے۔ عورت مرد

کے تعلقات کی زیادہ واضح الفاظ میں عکاسی، روز مرہ زندگی کے مسائل کی تصویر کشی اور مستقبل کے امکانات ایسے پہلو تھے جو زیادہ حقیقت آمیز کہانیوں کی تخلیق کر رہے تھے۔ یہ کہانیاں "گھر" یا مروجہ نظام کی گھٹن سے باہر قدم رکھتے ہوئے لوگوں کی جدوجہد کی کہانیاں تھیں۔

مروجہ نظام یعنی ساکن وجامد سماج کی گھٹن کو توڑنے والے کہانی کے نئے کردار، ماضی سے رشتہ توڑنے اور فرسودہ روایات کو ٹھکرا دینے میں زیادہ جری اور باہمت نظر آتے ہیں۔ نئے حالات کے سیاق میں قدیم رواجوں کی غیر موزونیت کا اظہار اور غیر منطقی رجحانات کے خلاف استدلال یش پال کی کہانیوں کے خاص موضوع رہے ہیں۔ اگیئے کے کردار بحث نہیں کرتے۔ چپ چاپ رسم ورواج کو ٹھکرانے کا فیصلہ کرلیتے ہیں۔ کردار وہ بھی نہیں ہیں جو پریم چند، پرساد اور کوشک کی کہانیوں میں آتے رہتے ہیں۔ یہ ذہن، دلیر اور تبدیلی پسند نوجوان ہیں۔ یش پال کی کہانیوں کی عورتیں جینندر کی "جاہنوی" اور "پتنی" کی طرح گھٹن میں زندگی گذارتی یا چوکھٹ کی آڑ سے باہر کی طرف جھانکنے والی عورتیں نہیں ہیں بلکہ ساتھ بیٹھ کر محبت، جنسی خواہش اور ازدواجی رشتوں کے کھوکھلے پن پر بحث کرتی ہیں۔ یہ نئے حالات کو سمجھنے اور نئے ماحول میں اپنی جگہ بنانے کے لئے بے چین عورتوں کی کہانیاں ہیں۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ہندی کہانیوں پر بنگلہ زبان کی کہانیوں کے جذباتی کرداروں کا اثر تھا۔ اس ماحول میں مجھے پریم چند، یش پال، جینندر، اگیئے، بھگوتی چرن اور ایلا چندر جوشی کے کردار نسبتاً سرد مزاج، ذہین، منطقی اور ٹھوس بنیادوں پر کھڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہاں تقدیر کے فیصلے، کرداروں کی قسمت متعین نہیں کرتے۔ ان کہانی کاروں کے کردار شاید ہی کہتے ہیں "اپنی تقدیر یہی تھی۔" سماج میں اپنی انفرادی حیثیت کا تعین بھی خود ہی کرتے ہیں۔ پرساد کی "مدھولیکا" کہتی ہے۔ "تو پھر مجھے بھی موت ملے۔" یعنی یہ کردار اپنے فیصلے خود کرتے ہیں اور ہار جیت آسانی سے قبول نہیں کرتے۔ پریم چند جوشی کی مروجہ نظام میں واپس بھی نہیں آتے۔ صرف ایلا چند جوشی کے کردار، ان فیصلوں کے سبب، احساس گناہ سے بے چین ہو کر خود کشی کی طرف مائل دکھائی دیتے ہیں۔ ان سب کے سامنے نئے حالات ہیں، نئی قدریں ہیں، اس لئے

ان کے سامنے انتخاب کرنے اور فیصلہ لینے کے نئے نئے تقاضے اور نئے نئے دباؤ آتے رہتے ہیں۔ یعنی ساری زندگی ضمیر کا بحران بن کر رہ گئی ہے۔ یہ ہندی کہانی کا مسائل کا دور ہے۔ نئے' ابھرتے سوالوں کا سامنا کرنے کا دور...

ظاہر ہے کہ مسائل یا سوال اسی وقت اٹھتے ہیں جب "قدیم" کے ساتھ گذارہ کرنا دشوار یا ناممکن ہوجائے یا متضاد تصورات کو قبول کرنا مشکل نظر آنے لگے۔ اس طرح کے تصادم' تناؤ' گھٹن اور خیالات کے بھنور میں کہانیاں جنم لیتی ہیں۔ یہاں یش پال ایک منطقی اور ایک سائنس داں کی طرح مروجہ اقدار کو قبول یا نا منظور کرتے ہیں۔ اس لئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کی کہانیوں کے کردار بے ریا' تناؤ سے آزاد اور لگ بھگ ٹھنڈے لوگ ہیں۔ ان کے یہاں نہ تو جذبات کی شدت ہے اور نہ تصورات کا ہیجان۔ "ٹوبی آر ناٹ ٹوبی (یہ ہو یا نہ ہو) کے لمحات بھی ان کہانیوں میں دکھائی نہیں دیتے۔ شاید ان کے یہاں "قدیم" کے لئے وہ ہمدردی بھی نہیں ہے جو بھگوتی چرن ورما کی "چترلیکھا" میں ساری وکیلانہ جرح کے باوجود نظر آتی ہے' حالانکہ فیصلہ وہاں بھی نئے کے حق میں ہوا ہے۔

یوں تو یش پال کی کہانیاں ایشور' سماج اور جنسی تعلقات جیسے اہم موضوعات پر نئے اور معروضی انداز میں نظر ثانی کا تقاضا کرتی ہیں' پھر بھی اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جنسی تعلق ہی ان کی کہانیوں کا خاص موضوع ہے۔ ان کے نزدیک جنسی جذبہ ایک ایسا معاشرتی مسئلہ ہے جو کتنی ذاتی الجھنوں' پیچیدگیوں اور بے راہ روی کو جنم دیتا ہے۔ اس معاملے میں جاگیردارانہ تصورات' متضاد اقدار' عورت کا استحصال' اسے کنیز یا باندی سمجھنے کا ذہن' شادی کے رواج کی لغویت' یہ سب عام متوسط طبقے کو ڈھونگ' تصنع اور جھوٹ کے ماحول میں جینے پر مجبور کرتے ہیں۔ عورت' مرد کے تعلقات کے استحصال پر مبنی کرداروں کی سب سے حقیقت آمیز تصاویر شاید یش پال نے ہی پیش کی ہیں۔ وہاں "اگر ہوجاتا" کے ممنوعہ علاقوں میں سنہرے خواب دیکھنے والی اکیلی سوتا ہے تو شادی نہ ہونے پر' دل شکستہ "اتمی" بھی ہے جو باعصمت مرنے کی دعا کرتی ہے۔ ایک طرف بھیروی اور ڈائن بنا دی گئی عورتیں ہیں تو دوسری طرف "عزت کا بوجھ' مہمان نوازی' اور سب کی عزت" میں دوہری ڈرامائی زندگیاں ہیں' یا پھر سیکس کی

پیچیدگیوں کا سامنا کرتے ہوئے "گیان دان" مردانہ برتری سے انتقام لیتی ہوئی "کوکلاڈکیت"۔

"دھرم رکشا' بھگوان کے پتا کے درشن" کے پورانک عہد میں رہنے والے کرداروں نے لیش پال کو بار بار دھرم دشمن اور فحش نگار" کے خطابات بخشے ہیں۔ لیکن وہیں "گنڈیری" اور "ہولی نہیں کھیلتا" میں جذبہ ہمدردی اور "نقلی مال" جیسے مزاحیہ واقعات بھی ہیں۔ ان سب سے ہٹ کر میں سیکس کی مخصوص صورت حال پر مبنی کہانیوں کا تذکرہ بھی کرنا چاہتا ہوں۔ "تم نے کیوں کہا تھا' میں سندر ہوں" میں سیکس یا اس سے پیدا شدہ عمل تسخیر' مرتی ہوئی عورت کے لئے حیات بخش عنصر بن جاتا ہے۔ دوسری طرف "جہاں حسد نہیں" میں خوشی خوشی جان قربان کردینے والا کردار ہے' حسد سے پاک اور ایثار مجسم۔ مکریل' میں جمالیاتی ادراک ہے۔ یہاں حسن فطرت اپنے اندر ڈوب جانے کی ترغیب دیتا ہے۔ اپنے افکار واحساسات میں جینے والا' حسن کا شیدائی بوڑھا شاعر' اپنی مداح ایک خوبصورت' جوان' کافر ادا لڑکی کے ساتھ تنہائی کے لمحات گذارنے کی بے محابا خواہش کو نظر انداز نہیں کرسکتا اور حسن فطرت کی ایک انتہائی مسحور کن کیفیت میں اس لڑکی کو اپنے ساتھ ساتھ قدرت میں ضم ہوجانے کی دعوت دیتا ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ سیکس کی ناگوار' بھیانک اور غیر اخلاقی شبیہہ سے لے کر اعلیٰ پرکشش اور ممتاز خاکوں تک' ہر طرح کی تصویریں ہمیں لیش پال کی متعدد کہانیوں میں نظر آتی ہیں۔ یہ تصویریں نہ تو بیہودہ ہیں اور نہ ہی قابل اعتراض۔ موجودہ سیاق میں یہ ایک طرف تو دلیرانہ انفرادی سیکس سے پیدا ہونے والی مختلف سماجی پیچیدگیوں کی اور دوسری طرف سماجی سیکس کی دو رخی' بے مقصد اور ریاکارانہ زندگی سے ابھرنے والی خرابیوں کی تصویر ہیں۔ ان سماجی پیچیدگیوں کے سبب سیکس منٹو کے یہاں انفرادی بغاوت کے طور پر سامنے آتی ہے۔ لیکن یہ رومانی بغاوت ہے۔ لیش پال کے یہاں وہ سماجی اکائیوں کی ذہنی کیفیات یعنی ان کی مخصوص اخلاقیات کو متعین اور نامنظور کرنے والی بنیادی قوت ہے۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے' لیش پال کے یہاں سیکس سماجی خرابیوں سے الگ بغاوت کا ایک حصہ ہی نہیں بلکہ مذہب اور سیاست کی ہی مروجہ نظام کے بنیادی

ستونوں کے خلاف لڑائی کا ایک محاذ بھی ہے۔ لڑائی چاہے برطانوی سامراج کے خلاف ہو یا بھارتیہ 'سنسکرتی' کے نام پر پھیلائی گئی جاگیردارانہ اقدار اور ان سے وابستہ توہم پرستی کے خلاف' یش پال سیاسی' ذہنی ثقافتی غلامی کی مزاحمت پر ہمیشہ کمربستہ رہنے والے انقلابی مصنف ہیں۔ ایک نسبتاً آزاد اور خوف وہراس سے محفوظ دنیا کے حامی۔ جب وہ پورانک عہد کی حامیوں اور ویدوں کی پیچیدگیوں پر حملہ کرتے ہیں تو ان کی حیثیت ایک فلسفی کی جیسی ہوتی ہے۔ ودیا' اور اجنا' کرنے کے لئے ان کا ہتھیار ہے مارکسزم۔ متوسط طبقے کے کرداروں کی نمائشی زندگی کا بخیہ ادھیڑنے کے معاملے میں وہ فرائڈ کی بجائے برٹرینڈ رسل سے زیادہ قریب ہیں۔ وہ اس سپاہی کی طرح ہیں جو ہر قسم کے ظلم واستحصال کے خلاف ہمہ وقت آمادہ پیکار ہو۔

لیکن ایک کہانی کار کے طور پر یہی یش پال کی انتہا بھی ہے۔ پریم چند کی طرح ان کے لئے افسانہ نگاری جذبہ اظہار کی تسکین سے زیادہ سماجی اور سیاسی کارکردگی ہے۔ آج کی زبان میں دونوں کو "سوشل ایکٹیوسٹ' (Social Activist) کہا جاسکتا ہے۔ ادب ان کا آرٹیکل آف فیتھ' (Article of Faith) ہے۔ ایک محرک ہے۔ ان کے یہاں احساس کی شدت اور جذبے کی تپش چاہے موپاساں جیسی ہی ہو لیکن ان کے فن میں یقیناً اتنی پختگی نہیں۔ حیرت نہیں ہونی چاہئے اگر یہ کہا جائے کہ پریم چند اور یش پال نے نہ تو کہانی کی ہیئت میں کوئی تجربے کیے اور نہ زبان کے امکانات کی سمت میں کوئی پیش رفت کی۔ کہانی کو پڑھنے کے لائق بنانے میں ان کی زبان کی سطح عام طور سے اکہری' ہے۔ پورانک اور دھارمک کہانیوں میں سنسکرت زدہ اور سماجی کہانیوں میں سیدھی اور سپاٹ۔ شاید وہ اپنے خیالات ونظریات کے سبب اتنے زیادہ مطمئن اور بے فکر ہیں کہ اسلوب ودھا یا زبان کے مروجہ ضابطوں کو صرف تجربے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ حالانکہ جنگ میں بھی پرانے ہتھیاروں اور ان کے طریق استعمال کو بدلتے رہنے کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اس بات پر نہ تو پریم چند کو یقین ہے اور نہ یش پال کو۔ کبھی کبھی تو یہ گمان ہوتا ہے کہ وہ کہانی نہیں لکھ رہے ہیں بلکہ چشم دید واقعات کو قلم بند کر رہے ہیں۔ زبان وبیان کے معاملے میں شاید سب سے زیادہ تجربے اگیئے نے کیے ہیں۔ مکریل' جیسی حساس اور جہاں حسد نہیں' اور پردہ'

جیسی حقیقت آمیز کہانیاں یش پال کے یہاں زیادہ نہیں ہیں- پریم چند اور یش پال کے کردار عام طور سے ٹائپ ہوتے ہیں- وہ انفرادی اقدام کے نہیں بلکہ رجحانات کے تابع ہوتے ہیں- اس لئے میں یش پال کو پریم چند کی کہانی کی روایت کو آگے لے جانے والا سب سے لائق کہانی کار سمجھتا ہوں-

لیکن جیسا کہ میں نے کہا' وہ شمالی ہندوستان کے متوسط طبقے کی سماجی' سیاسی اور نفسیاتی دشواریوں' محرومیوں اور اندرونی تضادات کو منظر عام پر لانے والے عہد ساز کہانی کار ہیں- دو عالمی جنگوں کی درمیانی مدت کے ہندوستانی سماج کی منظر کشی کے لئے وہ یقیناً سب سے معتبر افسانہ نگار کے طور پر یاد کیے جائیں گے- وہ اس دانشور' نوجوان نسل کے نمایندے ہیں جو ماضی اور حال دونوں ہی کے نو آبادیاتی نظریات کے خلاف جدوجہد کرتی رہی تھی- یش پال ابتداء ہی سے انقلابی رہے-- پہلے سیاسی اور پھر ذہنی انقلابی- اقتدار' چاہے وہ سات سمندر پار سے آئے انگریز کا رہا ہو' یا ثقافتی سطح پر ماضی بعید سے چلے آرہے جاگیردارانہ نظریات کے ذریعہ قایم شدہ برہمنی نظام پر مبنی اعلیٰ طبقے کا' وہ یش پال کو کبھی دہشت زدہ نہیں کرپایا- انہوں نے دونوں کے خلاف ہتھیاروں اور خیالوں سے جنگ کی-

بنیاد پرستی اور احیاء پرستی کے موجودہ طوفان میں یش پال ہمارے لئے آج اور زیادہ بھروسہ مند اور قابل تقلید مصنف کا درجہ رکھتے ہیں-

راجندر یادو

پرایا سکھ

آسمان گھنے بادلوں سے گھرا ہوا تھا۔ پتہ نہیں چلتا تھا کہ سورج نکلا ہے یا نہیں۔ نم آلود سرد ہوا تیزی سے چل رہی تھی۔ پہاڑ پر جانے والے مسافر پٹھان کوٹ اسٹیشن کے مسافر خانے میں بیٹھے ہوئے کپڑوں میں لپٹ لپٹ کر بسوں کی روانگی کے وقت کا انتظار کر رہے تھے۔ بسوں کے ڈرائیور مسافروں کی تلاش میں ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ جتنی فکر مسافروں کو آنے جانے کی تھی اس سے کہیں زیادہ فکر ڈرائیوروں کو، مسافروں کو ان کے گھر پہنچا دینے کی تھی۔

اسٹیشن کے وسیع لیکن ویران پلیٹ فارم پر کبھی کبھی کوئی ریلوے قلی نظر آجاتا تھا۔ مسٹر سیٹھی فارم کے کنارے کنارے لگی پتھر کی پٹیا پر ٹہل رہے تھے۔ ان کے گرم کپڑوں میں گھس کر ان کے جسم کو چھو لینے کی جرات ٹھنڈی ہوا میں نہیں تھی۔ وہ صرف ان کے چہرے اور سر کے بالوں کو سہلا رہی تھی۔ ہوا کی یہ ٹھنڈک جو سینکڑوں مسافروں کی جان کھینچے لے رہی تھی، سیٹھی کے جسم میں چستی پیدا کر رہی تھی۔ اس خاموشی میں وہ خود اپنے ہی اندر سما جانے کی کوشش کر رہے تھے۔

بسوں کے ڈرائیور اپنے گاہک مسافر خانوں میں تلاش کر رہے تھے۔ موٹر کاروں کے ڈرائیور ڈرتے ڈرتے اسٹیشن کے ویٹنگ روم کی جالیوں سے اپنے گاہکوں کو بھانپ رہے تھے۔ ایک ڈرائیور نے سیٹھی کو ادب سے سلام کر کے کہا تھا۔ "حضور بہت کمفریٹبل گاڑی ہے۔"

سیٹھی نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ وہ تو ٹھنڈی ہوا کا مزا لے رہا تھا۔ اس نے جواب دے کر اپنی خاموشی میں خلل ڈالنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اس کے سامنے گاڑی میں جگہ نہ ملنے کا مسئلہ نہیں تھا۔ اسے گاڑی میں جگہ ڈھونڈنے

کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ گاڑیاں اس کے پیچھے پیچھے پھرتی ہیں۔ ڈرائیور دور کھڑا ہو کر صاحب کے جواب کا انتظار کر رہا تھا لیکن سیٹھی کا دھیان اس کی طرف نہیں گیا۔

سیٹھی نے دیکھا' زنانہ ویٹنگ روم کا دروازہ کھلا۔ ایک جوان لڑکی لمبا کالا کوٹ اور سفید ساڑی پہنے باہر نکلی انگلی پکڑے ایک ڈیڑھ دو برس کا بچہ ساتھ تھا۔ نوجوان لڑکی اس ویران پلیٹ فارم کی دوسری سمت میں چل دی۔

سیٹھی کے دل میں عورت اور بچے کو دیکھ کر اچانک ایک خیال آیا۔ بچے کو اپنی انگلی تھما کر پورب کی سمت جانے والی وہ نوجوان لڑکی اسے کامیاب زندگی کی تصویر نظر آئی۔ اسے اپنی زندگی بے مقصد محسوس ہوتی تھی۔ فضول سی' ہوا میں اڑتے بادل کے ایک آوارہ ٹکڑے کی طرح۔ اسے نوجوان لڑکی کی زندگی ایک غمناک بادل کی طرح لگی جو برس کر فصل سے بھرے سلونے کھیت پر چھایا ہوا تھا۔ اس بچے کی چھوٹی چھوٹی گدگدی ٹانگیں' بے ہنگم چال' ماں کی انگلی سے لٹکے لٹکے چلنا' ماں کی پر اعتماد اور دھیمی چال' سامان تجارت سے لدی ناؤ کی طرح تھی جو کم رفتار سے بہتی چلی جاتی ہے۔

سیٹھی نے لالٹین کے کھمبے کے سہارے اپنی پیٹھ ٹکالی اور ماں بچے نوجوان لڑکی اور بچے کی جوڑی کی طرف دیکھتا رہا۔ اسٹیشن سے کچھ فاصلے تک جانے کے بعد نوجوان لڑکی واپس آنے لگی۔ واپسی میں اس نے دائیں ہاتھ کی انگلی چھڑا کر بچے کو بائیں ہاتھ کی انگلی تھمادی۔ وہ سیٹھی کی سمت میں آرہی تھی۔ بچہ ڈال سے لٹکے پھل کی طرح اپنی زندگی نوجوان لڑکی سے لے رہا تھا۔ قریب آنے والی لڑکی کا چہرہ اور بچے کی شکل سیٹھی کی نظر میں صاف ہوتی جا رہی تھی۔ لڑکی کا گورا رنگ' چھریرا بدن' تندرستی کی جھلک' بڑی بڑی آنکھیں' بچے کی چھوٹی سی ناک' گول گول آنکھیں' پھولے ہوئے گال' چہرے پر خون کی تازگی' یہ سب سیٹھی کو چشمے کے موٹے موٹے شیشوں سے دکھائی دے رہا تھا وہ تازہ ہوا سے ذہنی سکون حاصل کرنے کی بات بھول گیا۔

کار کے ڈرائیور نے میم صاحب کو سلام کر کے مختصر طور پر کچھ پوچھا۔ اس کے بعد ایک بس ڈرائیور نے اسے سلام کر کے اس سے کچھ بات کی۔

سیٹھی کاروباری آدمی تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ میم صاحب سستی اور اچھی سواری کی

تلاش میں ہیں۔ بس سات بجے سے پہلے روانہ نہیں ہو سکتی تھی لیکن موٹر کار کے لئے کوئی بندش نہیں تھی۔ کاروں کے ڈرائیور کاروں سے سفر کرنے والے مسافروں کا انتظار کر رہے تھے کیونکہ صاحب لوگوں کو جلدی نہیں تھی۔ سیٹھی کے دل میں کچھ خیال آیا۔ وہ لالٹین کے کھمبے کا سہارا چھوڑ کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے ڈرائیور کی طرف دیکھا۔ ڈرائیور دوڑ کر اس کے پاس آیا اور دوسری بار سلام کیا۔

سیٹھی نے پوچھا۔ "گاڑی ٹھیک ہے؟"

"حضور بالکل نیو۔ آسٹن سیلون۔"

"اچھا؟"

"حضور ـــ اور سواری تو نہیں بیٹھے گی؟"

"نہیں۔ ایک دم جائے گا۔ تم کو کچھ پیسہ بنتا ہے تو ایک سواری بیٹھا سکتا ہے۔"

ڈرائیور نے اور بھی لمبا سلام کیا۔

ویٹنگ روم سے سیٹھی نے سامان نکالا۔ تین سوٹ کیس اور ایک بڑا ہولڈال، دو چھوٹے اٹیچی کیس۔ ڈرائیور نے فوراً جا کر میم صاحب کو سلام کیا اور ایک زاید سواری کا سودا سستے میں طے کر لیا۔

موٹر کار ٹھنڈی ہوا کو چیرتی ہوئی دوڑنے لگی۔ سیٹھی اپنے پیچھے کی سیٹ پر کسی اور کی موجودگی سے پریشان نہیں تھا۔ پوری گاڑی کا کرایہ بھرنے کے باوجود اسے آگے کی سیٹ پر بیٹھنا برا نہیں لگا تھا۔ سامنے تیزی سے دوڑتے ہوئے درختوں اور سڑک کے ساتھ ساتھ بنے مکانوں کو دیکھ دیکھ کر میم صاحب کا لڑکا اگلی سیٹ کو پکڑ کر کود رہا تھا۔ اس کی اس طرح کی اچھل کود سے کبھی تو سیٹھی کی ٹوپی ہل جاتی اور کبھی وہ لڑکا اس کے بازو میں اپنا سر مار دیتا۔

بچے کی اس شرارت سے اس کی ماں جھجک رہی تھی۔ اس نے کئی دفعہ بچے کو چپ چاپ بیٹھنے کے لئے کہا۔ پیار بھری دھمکی بھی دی لیکن اس بات پر ماں اور سیٹھی دونوں ہی کو ہنسی آ گئی۔ بچہ کود کر اگلی سیٹ پر پہنچ جانا چاہتا تھا۔ سیٹھی نے پیچھے گھوم کر بچے کو اٹھا لیا اور اپنی گود میں بیٹھا لیا۔ بچے کے گول مٹول، نرم و نازک جسم کے لمس

سے اس کو اپنے جسم میں ایک عجیب سی چستی کا احساس ہوا۔ ایک نئی کیفیت نے اس کے دل کو گھیر لیا۔

سیٹھی کو اپنی بڑی محنت اور جان فشانی سے کامیاب بنائی ہوئی زندگی اچانک ناکام اور بے مقصد سی لگنے لگی۔ وہ بچے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے اپنی زندگی میں ایک بہت بڑی کمی کا احساس ہو رہا تھا۔

موٹر کے سامنے دوڑتے ہوئے منظر میں اسے اپنی زندگی کی کہانی سنیما کے مناظر کی طرح دوڑتی دکھائی دے رہی تھی۔

باپ کی موت کی وجہ سے ایف اے کی پڑھائی بیچ میں ہی چھوڑنے کے لئے مجبور ہو جانا' روزگار کا کوئی راستہ نہ پاکر جگہ جگہ بھٹکنا' ایک ٹھیکے دار کے یہاں بیس روپے ماہانہ پر چوبیس گھنٹے کی کمر توڑ مشقت' پھر دوسرے ٹھیکے داروں کا کام ٹھیکے پر کرانا اور رفتہ رفتہ خود ٹھیکے دار بن جانا۔۔۔ ایک کے بعد دوسرا ٹھیکہ۔ جس روپے کے لئے اسے دردر مارا مارا پھرنا پڑتا تھا' وہی روپیہ ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں اس کے ہاتھوں سے آنے جانے لگا۔ ریل کے پل کے ٹھیکے میں یک مشت ڈھائی لاکھ کا منافع...

سیٹھی نے زندگی میں ایک ہی چیز یعنی روپے کو پہچانا تھا۔ روپے کی چاہت میں اس نے دن کو دن اور رات کو رات نہ سمجھا تھا۔ آج وہ لکھ پتی ہے۔ اپنی کمائی کے بل پر بڑی سے بڑی کمپنیوں میں اس کے حصے ہیں۔ جیب میں رکھی امپر-یل بینک کی چار انگل چوڑی چیک بک پر کچھ ہندسے لکھ کر دستخط کر کے وہ کیا کچھ نہیں کر سکتا۔ لیکن اس تمام مدت میں اس نے روپے کے علاوہ اور کیا پایا۔ روپے سے کیا نہیں پایا جاسکتا۔ سیٹھی کے بہت سے رشتہ دار جنہیں وہ پہچاننے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتا' اس کا نام لے کر اپنا تعارف کراتے ہیں۔ محبت سے بھرا دل لے کر اس کی طرف دوڑتے ہیں۔ عزت کی اس کے لئے کمی نہیں ہے۔ سیاسی اور سماجی تنظیمیں اسے اپنا سرپرست اور چیرمین بنانے کے لئے بیتاب رہتی ہیں لیکن اسے ان سب سے کیا ملتا ہے؟

سیٹھی کو گھیر کر محبت اور عقیدت کی کتنی ہی اداکاریاں ہو چکی تھیں لیکن ان

شرمیلی اور شیدائی آنکھوں میں اسے صرف روپے پیسے کا لالچ دکھائی دیا۔ صرف اسے پھنسانے کی کوشش۔ یہ سب دیکھتے ہوئے وہ جیتی مکھی کس طرح نگل جاتا؟ اس نے کسی سے رجوع نہیں کیا۔ وہ ان سب کو گڑ کی بھیلی پر منڈلانے والی مکھیوں اور بھنگوں سے زیادہ اہمیت نہ دیتا تھا۔ اس کی منزل تھی روپیہ۔

روپے کی آج اسے کمی نہیں پھر بھی وہ مزید روپیہ کمانا چاہتا ہے۔ روپے کو بڑھانا، بس یہی اس کی زندگی کا مقصد ہے۔ روپیہ اب اس کی طرف یوں بہتا ہے جیسے برسات میں چھوٹے چھوٹے نالوں کا پانی ہر طرف سے آکر خود بخود ندی میں اکٹھا ہو جاتا ہے۔ اس کے قایم کردہ کاروباری ادارے میں بیسیوں جگہ ہزاروں آدمی کام کرتے ہیں اور روپیہ پیدا کرتے ہیں۔ اور وہ روپیہ اس کی انتظامیہ کی نالیوں سے بہتا ہوا اس کے حساب میں پہنچ جاتا ہے۔ سیٹھی کا کام اب روپیہ پیسہ بہا کر لانے کے لئے نئی نئی نالیاں تیار کرنا ہے۔

سیٹھی کا کوئی خاص خرچ نہیں تھا۔ اسے کوئی شوق نہیں تھا۔ اکیلا آدمی خرچ کس چیز پر کرے۔ اس کے ذاتی مصارف ہزار بارہ سو روپے ماہانہ سے زیادہ نہیں تھے۔ آرام کی طرف کبھی اس کا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ لیکن آج اچانک ٹھنڈی ہوا کی پھرپھراہٹ سے اس کے خاموش دماغ میں ایک نیا تاثر پیدا ہوا۔ کسی کمی کا اسے احساس ہوا۔

بچہ اپنے جوتے سیٹھی کے عمدہ کوٹ پر رکھے کھڑا تھا۔ موٹر کے برف کی مانند ٹھنڈے شیشے پر ہاتھ رکھ کر، اپنا چہرہ اس کے ساتھ لگا کر خوشی سے کلکاریاں مار رہا تھا۔ اس کے پیروں سے روندے جانے میں سیٹھی کو فرحت کا احساس ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ منھ کا ایک کونا اندر کی طرف کھنچ گیا۔ وہ محویت کے عالم میں ایک ٹک اس بچے کو دیکھتا رہا۔ پیٹھ پیچھے کانوں کے پاس اسے ایک وجود، ایک مضطرب اور محبت بھرے وجود کا احساس ہو رہا تھا جو درخت کے سایے کی طرح وسیع اور درخت کو پیدا کرنے والے پھول کی طرح پر کشش تھا۔ ایک ایسی ہستی جو اولاد کے سر پر حفاظت اور تسکین کا ہاتھ رکھتی ہے اور مرد کے دل میں خواہش کا تیر مارتی ہے۔ جس کی مسکراہٹ ست رنگی کمان بن جاتی ہے۔ جس میں محبت کا تیکھا پن، تحفظ کا

احساس، دعا کا سایہ، آرزو کی جھلملاہٹ، سب ہی کچھ ایک ساتھ شامل ہوتے ہیں۔ اس طرح کا ایک مقناطیس اسے اوپر کی طرف کھینچتا تو گود میں بیٹھے بچے کی کشش نیچے کی طرف مائل کردیتی تھی۔ سیٹھی ایک نئے احساس کے تحت خود فراموشی کے عالم میں تھا۔ ایک برق سی اس کے وجود کو مضطرب کیے ہوئے تھی۔

موٹر پہاڑی سڑک پر چڑھتی جارہی تھی سردی بڑھتی جاتی تھی۔ ہوا نمی کے بوجھ سے بھاری تھی۔ شیشے پر کہرے کو صاف کرنے والا آلہ (وائپر) لگاتار ڈرائیور کے سامنے والے حصے کو صاف کررہا تھا۔ بچہ اس وائپر کو پکڑنے کے لئے بے چین تھا۔ سیٹھی اس کے بھرے بھرے گول گول بازوؤں کو روکے ہوئے تھا۔ انہیں چھوڑ دینے کو اس کی طبیعت نہیں چاہتی تھی۔ بچے نے پلٹ کر سیٹھی کی طرف دیکھا۔ سیٹھی کے نیکٹائی پر لگے نگ جڑے پن نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ اسے اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کرنے لگا۔ پن اتار کر سیٹھی نے اس کے کوٹ پر لگادیا۔ موٹر میں رکھا ایک بڑا عجیب سا چشمہ بچے کے چہرے پر پہنچ گیا۔ چشمے سے اس کا آدھا چہرہ چھپ گیا۔ اس چشمے کے شیشوں میں سیٹھی کو ایک پرچھائیں دکھائی دی۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھی ماں ہونٹوں پر انگلی رکھ کر بچے کو خاموش رہنے کا اشارہ کر رہی تھی۔ سیٹھی نے پیچھے گھوم کر ماں کی طرف دیکھا اور بچے کی سفارش کرتے ہوئے کہا۔ ”اٹ از آل رائٹ' کوئی بات نہیں۔“ اس کے ہونٹوں پر ایک شفقت بھری مسکراہٹ تھی۔ ماں کا دل پگھل گیا۔

ڈرائیور نے گاڑی کی رفتار دھیمی کردی اور معذرت کے انداز میں بولا۔

”حضور، اوپر بہت زور سے پانی برس رہا ہے۔ کہرا بہت گھنا ہے۔“

”کوئی بات نہیں۔“ سیٹھی نے کہا۔ ”دھیرے دھیرے لے چلو۔“

پہاڑ کے بالائی حصے میں برسنے والا پانی بہہ بہہ کر سڑک کے کنارے جھرنے بنا رہا تھا۔ موٹر کار سڑک پر بہتے پانی کو چیرتی، ہوا میں پانی کو اچھالتی، گھوم گھوم کر اوپر چڑھتی جارہی تھی۔ سائنس کے چراغ سے قابو میں کیا ہوا یہ موٹر کار کا جن، پہاڑ کی دشوار گذار چڑھائی، کہرے، بادل اور بوچھار کی پرواہ نہ کرتا ہوا، سیٹھی اس بچے اور عورت کو اٹھائے اوپر بڑھتا ہی جارہا تھا۔

دو گھنٹے کے مسلسل سفر کے بعد وہ لوگ نصف راستے ("ادھمارگ") کے ڈاک بنگلے میں پہنچ گئے۔ موٹر گھوم کر بنگلے کے احاطے میں پہنچی اور پھر اس کے پورٹیکو میں جاکر کھڑی ہوگئی۔ بنگلے کے احاطے کے باہر کئی مسافر ٹین اور پھوس کی چھتوں کے نیچے بیٹھے آدھے بھیگ رہے تھے۔ پہاڑی علاقوں میں بوجھ ڈھونے والے بیل اور خچر پانی میں بھیگتے ہوئے حیرت زدہ نظروں سے انسانوں کی ڈھیلی ڈھالی اور بے حوصلہ چال ڈھال کو دیکھ رہے تھے۔ مسافر لوگ بادل اور سرکاری حکم کا انتظار کر رہے تھے، اور ان کے مویشی ان کے فیصلے کا۔ رات بھر کی زوردار بارش کے سبب اوپری سڑک پر دو جگہ چٹان گرنے سے سڑک رک گئی تھی۔ مسافروں کو آگے جانے کا حکم نہیں تھا۔

ڈرائیور نے موٹر کا دروازہ کھولا۔ بچہ سیٹھی کی انگلی پکڑے ہوئے باہر آیا۔ ان کے پیچھے میم صاحب اتریں۔ ڈاک بنگلے کے چپراسی اور خانساماں نے کار کو دیکھ کر سلامی دی۔ وردی پوش خانساماں نے نہایت ادب کے ساتھ ناشتے کے بارے میں پوچھا۔ سیٹھی نے کہا۔ "ہاں۔"

میم صاحب بچے کے لئے پٹاری میں دو بوتلیں رکھ لائی تھیں۔ اپنے لئے انہیں کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ ساٹھ روپیہ ماہانہ پانے والی اسکول ٹیچر کو ڈاک بنگلے میں ناشتہ کرنے کی عادت نہیں ہوتی۔ برآمدے میں پڑی ایک آرام کرسی پر بیٹھ کر میم صاحب نے سیٹھی کی طرف دیکھے بغیر بلو (بچے) کو دودھ پینے کے لئے بلایا۔

سیٹھی نے میم صاحب کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "بلو گرم دودھ پیے گا۔"

ناشتہ میز پر رکھنے کے بعد خانساماں نے میم صاحب کو اطلاع دی۔ اس کے خیال میں صاحب، میم صاحب اور بچہ، ایک ہی خاندان کا تھا۔

میم صاحب کو اندازہ ہوگیا کہ خانساماں غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ لیکن یہ غصہ کرنے کا موقع نہیں تھا۔ سیٹھی کی طرف دیکھ کر نرم اور تکلف بھرے لہجے میں انہوں نے انگریزی میں کہا۔ "آپ ناشتہ کریں مجھے تو ضرورت نہیں ہے۔"

سیٹھی نے مہذب لہجے میں اصرار کیا۔ "اتنی سردی میں ایک پیالہ گرم چائے اچھی رہے گی۔"

سیٹھی، میم صاحب اور بلو ناشتے کے لئے اندر پہنچے۔ اس کمرے میں صرف

خانساماں کا ہی آنا جانا تھا۔ باہر کی دنیا سے دور' اس ڈاک بنگلہ کی چہار دیواری کے اندر کی دنیا میں وہ میاں' بیوی اور بچے پر مشتمل ایک خاندان تھا۔ اس اندر کی دنیا کا نمائندہ اور شاہد وہ خانساماں تھا۔ خانساماں کے سامنے فضول جھجک دکھا کر اپنے آپ کو خوف زدہ یا مجرم ثابت کرنا میم صاحب کو معقول نہیں لگا۔ انہوں نے بالکل بے جھجک ہو کر پیالیوں میں چائے انڈیلنی شروع کردی۔ سیٹھی نے آملیٹ کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا بلو کے منہ میں رکھ دیا۔ وہ منہ بھر کر کھانے لگا۔

خانساماں نے میم صاحب کے پیچھے آکر پوچھا۔ "حضور کچھ بسکٹ' کچھ جام' کچھ فروٹ؟"

"لے آؤ۔" سیٹھی نے جواب دیا۔

ڈاک بنگلے میں رکھی بہت سی چیزیں پلیٹوں میں' ادھ کھلے ڈبوں کی شکل میں میز پر آنے لگیں۔ سیٹھی ہنستا جاتا تھا اور بچے کو ایک ایک چیز چکھاتا جاتا تھا۔ ماں بچے کو خوش دیکھ کر بہت خوش ہو رہی تھی۔ وہ سیٹھی کو منع بھی کرتی جاتی تھی۔ "بس کیجئے۔ زیادہ نہیں۔ اب اسے بھوک نہیں ہے۔ پیٹ خراب کرلے گا۔"

سیٹھی نے بچے کی مدد سے جھجک دور کرکے پوچھا۔ "آپ ڈلہوزی میں ہی رہتی ہیں؟"

"جی ہاں! میرا نام مسز مدن ہے۔ مسٹر مدن ملٹری اکاؤنٹس کے دفتر میں ہیں۔ میں اسکول میں پڑھاتی ہوں۔ بہن سے ملنے امرتسر گئی تھی۔"

سیٹھی اپنا تعارف کیا کراتا۔ کہہ دیا۔ "اچھی بات ہے۔" اپنے بارے میں کچھ بتانے کے لائق کوئی بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ اسے اپنی زندگی بے مقصد اور بدوضع معلوم ہو رہی تھی۔

"آپ یہاں ڈلہوزی میں گرمی گذارنے جا رہے ہیں؟" مسز مدن نے پوچھا۔

"نہیں۔ ایسے ہی کاروبار کے سلسلے میں۔۔ دو دن کے لئے۔ ڈلہوزی اچھی جگہ ہے۔ بہت اچھی جگہ ہے۔ بہت ہی خوبصورت مناظر ہیں یہاں۔"

"آپ بال بچوں کو نہیں لائے؟" تجسس بھرے لہجے میں مسز مدن نے سوال کیا۔

"نہیں۔۔ ہیں ہی نہیں۔۔۔۔۔ اکیلا ہوں۔ میرا نام آر ایل سیٹھی ہے۔ ٹھیکے

داری کرتا ہوں۔ امرتسر کا نیا گرجا گھر میں نے ہی بنوایا ہے۔" سیٹھی نے دیوار کی طرف دیکھتے ہوئے اور چائے کی پیالی میں چمچہ چلاتے ہوئے کہا۔ "میں اکیلا ہی رہتا ہوں۔"

سیٹھی کی بات سے مسز مدن کے دل میں رحم دلی اور ہمدردی کے جذبات پیدا ہوئے۔ وہ سوچنے لگیں۔ "کتنا بھلا اور کتنا امیر آدمی ہے یہ۔

بلو سیٹھی کی چمڑے کے فیتے میں بندھی گھڑی کو میز پر گھسیٹ رہا تھا۔

مسز مدن نے انگلی اٹھا کر کہا۔ "نا" اور پھر سیٹھی کی طرف دیکھ کر ہنس دیں۔ "یہ بہت ہی شیطان ہے۔"

سیٹھی بار بار اپنے بالوں میں انگلیاں چلا رہا تھا جیسے دل کی کوئی خلش بالوں کی جڑوں میں کھجلی پیدا کر رہی ہو۔ بہت کچھ حاصل کر کے بھی اسے اپنی زندگی ایک لنگڑے کی طرح بے سہارا معلوم ہوتی تھی۔ سامنے بیٹھی مسز مدن کا اپنی کہنیاں میز پر رکھ کر اپنے بچے کی طرف دیکھنا' اس کا صاف کھلا ہوا چکنا چہرہ' بڑی بڑی مدھ بھری آنکھیں' سر پر ساڑی کے پلو سے بنا ہوا تکون اور اس میں سے جھانکتا ہوا گلے کے نیچے کا حصہ۔ یہ سب اسے ایک ایسی زندگی کی علامت معلوم ہو رہے تھے جو اس کی پہنچ سے باہر تھے۔

مسز مدن کی نظر سیٹھی کی آنکھوں کی طرف گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ سیٹھی کی نظریں اس کے جسم کو لپیٹے لے رہی ہیں۔ ایک سنسنی سی اس کے جسم میں پیدا ہوئی لیکن یہ تکلیف دہ نہیں تھی۔ بلکہ اس کی وجہ سے خود اعتمادی کا جذبہ ابھر آیا۔ دونوں ہاتھ میز پر رکھ کر بالکل سیدھی چمکتی ہوئی آنکھوں سے اس نے سیٹھی کی طرف دیکھا اور کہا۔

"کتنی زور دار بارش ہے۔ ہم لوگ کیسے پہنچیں گے؟"

سیٹھی نے جیب سے سونے کا سگرٹ کیس نکالا۔ سگریٹ منہ میں لے کر جلایا اور بے تکلفی سے دھواں چھوڑتے ہوئے بولا۔ "یہ بارش نہ بھی رکے' آج ہم نہ بھی پہنچیں تو کیا حرج ہے؟ کل پہنچ جائیں گے۔"

مسز مدن نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو آپس میں پھنساتے ہوئے فکر مند لہجے

میں لیکن مسکراتے ہوئے کہا۔

"جی! مجھے تو کل اسکول میں حاضر ہونا ہے۔ آپ بھی تو کاروبار کے سلسلے میں جارہے ہیں' آپ کا بھی تو حرج ہوگا؟"

"ہاں جس کام کے لئے آیا ہوں وہ شاید نہ ہوسکے۔" سیٹھی نے کہا اور پھر برآمدے میں کھڑے خانساماں کی طرف دیکھ کر اسے پکارا۔

"دیکھو۔"

خانساماں نے فوراً تشتری میں بل حاضر کیا۔ بل کی طرف نہ دیکھتے ہوئے مسز مدن بولیں۔ "ڈرائیور کو یہاں سے کب تک چلنا ہوگا۔"

سیٹھی نے بل کو اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا "جب میں پڑھتا تھا ہمیشہ یہی چاہتا تھا کہ اسکول میں چھٹی رہے یا کسی بہانے سے اسکول نہ جانا پڑے لیکن دیکھتا ہوں کہ آپ کو اسکول سے بہت پیار ہے۔"

مسز مدن نے جواب دیا۔ "آپ شرارتی لڑکے رہے ہوں گے۔ آج بھی شاید آپ کام کاج سے بچنے کے لئے چاہتے ہوں گے کہ بارش ہوتی رہے اور اس بہانے سے آپ یہاں مزے سے سگریٹ پیتے رہیں۔" وہ ہنس دیں۔

"ہاں! چاہتا تو ضرور ہوں۔"

"آپ کا دل اپنے بزنس میں نہیں لگتا۔"

"کبھی سوچا ہی نہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ زندگی کی گاڑی کیچڑ میں کھینچ رہا ہوں۔"

ڈرائیور نے آکر خبر دی کہ سڑک ابھی تک نہیں کھلی۔ سیٹھی نے پولیس اسٹیشن فون کرکے پتہ لگایا کہ چھ گھنٹے سے پہلے سڑک کھلنے کی امید نہیں۔

مسز مدن کو اس اطلاع سے گھبراتے دیکھ کر سیٹھی نے کہا۔ آپ کے اسکول والے بھی سمجھ سکتے ہیں کہ سڑک کی مرمت کرنا آپ کے بس میں نہیں ہے۔"

مسز مدن کا بستر ایک کمرے میں لگادیا گیا اور وہ اس کمرے میں چلی گئیں۔ بچے کبھی اس کمرے میں جاتا اور کبھی سیٹھی کے پاس آجاتا۔ مسز مدن کے اٹھ کر چلے جانے پر سیٹھی کو ایسا لگا جیسے کسی نے اس کے زیادہ کھا کر بیمار پڑجانے کے ڈر سے اس کے سامنے سے تھالی اٹھالی ہو۔ لیکن اس کی بھوک ابھی باقی تھی۔ وہ کبھی تو آرام

کرسی پر بیٹھ کر آسمان میں منڈلاتے بادلوں کی طرف دیکھتا اور کبھی برآمدے میں ٹہلنے لگتا۔ اس کے کاروباری دماغ میں اس وقت دوسرے ہی خیالات نے گھر کر لیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے زندگی کی ایک تصویر ابھر رہی تھی۔ وہ روپے کے پیچھے نہیں بلکہ کسی اور ہی چیز کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ اسے محسوس ہوتا تھا کہ وہ سامنے کے دشوار گذار پہاڑ پر چڑھ رہا ہے اور اپنے سامنے سے گذرتے ایک نسوانی جسم کو پکڑ لینا چاہتا ہے۔ لیکن جب وہ ہاتھ بڑھا کر اس عورت کی ساڑھی کا کونا پکڑنا چاہتا ہے تو وہ آگے بڑھ جاتی ہے۔ ہلکے بادل میں لپٹا ہوا وہ جسم مسزمدن کا تھا۔

سیٹھی ٹہلتے ٹہلتے پھر آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ اسی وقت بھیگی ہوئی گھاس اور درختوں پر سورج کی دھلی' نکھری نکھری کرنیں پھیل گئیں۔ سورج کے اس طرح اچانک نمودار ہونے سے سیٹھی کی آنکھیں چوندھیا گئیں۔ اسے خیال آیا کہ وہ مجبور ہے۔ وہ اٹھ کر مسزمدن کے کمرے میں بھی نہیں جاسکتا۔ وہ شاید سو رہی ہیں۔ شاید جاگ رہی ہیں۔ اگر وہ دونوں ایک ساتھ بیٹھتے۔

زنانہ جوتے کی آہٹ سن کر سیٹھی نے گھوم کر دیکھا۔ کوٹ کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈالے مسزمدن نے کہا۔ "دھوپ نکل آئی ہے۔ چھ گھنٹے بھی گذر چکے ہیں۔ اب تو ہم چل سکتے ہیں.... کیا بجا ہوگا؟"

گھڑی ابھی تک بلو کے ہی پاس تھی۔ اس کا شیشہ ٹوٹ چکا تھا۔ سوئیاں علیٰحدہ ہوگئی تھیں۔ ڈرائیور سے ہی پوچھ کر وقت معلوم ہو سکتا تھا۔

چھ گھنٹے ضرور بیت گئے تھے لیکن سڑک ابھی ٹھیک نہیں ہوئی تھی اور موٹروں کو اس سے گذرنے کی اجازت نہیں مل سکتی تھی۔

خانساماں نے پھر آکر سلام کیا اور پوچھا۔ "لنچ کے لئے کچھ انتظام ہوگا؟"

"میم صاحب سے پوچھو۔" سیٹھی نے جواب دیا اور بچے کی انگلی پکڑے پکڑے دھوپ میں نکل گیا۔

خانساماں اپنے دل میں کیا سمجھ رہا ہے' یہ سوچ کر مسزمدن کو ایک عجیب سی لیکن دلچسپ جھجک ہو رہی تھی۔ لیکن اس کا اظہار صبح کے عمل اور اس وقت کی جھجک کے ساتھ مل کر صورت حال کو بگاڑ دیتا۔ اس لئے انہوں نے کہا۔

"جلدی میں جو کچھ بن سکے۔ دیر نہ لگے۔"

سیٹھی مسز مدن کے قریب بیٹھنا چاہتا تھا لیکن مسز مدن کی جھجک کا خیال تھا۔ لنچ کے لئے وہ پھر ساتھ بیٹھے۔ کچھ بات چیت ہونی چاہیے تھی۔ سیٹھی نے بتایا کہ پہاڑوں میں سڑک ٹوٹ جانے کی پریشانی اکثر پیش آتی رہتی ہے۔ پچھلی بار وہ صبح ہی ڈلہوزی پہنچ گیا تھا۔ اور تین گھنٹے میں کام کر کے شام تک گھر واپس پہنچ گیا تھا۔

"آپ ڈلہوزی میں کہاں رہتی ہیں؟" اس نے پوچھا۔

مسز مدن نے اپنا پتہ بتا دیا اور پوچھا۔ "آپ کتنے دن ٹھہریں گے؟"

سیٹھی نے بتایا' وہ ایک ضروری کام سے ڈلہوزی جارہا تھا لیکن ایک دن' دو دن' تین دن بھی ٹھہر سکتا تھا۔ ڈلہوزی میں چڑیاں ڈنڈا پہاڑی' پر پلٹن کے لئے بننے والی نئی عمارت کے ٹھیکے کے لئے وہ ڈلہوزی جارہا تھا۔ پہلے جب وہ ڈلہوزی گیا تھا تو ہل کریسٹ' ہوٹل میں ٹھہرا تھا۔ اب بھی وہیں ٹھہرنے کا خیال تھا۔

مسز مدن نے باتوں ہی باتوں میں اپنی کہانی سنادی۔ اس کا شوہر سو روپے ماہانہ پاتا تھا۔ خود اسے بھی اسکول سے ساٹھ روپے ملتے تھے۔ نوکری کے لئے مجبور تھی۔ ان کا ایک بنگلہ تھا جسے شوہر کی بیماری کے وقت پینتالیس (4500) سو روپے میں رہن رکھ دیا تھا۔ بنگلے کرایہ سیزن میں دو ڈھائی سو روپے ماہانہ مل جاتا تھا لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ الٹے پچاس ساٹھ روپے ماہانہ کی قسط انہیں مہاجن کو اور دینی پڑتی تھی۔

سیٹھی نے سوچا۔۔ پینتالیس سو روپیہ کیا تھا۔ لیکن وہ کیا کر سکتا تھا۔ کھانا کھاتے وقت دونوں بلو کو مسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ سیٹھی اسے کھلاتے رہنا چاہتا تھا اور مسز مدن اسے زیادہ نہ کھلانے کی منت کر رہی تھی۔ بلو نے سیٹھی کی گھڑی توڑدی تھی۔ مسز مدن نے اس پر افسوس ظاہر کر کے معافی مانگی۔ افسوس کی بات کو سننے سے سیٹھی نے انکار کردیا۔ کھانا ختم ہوگیا۔ مسز مدن اٹھ کر پھر اندر جانا چاہتی تھیں

سیٹھی نے ہمت کر کے کہا۔ "کیا پھر سویا جائے گا"؟

"نہیں تو۔۔ لیکن پھر کیا کیا جائے؟ شام تک ہم لوگ کسی بھی حالت میں نہیں پہنچ سکتے۔"

"امید تو نہیں ہے لیکن آپ گھبراتی کیوں ہیں؟ آپ کل اسکول نہیں جائیں تو ایک دن کی تنخواہ کٹ جائے گی دو روپیہ۔ لیکن میرا کام اگر نہ بنا تو جانتی ہیں کتنا نقصان ہوگا؟ ساٹھ پینسٹھ ہزار" سیٹھی مسزمدن کو حیرت زدہ کرکے ہنس پڑا' پھر کہنے لگا۔

"آپ اپنا مکان مہاجن سے چھڑوا کیوں نہیں لیتیں؟ پھر آپ کو نوکری کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔"

"مگر کیسے؟ ابھی تک ہم مشکل سے ایک ہزار بھرپائے ہیں۔"

"کوئی بات نہیں۔ آپ چھڑا لیجئے۔ روپیہ کا انتظام ہوجائے گا۔ مجھے سود نہیں چاہئے۔ اصل بھی جب آسانی ہو' دے دیجئے گا۔"

مسزمدن کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ چہرے پر لالی چھاگئی۔ اپنے آپ کو سنبھالنے کے لئے انہوں نے بلو کو گود میں کھینچ لیا۔ اور اس کے ہاتھ سے گھڑی چھین کر کہا۔

"اسے آپ رکھ لیجئے۔ نہیں تو یہ اسے کھودے گا۔"

بلو کے منہ بنانے پر مسزمدن نے انگلی اٹھاکر کہا۔ "چپ۔ ماماجی ماریں گے۔"

مسزمدن نے ایک لفظ کہہ کر سیٹھی پر اپنا حق جتا دیا تھا۔ اب انہوں نے اپنے باپ کے گھر کا تذکرہ شروع کردیا اور بتایا کہ ان کا نام ارملا ہے۔

ساتھ ساتھ بیٹھے شام ہوگئی اور پھر رات۔

آسمان پر چاند تھا اور چاندنی قریب کھڑے چیڑ کے درختوں سے چھن چھن کر ان پر پڑ رہی تھی۔ بلو اندر سو رہا تھا۔ ارملا سوچ رہی تھی۔ یوں اکیلے رات میں ان دونوں کا ایک ساتھ ہونا اور چاند کا یوں چمکنا ٹھیک نہیں۔ خوف اور اضطراب کی چنگاریاں اس کے دماغ اور جسم میں چٹک جاتی تھیں۔

باہر ٹھنڈ تھی۔ ہوا بھی سرد تھی۔ اندر کئی کمرے تھے لیکن خانساماں نے اپنی عقل کے مطابق دونوں کا سامان ایک ہی سمجھ کر دونوں بستر ایک ہی کمرے میں لگادیے تھے۔ ایسا نہ کرنے کے لئے اس سے کہا بھی نہیں گیا تھا۔ لیکن اندر ایک ہی کمرے میں پلنگوں پر سوجانے کی بات سوچ کر مسزمدن کو ڈر لگ رہا تھا۔ وہ سوچتی تھی ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔

رات کافی بیت گئی تھی۔ سیٹھی نے کہا۔ "آپ کو سردی میں تکلیف ہوگی۔

آپ کمرے میں جاکر سوجایئے۔"

"اور آپ؟"

"مجھے نیند نہیں آرہی ہے۔"

مسزمدن جانتی تھیں کہ سیٹھی ساری رات باہر ہی گذار دے گا' انہیں آرام دینے کے لئے۔ ان کا دل احسان مندی سے بھرگیا۔ اف! کتنا نیک آدمی ہے۔

مسزمدن نے اپنے رشتہ داروں میں ایک خوب پڑھی لکھی لڑکی کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا۔ "آپ شادی کرلیں۔"

سیٹھی نے جواب دیا۔ "اڑتالیس برس یوں بیت گئے۔ تو باقی بھی بیت ہی جائیں گے۔ شادی تو ایک طرح کا داؤ لگانا ہے' سیدھا پڑ سکتا ہے' الٹا بھی۔"

اس نے ایک بار پھر ارملا کو اندر جاکر سوجانے کے لئے کہا۔

ارملا نے جواب دیا۔ "چاندنی بہت اچھی معلوم ہو رہی ہے۔ سردی بھی خاص نہیں۔"

دونوں برآمدے میں بیٹھے تھے۔ کبھی سیٹھی بات کرتا' ارملا سنتی اور کبھی ارملا کہتی اور سیٹھی سنتا۔

نومی کا چاند پہاڑ کی اوٹ میں چلاگیا۔ وقت معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا' لیکن احساس تھا کہ رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ دونوں سردی سے کانپ رہے تھے۔ ارملا کو یہ گوارا نہیں تھا کہ سیٹھی اس کی وجہ سے جاڑے میں اس طرح مرے.... کہیں بیمار ہوگیا تو؟ اس نے کھڑے ہوکر کہا۔ "آیئے اندر چلیں۔ کیا بھائی بہن ایک ہی کمرے میں نہیں سوجاتے؟"

وہ دونوں جب اندر جارہے تھے تو اس وقت سیٹھی نے ارملا کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ دونوں اپنے اپنے بستر میں کمبل میں لپٹ کرلیٹ گئے

ڈلہوزی کی سڑک صبح ہی کھل گئی تھی۔ لیکن سیٹھی اور ارملا نے چائے پی لینے کے بعد ہی روانگی کا فیصلہ کیا۔

سیٹھی نے پوچھ لیا۔ "رات خوب نیند آئی؟" اور ہنس دیا۔

ارملا نے مسکرا کر کہا۔ "آپ کو تو آئی ہوگی۔"

دونوں سمجھ گئے کہ کسی کو بھی نیند نہیں آئی تھی۔ لیکن جاگتے رہنے کے باوجود دونوں کے جسم میں کافی چستی تھی۔

سیٹھی نے کہا۔ "طبیعت نہیں ہوتی اس بنگلہ کو چھوڑ کر جانے کی۔"

ارملا نے ہمدردی کی نظر سے سیٹھی کی طرف دیکھا اور آنکھیں جھکالیں۔ اس کے پاس الفاظ نہیں تھے۔ اسے شوہر ملا تھا لیکن ایسی فراخ دلی' پرہیز گاری اور محبت نہیں دیکھی تھی۔ اس کا رواں رواں پکارنا چاہتا تھا۔ "تم فراخ دل ہو' عظیم ہو۔" لیکن اس کی زبان بند تھی۔ عورت کی ہمیشہ ہار ہوتی ہے۔ جب اس پر حملہ ہوتا ہے تب بھی اور جب اسے پناہ دی جاتی ہے تب بھی۔

سیٹھی نے روانگی سے پہلے کہا۔ "اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو میں اس بنگلے میں تمہارا فوٹو لینا چاہتا ہوں۔"

اعتراض ـــــ ارملا کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا؟ اس نے احسان مندی سے نظر بھر کر سیٹھی کی طرف دیکھا۔۔ پھر وہ گردن جھکا کر ایک کھمبے سے لگ کر کھڑی ہوگئی۔ سیٹھی نے کئی فوٹو کھینچے۔

دو مہینے میں صرف ساٹھ دن ہوتے ہیں لیکن اس مدت میں کتنی تبدیلی ہو سکتی ہے۔ مدن ملٹری اکاؤنٹس کے دفتر سے ایک سو روپے کی نوکری چھوڑ کر "سیٹھی اینڈ کمپنی" میں ایک اسسٹنٹ منیجر ہوگیا ہے۔ اسے تین سو روپے ماہانہ ملنے لگا ہے۔ ارملا ساٹھ روپے ماہانہ پانے والی ماسٹرنی نہیں رہی۔ وہ اب اپنے چھوٹے سے بنگلے کے سامنے بہت بڑی چھتری کے نیچے گلابی دھوپ میں بیٹھ کر بلو کے لئے سوئیٹر بنتی ہے اور ضلع گونڈہ کی ایک کالے رنگ کی آیا بلو کو سڑک پر ٹہلانے لے جاتی ہے۔

سیٹھی کا بار بار ڈلہوزی آنا ضروری ہے' فوجی بیرکیں بنانے کا ٹھیکہ اس کے پاس ہے۔ ارملا کے دل میں کشمکش ہے۔ سیٹھی اس کے رشتے کی بہن سے شادی کرنے کے لئے تیار کیوں نہیں ہوتا؟

ارملا سب کچھ سمجھ کر بھی اعتراض نہیں کرنا چاہتی۔

پچھلی بار سیٹھی نے صاف صاف کہہ دیا تھا۔ "پیٹ بھرنے کے لئے کدو چبانے کے مقابلے میں سنگترے کی خوشبو پالینا ہی اچھا ہے۔"

ارملا کو سوئٹر بنتے بنتے خیال آیا کہ وہ خود ہی سنگترہ ہے۔ سیٹھی کے برتاؤ ایک ایک کرکے اس کے سامنے آنے لگے۔ سیٹھی کو اس کے بالوں میں انگلیاں چلانا بہت اچھا لگتا ہے۔ سیٹھی بغیر کچھ بولے اسے اپنے سامنے بیٹھا رکھنا چاہتا ہے۔ سیٹھی جو کپڑا لاکر دے، اسے سیٹھی کے سامنے پہننا ہی چاہئے۔ سیٹھی کی کسی بات کو نامنظور کردینا اس کے لئے ممکن نہیں۔ سیٹھی جب چاہے، اسے بغیر بازو اور بغیر پیٹھ کا بلاؤز پہننا ہوگا۔ بے شک ارملا کو بھی وہی کچھ پہننے اور اسی طرح رہنے سے اطمینان حاصل ہوتا ہے جس طرح سیٹھی کی خواہش ہوتی ہے لیکن اس کا اپنا وجود، اپنی شخصیت کہاں رہ گئی ہے؟

پچھلے بدھ کو سیٹھی آدھی رات تک ان کے بنگلے میں رہا تھا۔ اس نے کیا کہا تھا۔۔۔۔ ارملا کو ہاتھ نہیں لگایا، چھوا تک نہیں۔ دور ہی بیٹھا رہا لیکن پھر بھی اس میں باقی ہی کیا رہ جاتا! اس نے کہا تھا۔ "میں تم سے پریم کرتا ہوں، مجھے کچھ نہیں چاہئے۔ مجھے تم دل کی چاہت جیسی معلوم ہوتی ہو۔ تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔ اپنا سمجھنا چاہتا ہوں۔"

ارملا سے یہ نہ ہوسکا تھا۔ وہ رونے لگی تھی۔

سیٹھی معاف کرو، کہہ کر چپ چاپ چلا گیا تھا۔

سلائیوں کی بنائی پر نظریں گڑائے ارملا کو بجلی کی تیز روشنی میں اس رات کا پورا منظر یاد آرہا تھا۔ اسے اپنی احسان فراموشی پر افسوس تھا۔ جس آدمی نے بغیر احسان جتائے اپنی زندگی بھر کی محنت کی کمائی اسے نذر کردی۔ اپنے لئے کچھ بھی نہیں چاہا، اس کی بات چاہے جو بھی ہو۔۔۔ اسے مایوس کرنا۔۔۔۔!

سیٹھی نے کہہ دیا تھا کہ وہ اپنی ساری جایداد بلو کو دے دے گا لیکن اس جایداد میں بلو کا کوئی حصہ دار نہیں آنا چاہئے۔۔۔۔ صاف الفاظ میں اس کا مطلب تھا کہ ارملا کی کوکھ پر تالا لگاکر سیٹھی نے اس پر اختیار حاصل کرلیا تھا۔ وہ اسے چھوئے یا نہ چھوئے، بلو اسی کا ہے، مدن بھی اسی کا ہے اور ارملا سب سے پہلے اس کی ہے۔۔۔

سیٹھی کتنا بردبار، کتنا فیاض، کتنا فراخ دل ہے--- اس نے کس طرح سب کچھ دے دیا ہے.... ارملا نے تو سیٹھی کو کچھ بھی نہیں دیا- دینے کا موقع اور ہمت بھی نہیں- سیٹھی نے سب چیزوں پر خود ہی اختیار حاصل کرلیا ہے، اور کتنی آسانی سے، سب چیزوں کی ایک ہی چابی تھی، جسے اٹھاکر اس نے اپنی جیب میں رکھ لیا ہے- اس جال سے باہر آنے کا راستہ نہ تو ارملا کے لئے ہے، نہ بلو کے لئے اور نہ مدن کے لئے ہی ہے- جیسے وہ سب بک گئے ہیں-

سیٹھی اگر کل پھر آئے اور افسردہ چہرے سے اپنی اسی بات کو دہرائے، ایک طرف بیٹھ کر کہے-- "تمہیں چاہتا ہوں" تو کیا پھر بھی نہ، کہوں گی-- ارملا نے سوچا، اس میں بات ہی کیا ہے؟ دل انکار کرنا تو چاہتا تھا، لیکن انکار کا حق ہے اسے؟ وہ حق جو سب کو ہوتا ہے اسے نہیں تھا- اس کے اپنے ضمیر کے سامنے ہی نہیں تھا- طوائف کی زندگی اور کیا ہوتی ہے؟

ارملا کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے-

اسے خیال آیا-- دو مہینے پہلے جب صرف دو چھوٹے چھوٹے کمرے تھے- ارملا تھک کر اسکول سے لوٹتی تھی اور بچے کو گود میں لے کر بیوقوف نوکر کے ساتھ سر کھپاتی تھی- بہت سی ضرورتیں پوری نہیں ہوپاتی تھیں لیکن اس وقت وہ ہاں، یا نہ، کہہ سکتی تھی- خود اپنی مرضی سے جو بھی چاہتی کرتی تھی- سگریٹ کمپنی والا وہ ہنس مکھ بابو کتنا پیارا اور نیک تھا لیکن اس نے ہمیشہ انکار ہی کیا، اپنی آن نہیں چھوڑی-

پھر خیال آیا- ہوسکتا ہے اب سیٹھی آئے- اس نے آنسو بھری آنکھیں اٹھاکر پھاٹک کی طرف دیکھا....

اس کی نظر میں بے قراری نہیں، عاجزی تھی-

یاسائیں سچے

چنّا پنجوں کے بل، ہلکے قدموں سے دلکی چال چلی جارہی تھی۔ اس کے دونوں گنداز، بھرے بھرے بازو کہنیوں سے کچھ اور اوپر اٹھے ہوئے، اس کے جسم کی حرکت پر ہلتے جارہے تھے۔ گردن اس کی پتلی لیکن سیدھی بگلے جیسی تھی۔ سر پر پانی کا بھرا گھڑا یوں ٹکا تھا گویا اس کے جسم کا ہی ایک حصہ ہو۔ پانی کے گھڑے کی بات کیا، وہ تو گھی کی بڑی ہنڈیا سر پر سادھے ایک بار بھی ہاتھ کا سہارا لیے بغیر آٹھ میل دور نارووال کے بازار تک چلی جاتی تھی۔

منجھے ہوئے تانبے کے جیسے رنگ کی گردن میں چاندی کی موٹی ہنسلی اس کے نیلے کرتے پر بہار دے رہی تھی۔ اس کے جسم کی زندگی سے بھرپور حرکت کی طرح اس کا جوبن بھی، اگرچہ ساخت میں چھوٹا تھا لیکن اپنی شدت میں کرتے کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ابھرا چلا آرہا تھا۔ کمر میں لپٹا ہوا سفید دھاری دار کالا تہبند اس کی رفتار کی تیزی سے پھڑپھڑاتا جارہا تھا۔ اس کی چھوٹی کالی چنری گردن کے چاروں طرف بل کھائے کندھوں پر سمٹی اس کی مضبوطی سے گونتھی ہوئی چٹیا کے ساتھ لپٹی پیٹھ پر لٹک رہی تھی

چنّا نے اچانک دیکھا، ممدا اپنی نیلی گھوڑی چلا آرہا تھا۔ چنا کے چہرے پر چمک آگئی۔ بڑی بڑی پھیلی آنکھوں کی پلکیں ذرا جھک گئیں۔ اس نے سوچا، وہ ضرور کچھ کہے گا۔

ممدا نے اسے دیکھ کر واقعی لگام کھینچ کر گھوڑی کی گردن پر دوہری کردی۔ لڑکا بھلا تھا۔ اس نے گھوڑی کو جھاڑیوں کے کنارے کھڑا کرلیا اور پگڈنڈی چنا کے لئے چھوڑ دی۔ پلکیں اس کی بھی جھک گئیں۔ چنا قریب آئی تو دھیمے لہجے میں پوچھ لیا۔۔
"پیلو لاؤں گا۔ کھائے گی؟"

ممدے کے لہجے میں جو درد تھا وہ چنا کے دل کو چھو گیا اس نے چال میں فرق نہیں آنے دیا دھیمے لہجے میں کہہ دیا۔ "کیا کروں گی!" جیسے اب اس کی عمر پیلو شوق سے کھانے کی نہ رہی ہو۔ تیز رفتار سے چلتی ہوئی چنا کی آنکھوں کے سامنے ممدا کے چہرے کی بے بسی دکھائی دینے لگی۔ ابھی اس دن ممدا نے کتنی دور سے خوب پکے' رسیلے ڈیلے لاکر اسے دیے تھے تب بھی چنا نے بیزاری سے انکار کردیا تھا--- "میں کیا کروں گی!"

تین سال پہلے --- جب ممدا کبھی چنا کے قبیلے کی بستی کے قریب سے گذر کر' چناب کے کچھار میں اپنا مال (مویشی) دیکھنے جاتا تھا تو چنا اس سے ڈیلے اور پیلو لانے کے لئے جھگڑتی تھی۔ تب ممدا اس کا منہ چڑاتے ہوئے کہتا تھا-- "تو بڑی شیر کوٹ کی نواب زادی ہے نا! میں تیرا نوکر ہوں---

"تیرے باپ کے پاس بھی تو گھوڑی ہے۔ چڑھ کر چلی جا اور پیلو کھالے۔"

چناؔ انگوٹھا دکھا کر طعنہ دیتی-- "اے ہے بڑا جوان بنتا ہے۔ میں تجھ سے زیادہ بڑی کھال پر گھوڑی کدا سکتی ہوں۔ بڑا ریت میں گھوڑی دوڑا کر دکھاتا ہے ہماری کمیت (گھوڑی) جتے ہوئے کھیت میں چوکڑی بھرتی ہے۔"

چناؔ کے ان طعنوں کے جواب میں ممدا کانوں تک تراشے ہوئے اپنے چھتے (بال) جھٹک کر جواب دیتا۔ بڑی نواب زادی ہے تو! مجھے کیا نخرا دکھاتی ہے۔ ہماری بستی کی لڑکیاں تو دو ہنسلیاں پہنتی ہیں اور پاؤں میں جھنگ کی کامدار جوتیاں۔"

لیکن پھر نہ جانے کیا بات ہوئی کہ چنا کو صرف ایک نظر بھر کر دیکھنے کی خاطر ممدا چار میل کا چکر کاٹ کر اس کی بستی کے پاس سے ہو کر چناب کے کچھار میں اپنے مویشی دیکھنے کے لئے جانے لگا۔ چنا بھی سوچتی تھی کہ ممدا کل اس کے راستے میں دکھائی نہیں دیا۔ کیا آج بھی نہیں آئے گا؟ وہ بے ضرورت پانی کا گھڑا لے کر باہر نکل جاتی۔ وہ بہت دن سے ممدا سے ایک بات کہنے کا موقع حاصل کرنا چاہتی تھی لیکن جب ممدا دکھائی دیتا تو منہ سے الفاظ نہیں نکل پاتے تھے۔ چہرے پر سرخی پھیل جاتی اور پلکیں جھک جاتی تھیں۔

چناؔ کے دل کو ایک فکر کھائے جارہی تھی۔ پہلے تو اس کا باپ ممدا کی عموماً

تعریف کیا کرتا تھا۔ لڑکا خوبصورت ہے' جوان ہے۔ اس کے باپ قادر کے یہاں جتنا مال' ہے اتنا نیلی باڑی میں کس کے یہاں ہوگا۔ اس کے یہاں کے بچھیرے منٹگمری میں فرنگیوں کی چھاؤنی میں خریدے جاتے ہیں۔ ہنر' میں لائل پور سے ملتانی تک اس کا لوہا مانا جاتا ہے۔ سو میل سے وہ جانور کی بو سونگھ لیتا ہے۔ اس کے ہاتھ پڑا مال فرنگی کی فوج تک واپس نہیں لے سکتی۔ جوانی میں اس نے وہ وہ دھاوے کیے ہیں کہ رہے نام سائیں کا۔ لڑکے کی ماں نہیں تو کیا۔

لیکن جب سے چنّا کا باپ گجیوال کے فضل کے ساتھ کمالیا جاکر واپس آیا تھا تب سے وہ فضل کے بیٹے نارو کا تذکرہ کرتا رہتا تھا۔ یہ سن سن کر چنا سخت پریشان رہنے لگی تھی۔ ایک آگ تھی جو سورج کی تپش سے جلتی گرم ریت کی مانند اسے جسم میں اترتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ دل میں سخت گھٹن تھی۔ سارے جسم میں شدید تناؤ کا سا احساس ہوتا تھا۔

دل میں اٹھتے درد کو قابو میں رکھنے کے لئے چنا اپنے دانتوں سے ہونٹ دبائے گھر کی سانڈنی اور نئی بیاہی بھینس کے آگے لوہے کے تسلے میں پانی رکھتی ہوئی اپنی قسمت کے بارے میں سوچنے لگتی۔ میری قسمت ہی ایسی ہے۔ ممدا کیسا جوان اور چاق وچوبند ہے لیکن جانے کیا بات ہے۔ اتنا بڑا ہوگیا لیکن ابھی تک اس کے سر پر پگڑی نہیں بندھی۔ ممدا کے بوڑھے باپ قادر کی عقل کو جانے کیا ہوگیا ہے۔ آخر اس کا بیٹا کیا ہمیشہ بچہ بنا رہے گا۔ آس پاس کی بستیوں کے لڑکے جن کے ابھی تک ریخیں تک نہیں پھوٹیں' جو کل ماں کا آنچل پکڑے پھرتے تھے "کار" (چوری) کرکے شان سے پگڑیاں باندھے سر اونچا کیے پھرتے ہیں' اور ممدا کو دیکھو۔ ابھی تک گلے میں دوپٹہ ڈالے پھرتا ہے۔ ممدا چاہے تو کار نہیں کرسکتا؟ بوڑھے باپ کو بیٹے سے اتنی محبت ہے کہ اسے گود میں ہی لیے رہنا چاہتا ہے۔ بوڑھے کے گھر میں کسی چیز کی کمی نہ سہی لیکن بیٹے کو بھی تو آدمی بننا ہے۔ کار نہیں کرے گا تو مرد کیسے گنا جائے گا۔ "جانگی" کا بیٹا "کار" نہیں کرے گا تو کیا چوڑیاں پہنے گا۔ سر پر پانی ڈھوئے گا اور چھاچھ بلوئے گا۔ اور کچھ نہیں تو ایک معمولی بچھیرا ہی سہی۔ آس پاس اتنے بازار ہیں' سڑکیں چلتی ہیں۔ کیا مشکل ہے۔ ممدا جوان ہے اور عقل مند ہے چاہے تو سو "کاریں" کرسکتا

ہے۔ ایسا کون سا خطرہ ممدا کے لئے ہی پڑا ہے۔ وہ کچھ کرے تو۔ قادر کا نام بڑا ہے تو کیا! جانگلی کا بیٹا ہے تو کار کرنی ہی ہوگی۔ کار نہیں کرے گا تو پگڑی نہیں ہوگی۔ پھر بیاہ کیسے ہوگا؟

فضل کے بیٹے نارو نے پہلی دفعہ کمالیا کے بازار میں کار کی تھی۔ پکڑا گیا۔ کندھے پر چوٹ بھی آئی لیکن کیا ہوا۔ تین ہی مہینے میں پھر دوسری بار گیا۔ کوئی بڑا مال نہ سہی، کار تو اس نے کی۔ اب پگڑی باندھ کر مردوں کی طرح گھومتا ہے۔ مرد کو تو کار کرنی ہی ہے۔ فرنگی پولس کیا ممدا کے لئے ہی رہ گئی ہے۔ نہ بوڑھا قادر ممدا کو کچھ کرنے دے گا، نہ اس کے پگڑی بندھے گی۔ پھر بیاہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ابا کب تک راہ دیکھیں گے؟ آس پاس کی میری عمر کی سب ہی لڑکیاں بیاہی گئیں۔ ایک دن میرے بھی ہاتھ پیر بندھ جائیں گے۔

چنا کی آنکھوں میں آنسو آجانے چاہتے تھے۔ تسلے سے پانی پی کر بلبلاتے ہونٹوں سے پانی کی دھاریں بہاتے ہوئے دما سانڈنی نے گردن اٹھا کر چنا کی آنکھوں میں دیکھا۔ یہ سانڈنی گھر کی برکت تھی۔ چنا کی پیدائش سے پہلے ہی اس کے باپ نے ایک سوداگر سے دما کو چھینا تھا۔ تب وہ بچی تھی لیکن رات بھر میں تیس کوس کی منزل پار کرکے آئی تھی۔ تب سے گھر میں کتنی برکت تھی۔ دما جب بھی بیاہتی، چنا کا باپ چناب کے کچھار میں سائیں کے مزار پر چادر ضرور چڑھاتا تھا۔

کچھار کے سائیں کی بھی کیا کرامات ہے۔ کوئی منت اس کے مزار پر مانی جائے اور پوری نہ ہو، ایسا کبھی نہیں ہوا۔ چنا نے عقیدت سے مزار کی سمت میں سجدہ کیا۔ وہ سوچنے لگی، کسی طرح سائیں کے مزار پر جاکر بوڑھے قادر کو صحیح ہدایت ملنے اور ممدا کی پگڑی جلد ہوجانے کی منت مان آئے تو پھر پیر فقیر کی دعا سے، انشاء اللہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ لیکن مزار تک وہ پہنچے کیسے؟ چناب کے کچھار میں تو لڑکیاں اکیلی جاتی نہیں۔ دور تو کچھ بھی نہیں۔ یہی تین کوس جگہ ہوگی، لیکن جائے کیسے؟ کوئی دیکھ لے گا تو کیا کہے گا۔ اسے ابھی مزار سے کیا مطلب؟ جب رحیم بھائی کے بدن پر دانے پھولے تھے، اماں اسے اپنے ساتھ لے گئی تھیں لیکن اب وہ کیسے جائے؟

رات ہوگئی تھی۔ دن کی دھوپ اور لو، سورج کے ساتھ سمٹ کر پچھم کی سمت

میں جا چھپی تھی۔ جیٹھ کی پچھمی کا چاند افق پر اٹھتے اٹھتے ہوا ٹھنڈی پڑنے لگی تھی۔ افق تک پھیلے ریت کا لمس بھی ٹھنڈا لگنے لگا تھا۔ چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں' ڈیلے' پیلو' آکھ اور جنڈ کے مرجھائے ہوئے سے درخت تپتی ہوا میں ہو' ہو' کرنے کے بعد چین کا سانس لے رہے تھے۔ ایک بے کیف سی خاموشی پوری بنجر زمین میں پھیل گئی تھی۔ کبھی کبھی کہیں بھینس کے پیٹھ پر دم پھنکارنے یا کبھی جانوروں کے دھیمے سے کھر بدل لینے کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ کبھی کہیں کسی کتے کی بے وجہ ہوا میں منہ اٹھا کر ہلکے سے بھونکنے کی آواز بھی آجاتی تھی

چنا کے باپ کی گہری سانسیں خراٹوں میں بدل کر رات کے سناٹے کو اور بھی سنجیدہ بنا رہی تھیں۔ اس کی ماں اپنے پاس سوئے ہوئے بیٹے کی پیٹھ پر ممتا کا ہاتھ رکھے بے سدھ پڑی تھی۔ سب کے حصے کی بے چینی سمٹ کر چنا کے ہی دل میں سما گئی تھی۔ اس کی پھیلی آنکھوں میں کوسوں نیند کا پتہ نہ تھا۔ ایک خلش اس کے دل و دماغ کو بے چین کیے ہوئے تھی۔ کسی طرح ایک بار چناب کے کچھار میں سائیں بابا کے مزار پر منت مان آئے کہ ممدا کے سر پر پگڑی بندھ جائے۔ وہ تو ممدے کی ہو چکی تھی' اسی کی ہو کر رہے گی۔

وسیع بنجر کے اوپر گرد آلود آسمان میں پیلا چاند چمک رہا تھا۔ چنا اس کی ٹھنڈک میں چھٹپٹا رہی تھی اور اپنی سیاہ چادر کو آنسوؤں سے تر کر رہی تھی۔ رونے سے کیا ہوگا؟ سائیں کے مزار پر منت مانے بغیر تو کچھ ہو نہیں سکتا۔ اور دن میں مزار پر اسے کون جانے دے گا؟

پلنگ کی پٹی پر جسم کا بھاری بوجھ سنبھال کر چنا چپکے سے اٹھی تاکہ پلنگ نہ چرچرا اٹھے۔ پنجوں کے بل چلتی ہوئی اماں اور ابا کی چارپائیوں سے بچ کر نکل گئی۔ شناسا جسم کی بو پاکر سانڈنی نے اپنے نوکیلے کان کھڑے کیے اور شک کی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ چنا نے ہاتھ اٹھا کر اسے بھی خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ باڑے کے کھٹلے کو ہٹا کر اور دوبارہ لگا کر وہ باہر نکل گئی۔

کچھ قدم آہستہ چل کر وہ تیز رفتار سے چلنے لگی اور آہٹ کا ڈر نہ ہونے پر دوڑنے لگی۔ اس طویل راستے میں کسی جھاڑی یا جھنڈ کے درخت کو دیکھ کر بھوت کا

شبہ ہوتا تو اس کا کلیجہ دھک دھک کرنے لگتا۔ وہ یا علی' پکار کر اور سائیں بابا کا دھیان کرکے آگے بڑھنے لگتی۔

مزار پر کھڑے بیری کے درختوں کی ٹیڑھی شاخوں کی پرچھائیں سائیں کے کھریا مٹی سے پتے تکیے پر پڑ رہی تھی۔ تکیے کے آلے میں چراغ کی پتلی سی کانپتی ہوئی لو جھلملا رہی تھی۔ اس کی روشنی سامنے پھیلی ہوئی پرچھائیں اور چاندنی کی نقاشی کو جھلملا سا بنا رہی تھی۔

چنا رات کے سناٹے میں سائیں کے مزار پر چراغ جلتا دیکھ کر گھبرا گئی۔ یہ کون وہاں پہلے ہی سے آبیٹھا ہے؟ کسی دوسرے کے سامنے مزار پر کیسے جائے گی؟ یوں اتنی دور آکر، منت مانے بغیر ہی کیا اسے لوٹ جانا پڑے گا۔

اماں اور پڑوس کی عورتوں سے چنا نے سن رکھا تھا کہ کچھار کے سائیں کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ بھوت اور جن بھی ان کے تکیے پر سجدہ کرنے آتے ہیں اور منت کے چراغ جلا جاتے ہیں۔ تب بیری کی ڈالیوں سے شیرینی اور پھول جھڑتے ہیں۔ چنا نے آنکھیں موند کر کہا۔۔۔ "یا علی" اور دل ہی دل میں سائیں کو سجدہ کیا۔ علیؓ کے نام سے جو نہ بھاگ جائے ایسا کون سا جن ہو سکتا ہے؟

چراغ کی دھندلی روشنی میں ناچتی ہوئی شاخوں کی پرچھائیں میں قبر کے پائینتی بیٹھا دعا مانگنے والا وہ آدمی اسی طرح بیٹھا رہا۔ چنا ہمت کرکے دبے پاؤں آگے بڑھی کہ دیکھیں تو کون ہے؟ پتوں کی سرسراہٹ میں اسے اپنا ہی نام سنائی دیا۔ چنا کے جسم میں سر سے پاؤں تک سنسنی سی دوڑ گئی۔ پوری توجہ سے کان لگا کر سنا اور آنکھیں پھاڑ کر دیکھا تو اس نے پہچانا۔۔۔ وہ ممدا تھا۔

چنا بے خوف ہو کر آگے بڑھی۔ اس نے اپنا ماتھا سائیں کے تکیے پر ٹکا دیا اور منت مانی کہ جلدی سے ممدا کے سر پگڑی بندھے اور ممدا کے ساتھ اس کا نکاح ہو جائے۔ وہ نکاح کے بعد پہلی جمعرات کو تکیے پر چادر اور شیرینی چڑھائے گی۔

اس نے منت مان کر ممدا کی طرف دیکھا۔

دھندلی لال روشنی میں چنا نے دیکھا کہ ممدا کی پیاسی آنکھیں اسی کی طرف لگی تھیں۔ ممدا نے دھیمی آواز میں پکارا۔۔۔ "چنا"

چنا نے آنکھیں جھپک کر "ہاں" کہا

ممدا نے کہا۔۔ "چنا' میں تیرے بغیر نہیں جی سکوں گا۔"

چنا نے آنکھیں پونچھ کر ممدا کو بتایا۔۔ "آج کل ابا فضل کے بیٹے نارو کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔" پھر وہ کہنے لگی۔ "میں تو مرجاؤں گی تیرے بغیر' لیکن میرا باپ بھی کیا کرے۔ تیری تو ابھی تک پگڑی بھی نہیں ہوئی۔ تیرے باپ کو کیا ہوگیا ہے؟ تو مرد کا بچہ ہے! آخر کب تک ایسا بیٹھا رہے گا؟ کار نہیں کرے گا تو کیا کرے گا؟ تیرے لئے یہ کون سی بڑی بات ہے؟ ممدا میں کب چاہتی ہوں تو کب خطرے میں پڑے لیکن جانگلی کے مرد بچے کو تو یہ کرنا ہی ہے۔ یہ سائیں کا حکم ہے اور اپنی ذات کی ریت ہے۔۔ اور تو خطرے میں کاہے کو پڑے۔ ایسے ہی کوئی چھوٹا موٹا کار کرلے۔ کون سی بڑی بات ہے؟ کوئی مسافر مل ہی جاتا ہے' شہر میں بازار میں۔ وہاں پولس بہت ہے لیکن سنتے ہیں کہ لوگ ڈرتے بھی بہت ہیں۔ دیکھ' وہ ربے کا بیٹا سدو بھی کیا مردوں میں مرد ہے! کہتے ہیں کہ اوکاڑے کے بازار سے کسی مسافر کی گھوڑی کی پرانی کاٹھی اٹھا لایا۔ لوگ دو دن ہنسے لیکن پھر کیا.... پگڑی تو باندھے پھرتا ہے۔ وہ مرد تو ہو ہی گیا۔۔ نکاح بھی ہوجائے گا۔ تیرے ابا کا تو کتنا نام تھا۔"

چنا سسک سسک کر رونے لگی۔ پھر بولی۔ "سائیں اور پیر کی دعا سے تیرا بال بھی بانکا نہ ہو۔ میں تجھ پر سو بار صدقے جاؤں۔ تیری بلائیں مجھے لگیں...."

ممدا نے چنا کا سر اپنے سینے پر رکھ کر عہد کیا کہ وہ جلدی ہی کار کرے گا۔ وہ ڈرتا تھوڑا ہی ہے لیکن بوڑھے باپ کا کیا کرے؟ وہ اسے آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتا۔ اس نے چنا کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "میری چنا! تیری دعا سے اس جمعرات تک ہی دیکھنا۔ کچھ کر دکھاؤں گا۔ پھر تو تو میری ہوگی نا؟"

بہت دیر تک دونوں اپنے دھڑکتے دلوں کو ملاکر' ایک دوسرے کو تسلی دیتے رہے۔ پھر اچانک چنا نے گھبرا کر کہا۔۔ "دیکھ اب چلیں۔ چھپ کر آئی ہوں۔ ابا کی نیند کا کیا.... چلوں! مرغے بولنے کا وقت ہورہا ہے۔"

چنا پوری طاقت سے دوڑتی ہوئی واپس چل دی۔ اس کے دل میں ڈر نہیں تھا۔ تھکان نہیں تھی۔ سائیں کی دعا اور ممدا کا پیار اس کے دل میں تھا۔ بھورا کتا آہٹ

پا کر غرایا لیکن بو پہچان کر دم ہلانے لگا۔ چنا اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر چپکے سے چارپائی پر جالیٹی۔ سکون اور اطمینان سے اسے نیند آگئی۔

بستی میں خبر آئی کہ ممدا نے ساہیوال کے سرکاری اصطبل سے ایک عربی گھوڑی سنگینوں کے پہرے میں سے نکال لی۔ اس خبر سے بڑے بوڑھوں کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔ ایسا بڑا "کار" اور جواں مردی کی بات مدت سے کسی نے نہیں سنی تھی۔ لوگوں نے کہا۔۔۔۔ "ممدا آخر قادر کا بیٹا ہے۔ شیر کا بچہ شیر ہی ہوگا۔ گدھا تو ہو نہیں جائے گا۔"

چنا نے بھی خبر سنی۔ اس کا دل خوشی سے اچھل پڑا۔ چناب کے کچھار کی سمت میں رخ کر کے اس نے دل ہی دل میں سائیں کے مزار کو سجدہ کیا۔

جمعرات کے دن قادر کے یہاں سے، سائیں کے مزار پر چادر چڑھانے کی تقریب میں چنا کے گھر بھی شیرینی کا کٹورا آیا۔

چنا اس رات دل ہی دل میں اچھلتی خوشی کو دبائے چارپائی پر دم سادھے لیٹی ہوئی ماں باپ کی باتیں سنتی رہی۔ اماں کہہ رہی تھی۔ "ممدا تاروں میں چاند کی طرح ہے۔ میں تو پہلے ہی کہتی تھی، بڑے گھر کا لڑکا ہے، اسے ضرورت ہی کیا تھی لیکن اپنی ذات کا دھرم اس نے پورا کیا۔ کار بھی ایسی کی کہ رہے نام سائیں کا۔ اب اس کی پگڑی ہو جائے تو چنا کا نکاح اس سے کرا دیں۔ دیکھتے نہیں ہو، لڑکی کی کیا عمر ہو رہی ہے۔۔۔ اسے بھی تو اپنا مرد چاہئے۔"

باپ نے کہا۔ "ہاں! تو میں نے کب اور کچھ کہا ہے۔ میں تو یہی دیکھ رہا تھا کہ لڑکے کی پگڑی ہو جائے۔"

آس پاس کی بستیوں میں خبر پھیل گئی کہ قادر کے ممدا کی پگڑی ہونے والی ہے۔ ممدا منٹگمری کے بازار سے خریدا ہوا ڈیڑھ گز کورے لٹھے کا تہبند باندھتا اور ہری لال ریشمی مرزئی پر ادھی کی ململ کا کورا کرتا پورے گز کی آستین کا پہنے رہتا۔ پگڑی ابھی سر پر باندھ نہیں سکتا تھا لیکن ململ میں بٹ چڑھا کر گلے میں دوپٹے کی طرح ڈالے رہتا۔ گردن تک پھیلے اس کے چکنے بالوں میں جڑاؤ کنگھی اور پروں میں جھنگ کی بتی

کا مدار جوتی جگمگاتی رہتی- اپنی گھوڑی کو ہسیل' پہنا کر اس کی ٹانگوں میں گھنگھرو باندھ کر وہ اس گاؤں سے اس گاؤں نکل جاتا- بستیوں میں جوان لڑکیوں کی مائیں اپنی بیٹیوں کے سر میں گھی لگا کر' ان کے بال ماتھے پر کھینچ کر کانوں کو باندھ دیتیں ان کی آنکھوں میں سرمہ لگا کر انہیں نئے کپڑے کے نیلے کرتے پہناتیں اور کالے تہبند باندھنے کو دیتیں- عید میں ابھی بہت دن تھے لیکن ڈھول کی آواز کے بغیر عید کا سماں دکھائی دینے لگتا- چنا خاموش تھی- اس کی آنکھوں میں چمک تھی' گالوں سے گلابی رنگ جھلکتا رہتا تھا- کوئی ممدا کا ذکر کرتا تو اس کی پلکیں جھک جاتیں-

ساہیوال کے سرکاری اصطبل میں چوری ہوجانے کی وجہ سے گاؤں گاؤں تحقیقات ہو رہی تھی- قادر کا گاؤں ساہیوال سے چالیس کوس دور تھا- لیکن اس سے کیا؟ قادر بے پرواہ نہیں تھا- اس کے یہاں آئے دن تحقیقات ہوتی رہتی تھی- پولس کا خیال تھا کہ سو میل کے گھیرے میں کہیں بھی چوری ہو' قادر کے یہاں پتہ چل جائے گا- جانور کا رنگ بدلنے اور اسے چھپانے کے لئے وار' بھر میں قادر کا گھر اڈا تھا-

چنا کی ماں نے صبح کو چھاچھ کی چوٹی میں سے مکھن کا بھاری گولا نکال کر چھاچھ کا چھنا بھر کر چنا کے باپ کے سامنے رکھا' اور ہاتھ کی چکنائی سر سے پونچھتے ہوئے فکر مند لہجے میں بولی- "دشمن کے سر پر سائیں کا قہر گرے لیکن اگر ممدا کو کچھ ہوگیا تو کیا ہوگا؟ تم سائیں کے مزار پر جاکر منت تو مان آؤ-"

چنا کے باپ نے چھاچھ کا چھنا ایک سانس میں خالی کرکے اپنی تراشی ہوئی مونچھوں کو ہونٹوں سے پونچھتے ہوئے کہا- "زمانہ تو برا ہے- ادھر اپنے کئی جوان فرنگیوں کی جیلوں میں پڑے ہیں- جانگلی فرنگی کو ٹیکس نہیں دے گا اس لئے فرنگی سرکار جانگلی کو باغی سمجھتی ہے- سرکار چاہتی ہے کہ جانگلی کھیتی کرے اور فرنگی کو ٹیکس بھرے-

چنا کی ماں چھاچھ کی چاٹی' کونے میں ٹکا کر حیرت سے ہاتھ مل کر بولی- "ہائے ہائے! ایسا بھی کبھی ہو سکتا ہے- ہائے اللہ ایسے ظلم تو کبھی نہیں سنے تھے- جو باپ دادا

نے کبھی نہیں کیا وہ کوئی کیسے کر سکتا ہے؟"

اسی وقت باڑے کے باہر گھوڑے کی ٹاپ سنائی دی۔ پڑوس کی بستی سے ایک نوجوان آیا تھا۔ اس نے اطلاع دی کہ پولس اور فوج قادر کے سارے کنبے کو گھیر کر پکڑ کر لے گئی ہے۔

چنا کی ماں نے سو سو لعنت فرنگی کے ظلم پر بھیجی۔

پھر ایک دن چنا کے باپ نے گہری فکر میں ڈوب کر کہا۔ "اب کسی کی عزت نہیں بچ سکتی۔ فرنگی سرکار قادر سے زبردستی ہل چلوا کر کھیتی کراتی ہے۔ ہتھیار لے کر لکڑی چھیلنی ہوتی ہے۔ ایسی حالت سے تو موت اچھی۔ اب قیامت تو ہو ہی رہی ہے۔ میرے باپ کے زمانے میں مال جب ایک بار چناب اور جہلم کے اس پار آجاتا تھا تو اس کا پتہ شیطان کو بھی نہیں لگ سکتا تھا۔ اب زمانہ یہ ہے کہ گھر آئے مویشی لوٹ لیے جاتے ہیں۔ اب جینے کا کیا دھرم۔"

چنا کی ماں نے سر پیٹ کر کہا۔ چنا اور جہلم کے بیچ کے اس دیس کو آگ لگ گئی۔ اب کیسے کسی کی عزت بچے گی؟.... ہائے چنا کا کیا ہوگا؟"

"ہوگا کیا؟" بے بسی اور غصے کی کیفیت میں لمبی سانس لے کر چنا کے باپ نے کہا۔ "یہاں رہنے کا دھرم رہا۔ جانگلی کی اولاد ہو کر ہم کیا کمین کسان کی طرح ہل جوتیں گے اور کاریگر کی طرح دستکاری کریں گے۔" اس کی آنکھوں سے آگ برسنے لگی۔ اس نے کہا۔ "آگ لگا دو اس چھپر میں۔ تو سانڈنی پر بیٹھنا' میرے لئے گھوڑی ہے۔ کپڑا لتا بھینس پر لاد لیں گے اور اس دیس کو چھوڑ دیں گے۔ وہیں جا کر رہیں گے جہاں فرنگی کا راج نہ ہوگا۔ جہاں ریل کا شیطان نہ ہوگا۔ جہاں نہروں کے جال نہ ہوں گے۔ اللہ کی بنائی زمین کے فرنگی نے ٹکڑے کر دیے اور پانی کو باندھ دیا۔ اس کفر کا نتیجہ اور کیا ہوگا؟ ایسی جگہ کسی کا ایمان کیسے رہ سکتا ہے۔ لاحول ولا قوۃ! توبہ میرے سائیں بچا!"

اب چنا کا کیا ہوگا؟" روتے ہوئے نوری نے پوچھا۔

چنا کے باپ نے جواب دیا۔ "جوان لڑکی کا ماں باپ کے گھر میں کیا مطلب؟ اسے مرد کے یہاں جانا چاہئے۔ میں کب سے کہہ رہا تھا کہ فضل کا بیٹا نارو تگڑا جوان

ہے۔ اس سے چنا کا نکاح کردے لیکن تو مانتی ہی نہیں تھی۔ عورت کی بات پر چلنے سے ایسا ہی ہوتا ہے۔ میں آج ہی جاتا ہوں فضل کے گھر۔۔"

چنا کی ماں سر دھن کر رہ گئی۔۔

چنا سارا دن گھٹنوں میں سر دیے بلک بلک کر سائیں سچے کی دہائی دیتی رہی۔

تیسرے دن دوپہر کو سائیں کے مزار پر تریہی اور ڈھول بجا کر نارو اور چنا کا نکاح پڑھا دیا گیا۔ دولہا دلہن دونوں نے مزار پر سجدہ کیا۔ چنا نے آنکھوں کے آنسو پی کر دل ہی دل میں دعا مانگی۔۔

"یا سائیں سچے! میرے مدا کا تو ہی رکھوالا ہے۔ تیرا ہی ایک بھروسا ہے۔"

اور پھر چنا نارو کے دوپٹے سے اپنی چنری کا کونا باندھے اس کے گاؤں چلی گئی۔

اگر ہو جاتا ؟

اس پہاڑی ضلع میں متعدد چھوٹے چھوٹے ندی، نالے اور کھڈ ہیں۔ سرکار جاننا چاہتی تھی کہ جگہ جگہ پشتہ بنا کر ماہی گیری کے پیشے کو ترقی دینے کے امکانات کتنے ہیں؟ اس بات کا جائزہ لینے کے لئے خاص ڈیوٹی پر انجینئر راج ناتھ، اس پہاڑی شہر میں ٹھہرا ہوا تھا۔

ندیوں کو بس میں کر لینا ہنسی کھیل نہیں ہے۔ ان کی حیات بخش اور ہلاکت خیز دونوں ہی طاقتیں غیر معمولی ہیں۔ اس لئے ہمارے آبا واجداد ندیوں کو سجدہ کرکے، ان کی پوجا کرکے، انہیں خوش رکھنے میں یقین رکھتے تھے۔

سردی کے موسم میں جب پہاڑ کی چوٹیوں پر برف کم پگھلتی ہے، ندیاں اور نالے سکڑنے لگتے ہیں، کچھ غائب ہی ہو جاتے ہیں۔ گرمیوں میں ایسے ندی نالے پھر نمایاں ہو جاتے ہیں اور سوتوں سے پھوٹنے والے غائب ہو جاتے ہیں۔ برسات میں ان ندی نالوں کی طاقت ہزاروں گنا بڑھ جاتی ہے۔ پلوں پشتوں کی تو بات ہی کیا، یہ ندی نالے اپنی طاقت کے گھمنڈ میں پہاڑوں تک کی پیٹھ پر ضرب لگا کر انہیں گرا دینا چاہتے ہیں۔ اس لئے ان ندیوں کی کارروائی دخل اندازی سے پہلے ان کے مزاج کو سب ہی موسموں میں پہچان لینا ضروری ہوتا ہے۔

اوورسیر چند روز بعد جاکر خاص خاص مقامات پر پیمائی کرتے اور اپنی رپورٹ ناتھ صاحب کے پاس بھیجتے رہتے تھے۔ انجینئر ناتھ ان معلومات کی بنا پر منصوبے کا خاکہ تیار کر رہے تھے۔ مکمل منصوبہ پوری برسات کے بعد ہی تیار ہو سکتا تھا۔ ناتھ صاحب برسات کو اس کے معین وقت سے پہلے ختم نہیں کر سکتے تھے۔ انہیں پریشانی بھی کیا تھی؟ تنخواہ جیسی الہ آباد یا لکھنؤ میں ملتی، ویسی ہی یہاں مل رہی تھی، بھتا الگ اور گرمیوں میں پہاڑ پر رہنے کا موقع۔

لیکن گرمیوں میں پہاڑ پر رہنے کے موقع سے کیا مطلب؟ ایک طرف شملہ، مسوری اور نینی تال ہیں، جہاں موسم کا جشن منایا جاتا ہے۔ لوگ جی بھر کر تفریح کر کے اپنے اپنے کاموں پر لوٹ جاتے ہیں۔ ناتھ بھی پہاڑ پر تھے، لیکن ویسے پہاڑ پر نہیں۔ اس پہاڑ کو لوگ عموماً ریٹائرڈ لوگوں کا پہاڑ کہتے ہیں۔ غلط بھی نہیں کہتے۔ ریلوے اسٹیشن سے پورے دن کا راستہ بس میں طے کر کے صرف اتوار کی تفریح کے لئے کوئی یہاں کیسے آئے؟ تفریح کے لئے یہاں ہے بھی کیا؟ پہاڑ کی ریڑھ پر واقع بستی سے نظر، مدھم ہوا پر تیرتی ہوئی دوسری طرف پہاڑیوں کی ریڑھوں پر چرتے اور آرام کرتے جنگلی جانوروں کو دیکھ سکتی ہے۔ فضا میں قریب ہی اور اکثر سڑک کے نیچے وادی میں بھی، بادلوں کے مچلنے میں دھوپ چھاؤں کا کھیل دیکھا جاسکتا ہے۔ شام کے وقت دائرہ نما، آگ کی ہولی یا ساکن آتش بازی کا کھیل دیکھا جاسکتا ہے۔ برسات شروع ہوجانے کے بعد مسلسل جھاڑیاں۔ کبھی چاروں طرف کمٹی وادیوں میں دھنی ہوئی روئی کے سے بادلوں کا اٹد آنا، جو اپنے پردوں میں سب کچھ چھپا کر ایک لازوال سا منظر بنا دیتے ہیں۔ کبھی کبھی ترشول، اور چوکھبا، کی چوٹیوں کا بادلوں کے گھونگھٹ سے دیکھنے والوں کے بے صبر انتظار پر بے رحم طنز سے مسکرا دینا۔ بس یہ چوٹیاں ہی تو اس پہاڑی شہر میں مسکراتی ہیں، آدمی نہیں مسکراتے۔

بادلوں، پہاڑوں اور جنگلی جانوروں کو آدمی کہاں تک دیکھتا رہے گا۔ آدمی تو آدمی کو دیکھنا چاہتا ہے۔ یہاں ایک بازار ہے، بہت لمبا سا، چوڑے چکلے پتھروں سے منڈھا، جہاں دور پہاڑی دیہات سے آئے پہاڑی لوگ اپنی ضرورت کا سودا جلدی جلدی خرید کر رات ہونے سے پہلے اپنے گھر پہنچ جانا چاہتے ہیں۔ کبھی کبھی پلٹن سے چھٹی پر آئے سپاہی دیہات سے اپنی بیویوں کو ساتھ لاکر، ان کی پسند کے گھاگھرے کا کپڑا، نمک، تمباکو اور گڑ خریدنے یا تانبے کی گاگر کا شوق پورا کرنے کے لئے اس بازار میں گھومتے دکھائی دیتے ہیں لیکن وہ بھی کائیاں دکان دار کے ذریعے ٹھگے جانے کے ڈر سے فکر مند اور جلدی ہی گاؤں واپس جانے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ اس بازار کے دونوں طرف پھیلی ہوئی ڈھلانیں کئی محلوں اور بنگلوں کا بوجھ کندھوں اور کمر پر اٹھائے ہوئے ہیں۔ نیچے ہے صاف ستھرا مال روڈ، شہر کا انگریزی طرز پر بسا جدید

حصہ۔ سڑک کے کنارے کچھ دفتر ہیں اور جدید ضروریات کو پورا کرنے والی کچھ دکانیں۔

انجینئر راج ناتھ کا آنا جانا زیادہ تر اس سڑک پر ہوتا ہے۔ لوگ عموماً بغیر استری کی ہوئی پینٹ پہنے، دیسی ٹوپی سے کانوں کو دبائے اور چھتری کو چھڑی کی طرح ٹیکے جلدی جلدی چلتے دکھائی دیتے ہیں۔ اسکول سے آتے جاتے لڑکے لڑکیاں بھی دکھائی دیتے ہیں، سروں پر گھاس اور ایندھن کے بڑے بڑے گٹھر اٹھائے پسماندہ طبقے کی عورتیں، جن کے چہرے سر پر لدے چاروں طرف جھکے بوجھ کے اندر چھپے رہتے ہیں اور جنہیں اپنے جسم کے مقابلے گٹھر کا دھیان زیادہ رہتا ہے۔ ان کی طرف ناتھ کیا دیکھے؟ جس دولت کو مالک نہیں سنبھالتا، اس کی طرف چوروں کی نظر بھی نہیں جاتی۔ بھلے گھروں کی عورتیں عموماً یہاں باہر نہیں نکلتی۔ اگر نکلتی ہیں تو ۱۹۵۰ء میں بھی آستین سے کلائی تک بانہیں ڈھکے، کمر پر ساڑی کا غیر ضروری گھیرا بنا کر جسم کی بناوٹ کو چھپائے، نگاہ کو زمین پر گرائے چلی جاتی ہیں، جیسے چاندی کی کھوئی ہوئی چھوٹی چونی ڈھونڈ رہی ہوں۔

اس شہر کی آب وہوا صحت کے لئے اچھی سمجھی جاتی ہے، لیکن صحت کا بھی ایک مقصد ہوتا ہے۔ صحت کا مقصد صرف ندیوں اور گڈھوں میں پانی کی گہرائی، چوڑائی اور روانی ناپ کر اس میں بہنے والے پانی کے بہاؤ کی طاقت کا حساب لگا لینا ہی نہیں ہے۔ یہ سب تو کیا جاتا ہے زندہ رہنے کے لئے۔ زندہ رہ کر کچھ اور بھی کیا جاتا ہے، کچھ اور بھی کر گذرنے کی خواہش ہوتی ہے۔ ناتھ تعلق مادی دنیا سے ہے۔ نامعلوم دنیا کی تلاش اور جسد خاکی سے الگ ہو کر سکون کے حصول میں اس کا اعتقاد نہیں ہے۔ وہ جوانی کی پرجوش چھلانگیں بھرنے کے لئے اتاولا نہ سہی، لیکن وہ زندگی سے ہاتھ بھی نہیں دھو بیٹھا ہے۔ دیس میں واقع اپنے مکان سے آئے، اسے چار مہینے سے زیادہ ہوگئے ہیں۔ کبھی کبھی وہ عورت کا چہرہ دیکھنے اور اس کی آواز کی ہنسی سننے کی خواہش محسوس کرنے لگتا ہے۔ ... پہاڑی علاقے کے قدرتی حسن میں وہ تو ہے نہیں۔ قدرتی حسن اسے غیر ضروری بارش اور ندی میں بے کار بہتے پانی کی طرح بے مقصد معلوم ہونے لگتا ہے۔

ایسی حالت میں ناتھ اپنے دماغ پر جمتی ہوئی کائی کو دور کرنے کے لئے اس شہر کے واحد سینما گھر میں جا بیٹھتا ہے۔ سینما کی کشش اس نے پہلے کبھی اتنی محسوس نہیں کی۔ فلموں کی غیر فطری مناظر سے اس کو بیزاری سی تھی، جیسے گواہی میں ناقابل برداشت جھوٹ سن کر کوئی جج جھنجلا اٹھے۔ اب فلموں میں اسے وہی دکھائی دینے لگا جس کی زندگی میں کمی تھی۔ اب ناتھ کو فلموں سے اکتاہٹ نہیں ہوتی تھی۔ وہ انہیں ایسے نگل جاتا تھا جیسے بغیر نمک کا کھانا کھا کر چٹکی بھر چورن پھانک لیا جائے۔ وہ نئی نئی فلموں کا انتظار کرنے لگا اور ہر فلم کو پہلے ہی شو، میں دیکھنے لگا۔

اس شہر کی طرح ہی یہاں کا سینما گھر بھی ہے، اداس اور اونگھتا ہوا۔ اس کی دیواروں پر کسی زمانے میں کیا گیا سبز یا نیلا روغن اب وقت اور نم ہوا کے اثر سے خاکی آسمانی سا ہو گیا ہے۔ ڈیزل کے انجن سے ڈائنمو اور ڈائنمو سے بجلی کی موٹر چلا کر فلمیں دکھائی جاتی ہیں۔ کبھی کبھی مشین گڑبڑا جاتی ہے تو آٹھ آٹھ یا دس دس منٹ تک فلم رک جاتی ہے اور کچھ منٹ کے لئے روشنی ہوتی رہتی ہے۔ ٹین کی ڈھلواں چھت کے نیچے چٹائی کا ہموار فرش بچھانے سے خوبصورتی میں چاہے اضافہ نہ ہوا ہو، آواز گونج نہیں پاتی۔ سب سے اونچے یعنی دو روپئے دس آنے کے درجے میں کچھ گدی دار بینچیں کوچ کی شکل میں، کچھ دفتری کرسیاں اور کچھ آرام کرسیاں پڑی رہتی ہیں۔ اس درجے کے آگے، آس پاس کی گیلری میں بغیر بازوؤں کی کرسیاں، اونچے درجے کی طرف پیٹھ کرکے، آگے پیچھے رکھ کر، درمیانی درجے کا ٹکٹ خریدنے والی عورتوں کے لئے جگہ بنادی گئی ہے۔ اس سینما میں عورتوں اور مردوں کے الگ الگ بیٹھنے کا دستور اب بھی چل رہا ہے۔ عورتوں کے پیچھے بیٹھنے والے اونچے درجے کے تماشائیوں کی نگاہ سے عورتوں کی حفاظت کے لئے پردے ٹانگنے کے لئے، لوہے کی چھڑیں بھی لگی ہیں۔ چھڑوں میں پیتل کی چھلے بھی جھول رہے ہیں۔ پردے ایک بار پھٹ جانے کے بعد پھر لگائے نہیں گئے۔ شاید اس دوران پردے کا رواج کچھ کم ہو گیا۔

انجینئر ناتھ اس سینما گھر میں آتا ہے تو سب سے آگے، بیچ کی آرام کرسی پر بیٹھ

کر پیر پھیلا لیتا ہے اور سگریٹ سلگا کر، فلم کی کہانی کو نظر انداز کر کے، صرف چہرے دیکھتا اور گانے سنتا ہے۔ سنیما کو وہ مجرے اور سرکس کے میلے کی شکل میں دیکھتا ہے۔ فلم رک جانے پر جتنی روشنی رہتی ہے، آس پاس کی گیلریوں پر نظر جاتی ہی ہے لیکن اس کی آنکھوں کو کبھی کوئی امنگ وہاں سے نہیں ملی۔

اس روز جب وہ طوفان، فلم دیکھنے گیا تو گیلری میں سب سے ادھر کی کرسی پر اسے ایک جوان لڑکی دکھائی دی۔ کہنی سے خوب اونچی آستین کا بہت چست بلاؤز پہنے ہوئے۔ بلاؤز اتنا چست تھا کہ صرف جسم کے رنگ کو چھپا کر اس کی ساخت کو ابھارے۔ جسم کے ابھار اور دباؤ کو اور نمایاں کر دینے کے لئے بلاؤز میں چولی کے حصے کا رنگ تیز سرخ اور باقی کپڑا جسم کے ہی رنگ کا۔ ساڑی بھی جسم کو چھپا دینے والی اور لہنگے کی جیسی نہیں تھی بلکہ ایسی جیسے بوتل پر باریک کاغذ کس کر لپیٹ دیا گیا ہو۔

ایک ہی مشین چل رہی تھی۔ بار بار روشنی ہوتی اور ناتھ کی نگاہ اس طرف اٹھ جاتی۔ اسے دکھائی دے رہی تھی صرف بانہہ، پیٹھ پر ساڑی اور بلاؤز کے اندر سے ریڑھ کی گہرائی اور چہرے کا بائیں طرف کا حصہ لیکن اتنے سے حصے سے کیا باقی کا اندازہ نہیں ہو سکتا! ناتھ کا دھیان فلم کی طرف رہا ہی نہیں۔

روشنی ہونے پر وہ دوشیزہ مڑ کر اپنے ساتھ بیٹھی سہیلی سے بات کرنے لگتی جو اسی کی طرح کی پوشاک پہنے ہوئے تھی۔ ناتھ کو اس کی آنکھیں اور دانت بھی دکھائی دیے، کتنے جاندار! تہذیب کا خیال رکھ کر جتنا دیکھا جا سکتا تھا، ناتھ دیکھتا رہا اور اندازے لگاتا رہا۔ عمر؟.... شادی شدہ ہے؟.... ہو بھی تو!....

فلم ختم ہو گئی۔ ناتھ باہر آیا۔ اس نے دیکھا وہ دونوں سڑک پر آئیں اور ایک منٹ بات کرنے کے بعد اس نے، مسکرا کر موتی کے سے دانت چمکا کر اپنی سہیلی کو ٹا۔ٹا، کیا اور مال روڈ پر دکھن کی طرف چل دی۔ ناتھ کو اچانک خیال آیا۔۔ پھر کیسے دیکھ سکے گا؟ جیسے بھیڑ میں کھویا ہوا کتا مالک کو پانے کے بعد نظر سے اوجھل نہیں ہونے دیتا، ناتھ وارفتگی کے عالم میں، وہ کر بیٹھا جو اسے نہیں کرنا چاہئے تھا اور جس بات کی اس سے امید بھی نہیں کی جا سکتی تھی، وہ اس کے پیچھے چل دیا۔

ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی، ایسی کہ چھتری ساتھ ہونے پر بھی بازو سے لٹکی ہی

رہ سکتی تھی۔ رات کے لگ بھگ دس بجے تک سڑک سنسان ہو چکی تھی۔ شاید ہی کوئی کہیں اکا دکا رہ گیا آدمی ادھر ادھر نظر آجاتا تھا۔ دور دور کھڑے کھمبوں سے بجلی کی روشنی سڑک پر پڑ رہی تھی۔ بجلی کی روشنی کے نیچے سے گذرتے وقت چلنے میں اس سڈول اعضاء کی کیفیت کپڑوں سے جھلک جاتی تھی۔ ناتھ اس نم آلود سردی میں اس لڑکی کے جسم کی گرمی کے لمس کے لئے، اس جسم کو اپنی بانہوں میں لے لینے کے لئے ایک بیتابی کے عالم میں اس کے پیچھے پیچھے چلا جارہا تھا۔

سڑک پر ہلکی چڑھائی شروع ہونے پر ناتھ کی سانس تیزی سے چلنے لگی۔ وہ اس اندیشے سے پریشان ہونے لگا کہ وہ لڑکی پیچھے گھوم کر نہ دیکھ لے۔ کچھ دور چڑھائی پر چلتے چلتے وہ اچانک سڑک کے کنارے سے اٹھتی سیڑھیوں پر چڑھ کر ایک بڑی دیوار میں بنے پھاٹک کے اندر چلی گئی۔

سڑک کے پار سامنے ہی کھمبے پر لگی بجلی کی روشنی میں ناتھ نے پھاٹک پر لگے بورڈ پر پڑھا۔۔ ناگرک لڑکیوں کا اسکول'۔ چڑھائی چڑھنے کی تھکاوٹ کے بعد' سڑک ویران ہونے کی وجہ سے ناتھ کو ان سیڑھیوں پر بیٹھ جانے میں کچھ جھجک نہیں ہوئی۔ جن سیڑھیوں پر سینڈل رکھ کر وہ' ابھی چڑھی تھی' ان پر بیٹھ جانا ناتھ کو اچھا لگا' جیسے اسی کے قدموں میں بیٹھ گیا ہو۔ یہ سب اپنے دل کو فریب دینا تھا' وہ تو پہنچ کے باہر جا چکی تھی۔

ناتھ نے بے بسی سے سانس لے کر سوچا' وہ کر بھی کیا سکتا تھا؟ اس سے بات کرتا تو کیا اور کس بہانے سے؟ اچانک اسے اپنے کچھ زندہ دل دوستوں کی ہمت یاد آگئی۔ وہ آگے بڑھ کر کہہ سکتے تھے۔۔۔ پھوار پڑ رہی ہے' یہ چھتری آپ لے لیجیے۔' اور پھر چھتری واپس لینے کے لیے جانے سے تعارف کی اچھی تمہید' یا کوئی فرضی نام لے کر' مس کلیمنٹ ہی سہی' پوچھا جاسکتا تھا۔۔ ''آپ مس کلیمنٹ کو جانتی ہیں!۔۔۔ اوہ' شاید وہ آج کل یہاں نہیں ہیں' پہلے یہاں اسکول میں پڑھاتی تھیں۔'' یا رہنے کے لائق جگہ بتانے کے لئے مدد کی درخواست کی جاسکتی تھی' بات شروع ہونے پر ہی بات نکلتی ہے۔

ناتھ موقع پر چوکنے کے لئے اپنی بزدلی پر پچھتا رہا تھا اور سنسان سڑک کے

کنارے سیڑھیوں پر بیٹھا تصور میں اس سڈول چھریرے جسم کو سبک رفتار سے بھیگی سڑک پر بڑھتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ جسم سے چپکے جسم کے رنگ کے بلاؤز پر دوسرے رنگ کی چولی' جو اس کے جسم کی کشش کو چھپانے کے لئے نہیں بلکہ پکارنے کے لئے پہنی گئی ہے اور بازوؤں کے حلقے میں آنے کے قابل کر کے نیچے ٹانگوں کا سبک رفتار سے الگ الگ قدم اٹھاتے جانا.... ناتھ کو پچھتاوا ہو رہا تھا' وہ کیوں چوک گیا!

ہمت اور مستحکم ارادے کے ساتھ اس نے سوچا۔۔ ابھی نہ سہی' جگہ تو دیکھ ہی لی ہے۔ اسکول میں ٹیچر ہے۔ اس نے انگریزی میں سوچا۔۔ ٹیچر ہی بننے کے لئے کوئی عورت پیدا نہیں ہوتی۔ میں چاہوں گا تو یہ ہوگا۔ جو بھی ضروری ہوگا میں کروں گا۔ اسے اکیس سال میں آہستہ آہستہ اپنی بینک میں جمع کی گئی پونجی کا خیال آیا۔ کاش وہ پھر سڑک پر دکھائی دیتی۔ بلاؤز اور ساڑی میں لپٹی اس حسینہ کو بانہوں میں لینے کے موقع کے لئے' وہ اپنا سب کچھ داؤں پر لگانے کے لئے تیار ہو گیا۔

ناتھ پھوار میں سیڑھیوں پر بیٹھا' تصور میں کھو گیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے پھیلی' پھوار سے بھیگی سڑک غائب ہو گئی۔ صرف وہ چھریرا اور سڈول جسم ہی دکھائی دینے لگا۔ زندگی کی طرح ہی تصور کی بھی اپنی ایک رفتار ہے۔ کچھ دیر بعد ناتھ اس جسم کو اپنی باہنوں میں محسوس کرنے لگا۔۔۔ ایک چھوٹا نرالا مکان' برسوں کی رفاقت۔ اس چھریرے سڈول' مستانی چال سے چلتے جسم کے ساتھ ساتھ لٹکتی خوبصورت بانہہ' ہاتھ کی انگلی کو تھامے ایک خوبصورت بچہ' بچے کا گھنگھریالے بالوں سے بھرا سر' نرم و نازک گول گدگدی پنڈلیاں اسے دکھائی دینے لگیں۔

ناتھ تصور میں اپنی خواہش کو پورا ہوتا محسوس کر رہا تھا۔۔ یہی حسن کی تکمیل اور کامیابی ہے کہ وہ حسن کی تعمیر بھی کر سکے۔... اس پیڑ کی خوبصورتی کیا جو پھل نہیں دیتا! ناتھ کا تصور اور آگے بڑھا۔۔ اس حسن کی حفاظت کے لئے سرپرست کی شکل میں' ایک مضبوط بانہہ' اس کی اپنی بانہہ۔

دل میں اضطراب لیے' اس نم آلود سردی میں ٹھنڈی سیڑھیوں پر بیٹھے رہنے سے اس کو تکلیف ہونے لگی۔ اس کا تصور ٹھٹک گیا۔... نہیں' اس کی بانہہ نہیں ہو سکتی۔... یہ وہ نہیں کر سکے گا۔... ذمہ داری کو ایک جگہ توڑ کر دوسری جگہ کیسے

نبھایا جاسکتا ہے!.... اس کی سماجی حالت اس کی عمر کے خیال سے بھی!...
تو....؟

اس کا ضمیر جاگ اٹھا۔ وہ اپنے آپ سے ہی بحث کرنے لگا' پھولوں سے لدی ڈال کو صرف پاؤں کے نیچے کچل ڈالنے کے لئے توڑ لیا جائے...۔ اس میں لگنے والے پھولوں کا امکان ختم کرکے' ڈال کو صرف ایک دن پھول دان میں رکھنے کے لئے توڑ لیا جائے...؟ اس کا دل کڑوا ہوگیا' اچھا ہی ہوا' وہ بول نہ سکا۔ وہ اپنا فریب دور کرنے کے لئے پھوار سے بھیگی سڑک پر اپنی پرچھائیں کو اپنے ہی پاؤں سے کچلتا ہوا اپنی قیام گاہ کی طرف واپس چل دیا۔

لیکن اتنا سا بھٹکنے کی وجہ سے ناتھ کے دل کی ندامت ختم نہیں ہوئی۔ وہ ٹالسٹائی اور گاندھی کے خیالات سے متفق ہے۔ دل میں آئے گناہ سے نجات کا ایک طریقہ اس نے پڑھا ہے-- دل میں آئے برے خیالات کو ہمت سے کہہ ڈالنا...۔

ایک برساتی شام کو جب مکان سے نکلنا مشکل تھا' اس نے یہ پورا واقعہ کہانی کی شکل میں لکھ ڈالا اور سچی کہانیاں چھاپنے والے ایک رسالے میں بھیج دیا۔ اس کی یہ کہانی رسالے میں چھپ بھی گئی۔

اس چھوٹے سے شہر میں لڑکیوں کے اسکول کی ٹیچروں کی زندگی باقی شہریوں کی زندگی کی طرح ہی یا اس سے بھی کچھ زیادہ' ایک ہی طرز کی اور بغیر کسی سانحہ کے رہتی ہے۔ اتوار کا دن سر اور کپڑے دھونے میں یا شہر میں کسی متعارف خاندان میں سہیلی سے مل آنے میں گذر جاتا ہے۔ عیسائی ٹیچرز البتہ صبح گرجا گھر جاکر عیسائی سماج میں مل جل سکتی ہیں اور اس مہنگائی کے زمانے میں بغیر انڈوں کے کیک بنانے کے نسخے اور پرانی ساڑیوں کو نئی جھلک دینے کے طریقوں پر تبادلۂ خیال کرسکتی ہیں۔ پڑھائی کے دنوں میں دن بھر لڑکیوں کو پڑھانے کی بعد شام کو سوئیٹر اور موزے بنتے ہوئے' اپنے مستقبل پر غور کرکے' امید اور ناامیدی کی ادھیڑبن کے علاوہ کہانیوں والے رسالے پڑھ کر دل ہلکا کرسکتی ہیں۔ ان کے علاوہ اور ذریعہ ہی کیا ہے؟

مس سویتا پچھلے دن کچھ بننے کے لئے اون لینے بازار گئی تھی تو اس مہینے کی سچی

کہانیاں' بھی لے آئی تھی۔ دن بھر لڑکیوں کو شمالی ہندوستان کے پہاڑی سلسلے کے نام رٹوانے اور آخر میں جہانگیر کے دورِ حکومت میں نور جہاں کے اثر کا تذکرہ کرنے کے بعد وہ تھک گئی تھی۔ اپنے کمرے میں جاکر چارپائی پر لیٹ گئی اور 'سچی کہانیاں' کے ورق پلٹنے لگی۔

ایک کہانی کا عنوان تھا 'اگر ہو جاتا؟' سویتا اشتیاق سے کہانی پڑھنے لگی۔ کہانی میں اپنے ہی شہر کی ہو بہو تفصیل دیکھ کر اشتیاق بڑھا۔ جب جولائی کے مہینے کے آخری ہفتے میں 'طوفان' فلم دیکھنے کی بات آئی تو جیسے اس میں ڈوب گئی۔ یاد آیا کہ وہ بھی اس فلم کو دیکھنے گئی تھی۔

دو رنگے بلاؤز کا ذکر آیا تو منھ سے نکل گیا۔ 'ہائے مرگئی!' سر چکرا سا گیا۔ رسالہ تقریباً ہاتھ سے چھوٹ گیا لیکن انگلیوں نے اسے لوہے کی سی مضبوطی سے جکڑ لیا اور سانس روک کر کہانی پڑھ لی۔ پسینہ آگیا۔ ایسا لگا جیسے کسی نے جسارت بیجا کرکے اس کے نام محبت نامہ لکھ دیا ہو' لیکن ہائے' اخبار میں!

لیٹ نہ سکی' اٹھ بیٹی۔ بیٹھنے سے بھی چین نہیں آیا تو ٹہلنے لگی۔ شرم سے سوچا' رسالہ جلادوں••• لیکن رسالہ صرف ایک ہی تو نہیں چھپا ہوگا!••• ویسا بلاؤز اسکول میں سوائے اس کے اور کس کے پاس ہے؟••• کیا کرے؟••• اگر وہ پکار بیٹھا تو؟

سویتا کمرے میں واپس آئی۔ کہانی پھر دھیان سے پڑھی۔ پڑھنے کے بعد سر پیچھے کرکے گردن سیدھی کرلی اور دل ہی دل میں ہمت کرکے کہا۔۔۔ کسی کا جسم اچھا ہوگا تبھی تو اچھا لگے گا•••۔

اس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہوکر اپنا چہرہ دیکھا اور آئینے سے دور کھڑے ہوکر جسم کی بناوٹ دیکھی اور پھر بے جھجک اپنے خیال کی تائید کی۔۔۔ ٹھیک ہی تو ہے۔

دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھ کر وہ چت لیٹ گئی۔ ایسی بے چینی محسوس ہو رہی تھی جیسے کوئی بہت بڑا افسانوی خزانہ اپنے ہی گھر میں مل گیا ہو اور وہ اس کی بات ہونٹوں پر نہ لا سکتی ہو۔

خیال آیا--- اگر پکار لیتا؟••• اگر پکار لیتا تو•••؟ اس کے دل سے اتنی گہری سانس اٹھی کہ کھڑی ہوجانے کے لئے مجبور ہوگئی۔

وہ جھنجلا اٹھی-- اس میں بے عزتی کیا••• ایک دن ایسا کیوں نہ ہوگا؟

ابھی وقت تھا۔ وہ جھپٹ کر اپنی سہیلی لیلا کے کمرے میں پہنچی اور مچل کر اصرار کیا--- "چلو، آج سنیما ضرور چلیں گے!"

چلنے سے پہلے اس نے بڑے دھیان اور ہمت سے لباس چنا۔ دو رنگا بلاؤز بار بار ہاتھ میں آجاتا تھا اور ہاتھ سے گر پڑتا تھا۔ اتنی ہمت نہیں ہوئی۔

وہ پھر اسی کرسی پر بیٹھی، جہاں ڈیڑھ مہینے پہلے طوفان، دیکھنے کے لئے بیٹھی تھی۔ اس کا دماغ جھنجھنا رہا تھا۔ گھوم کر پیچھے دیکھنے کی ہمت نہیں تھی لیکن اپنی پیٹھ پر اسے نگاہیں چبھتی سی معلوم ہورہی تھیں۔ بغیر کچھ دیکھے اور سنے، سنیما کا آدھا وقت اس نے جیسے تیسے گذار دیا۔

اس نے فیصلہ کرلیا کہ انٹرول میں روشنی ہونے پر وہ ادھر غسل خانے کی طرف جائے گی۔ جاتے وقت ادھر دیکھنے میں کوئی کچھ نہیں کہہ سکے گا۔ وہ ایک بار ضرور دیکھے گی، ضرور، ضرور!

آخر اس نے دھڑکتے ہوئے دل کو بس میں کرنے کے لئے دانت دبا کر ادھر دیکھا، کئی آدمی تھے۔ وہ کسی کے بھی چہرے کو ڈھنگ سے دیکھنے کی ہمت نہ کرسکی۔ اس نے سوچا--- وہ کون ہوسکتا ہے؟••• کیا وہ آج نہیں دیکھ سکے گا!••• میں نہیں دیکھ سکتی، وہ تو دیکھ سکتا ہے!

فلم ختم ہونے پر مایوسی اور ناکامی سے ڈوبتا دل لیے وہ اٹھی۔ سڑک پر بجلی کی روشنی میں بھی اسے کوئی نہیں دیکھ رہا تھا۔ واپس آتے وقت اپنے سینڈل کی آہٹ کے علاوہ اور کوئی آہٹ پیچھے سے سننے کی کوشش میں وہ دوبارہ لڑکھڑا بھی گئی۔ اس وقت غمگین ہونے کے بجائے، اس نے موقع پاکر پیچھے گھوم کر دیکھ لیا••• لیکن کوئی نہ تھا۔

واپس آنے پر جیسے اس کی طبیعت خراب ہوگئی۔ وہ چارپائی پر لیٹ گئی۔ اس کی روح خاموش آواز میں چیخ رہی تھی-- کیوں نہیں ہوا!••• ایک بار تو وہ اس وجود کو

محسوس کر سکتی۔

وہ اٹھی اور لیمپ اسٹول پر رکھ کر ایک بار پھر اس کہانی کو پڑھنے لگی۔ بانہوں میں دبا لینے کی بات! اس کا رواں رواں کانپ اٹھا۔ اس کی انگلی پکڑ کر خوبصورت بچے کے چلنے کی بات۔۔۔ اس کا سینہ غرور سے ابھر آیا۔۔۔ سرپرست کی شکل میں سہارے کے لئے کبھی دھوکا نہ دینے والی بانہہ اور اگر بانہہ سڑک پر ہی چھوڑ کر چل دیتی۔۔۔ اسے معلوم ہوا جیسے اس کی چارپائی ٹوٹ گئی ہو اور وہ نیچے کھائی میں، کبھی نہ ختم ہونے والی کھائی میں گری جا رہی ہو۔۔۔۔

سویتا کو ہوش آنے پر معلوم ہوا کہ سر چکرا گیا تھا۔۔۔ کتنا دھوکا ہو جاتا! اف اگر ہو جاتا!۔۔۔ تو؟

اف، اگر ہو جاتا تو!۔۔۔ اف، بچ گئی!

انگریز کا گھنگھرو

چند سال پہلے سرکاری افسر دورے کے لئے موقع کے انتظار میں رہتے تھے' تفریح ہوتی تھی اور زائد کمائی کا بھی کچھ موقع ہاتھ لگ جاتا تھا۔ اب الاؤنس میں کمی اور مہنگائی نے صورت حال بدل دی تھی۔ پہاڑی علاقوں میں تو اور بھی مشکل تھی۔

یوں تو الموڑہ ضلع پرکشش ہے۔ گھنے ہرے جنگلوں کے سائے' ایک کے پیچھے دوسری جھانکتی متعدد پہاڑیوں کا سلسلہ' وادیوں میں وسیع سرکس کی گیلریوں کی جیسی ہری مخمل سے ڈھکی کھیتوں کی سیڑھیاں' بیچ بیچ میں بل کھاتے چاندنی سے پٹے راستوں جیسی پانی دھارائیں جگہ جگہ دکھائی دیتی رہتی ہیں۔ ان مناظر کے شوقین لوگ اور یہاں کی صحت افزا آب وہوا سے فیض حاصل کرنے کے لئے مریض دور دور سے آتے رہتے ہیں لیکن وہیں تک جہاں تک موٹر چلنے کے قابل سڑک انہیں باآسانی لاسکے۔ گھنے اتار چڑھاؤ والے راستوں پر گاڑی سے سفر ممکن نہیں۔ پیدل چلنے سے جسم کا پانی پسینہ بن کر چوٹی سے ایڑی تک بہہ جاتا ہے۔ ٹٹو پر لاکر چلنے سے جسم کی حالت ایسی ہوجاتی ہے جیسے تانکے ٹوٹی رضائی کو جھاڑ دینے سے اس میں روئی کی حالت ہوجاتی ہے۔ پیسے کی قیمت اب کچھ بھی نہیں رہی۔ سرکار کے ذریعہ طے شدہ مزدوری کی وجہ سے قلیوں میں بوجھ ڈھونے کا جوش باقی نہیں رہا۔ اپنی جیب کا پیسہ خرچ کرکے دورہ کرنے کے ہمت محض تنخواہ میں ہی گذر بسر کرنے والے افسر میں نہیں ہوتی۔ اس کے لئے جیب بھرنے کا دوسرا طریقہ بھی ضروری ہے۔

پندرہ برس تک حکومت کی نوکری کے بعد بھی میں چھوٹی موٹی جایداد نہیں خرید سکا۔ ابھی تک ڈپٹی ہی بنا ہوا ہوں' کلکٹر بھی نہیں بن سکا۔ اسے میری ناقابلیت کا بہت کافی ثبوت سمجھا جانا چاہیئے۔ اس لئے اس دور میں جبکہ ایس ڈی او پرمٹ بانٹنے کا حق حاصل کرکے کلب ورکش کے مالک بنا دیے گئے ہیں' مجھے پنچایت راج افسر جیسے قومی

زبان میں "مہاپنچ مہامیے" کا نام دیا گیا ہے، ہی بن جانا پڑا۔ امید تھی کہ اس نئے محکمے میں خود ساختہ فیصلے کا جذبہ پیدا کرنے اور تعمیری کام کرنے کی آزادی ہو گی مگر نیلی سفید ٹوپی کا زبردست اثر یہاں بھی کچھ کم نہیں۔

"تلی ماہل" پٹی میں جب سے پنچایت بنی، برابر جھگڑا چلا آرہا تھا۔ پنچایت جم ہی نہیں پا رہی تھی۔ مجبور ہو کر وہاں کی گاؤں سبھاؤں کی حالت جاننے کے لئے پٹی کے دورے پر جانا ہی پڑا اور "مورنولہ" کے ڈاک بنگلے میں قیام کیا۔ پٹی کے سبھی پنچوں کو مرکزی گاؤں "جاکھولا" میں تیسرے پہر آجانے کا پیغام بھجوا دیا۔ پٹی کے پنچایت انسپکٹر کے ساتھ خود حالات کو جاننے کے لئے تینوں گاؤوں میں بھی گھوم آیا۔

عموماً دورے میں احتیاطاً پستول جیب میں رکھ لینا ضروری سمجھتا ہوں لیکن "مورنولہ" کا جنگل بہت گھنا ہے، شکار کافی ملتا ہے اس لئے بندوق بھی ساتھ رکھ لی تھی۔ کیونکہ اپریل کا مہینہ تھا اور اپریل تک شکار پر چھوٹ رہتی ہے۔ اردلی ساتھ تھا۔ فائل اور بندوق اسی کے پاس تھی۔

"پاسو" گاؤں میں سبھا کے لوگوں سے ملنے کے بعد "بانج" کے گھنے جنگل میں سے ہو کر ہم جاکھولا کی طرف آرہے تھے۔ پنچایت انسپکٹر نے بانج کے ایک پیڑ کی شاخ پر بیٹھے ہوئے ایک موٹے جنگلی مرغ کو گرالیا۔ اس خیال سے کہ مرغ رات کے کھانے کے وقت کام آئے گا، اردلی کو مرغ اور بندوق کے ساتھ واپس ڈاک بنگلے بھیج دیا۔

پنچایت انسپکٹر کے خلاف بہت سے پنچوں کو شکایت تھی۔ اس نے بھی اپنی بیوی اور بچے کو کچھ تکلیف ہونے کی بات کہی تھی اس لئے جاکھولا پہنچ کر پنچوں سے بات کرنے سے پہلے ہی انسپکٹر کو بھی اس کے گاؤں جانے کی اجازت دے دی۔

جاکھولا میں پنچوں سے بہت دیر تک بات کی لیکن مخالف گروپوں میں کسی طرح کوئی سمجھوتا نہیں ہو پایا۔ ٹھاکر ویر سنگھ کسی طرح ماننے کو تیار نہیں تھا۔ اس میں جھگڑے اور مقدمے بازی کی پیدائشی عادت تھی۔ مجھے اپنی بات کی حمایت نہ کرتے دیکھ کر اس نے بات سننے سے بھی انکار کر دیا۔ اپنی سفید ٹوپی ہلاتا ہوا پنچایت سے اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ انصاف کی بات سنی نہیں جاتی تو جسے جو کرنا ہے کرلے۔ آخر بھگوان تو

دیکھتے ہیں لکھنؤ میں منسٹر ہیں' الٰہ آباد میں ہائی کورٹ ہے۔ ہم دیکھ لیں گے۔ ہم واک آؤٹ کرتے ہیں جی!" ٹھاکر دھوانس دے کر اپنے حمائیتوں کے ساتھ پنچایت سے اٹھ گیا اور دس ہاتھ دور جا بیٹھا۔ ایسی حالت میں گاؤں میں قیام نہ تو سود مند تھا نہ ہی باعث عزت۔ سبھا ختم ہونے پر میں نے فائل بیگ میں بند کی اور چھتری لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔

جمن سنگھ کے آدمی مجھے ڈاک بنگلے تک پہنچانے کے لئے تیار تھے مگر ان آدمیوں کے ساتھ آنے کا مطلب تھا مخالف پارٹی میں سے ایک کے ساتھ حمایت جتانا۔ اس لئے اکیلے ہی آنا مناسب سمجھا۔

ابھی غروب آفتاب میں ایک گھنٹہ تھا۔ جمن سنگھ سے راستہ پوچھ لیا۔ اس نے سمجھایا-- نالے میں پانی کم ہے۔ پتھروں پر پاؤں رکھ کر پار کر سکتے ہیں۔ سامنے "سو" (چیڑوں سے ڈھکی ڈھلوان) ہے۔ فرلانگ بھر اوپر چڑھ جایئے۔ جنگلاتی بٹیا مل جائے گی۔ پھر دکھن کی طرف گھوم جایئے۔ ڈاک بنگلہ میں سے بھی کم چڑھائی چڑھنے سے پہلے تنہائی میں سگریٹ پینے کی خواہش ہوئی۔ دن بھر کی تھکان سے کمر سیدھی کرلینے کے لئے چٹان پر ہی لیٹ گیا۔ نالے کے ساتھ ساتھ گھنگھارو کی اونچی جھاڑیاں تھیں اور کنج (جنگلی گلاب) خوب پھولا ہوا تھا۔ بھینی بھینی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ شام کے وقت ان جھاڑیوں میں بسیرا کرنے کے لئے آئی بلبلیں چہچہا رہی تھیں اور ادھر ادھر پھدکتی پھر رہی تھیں' کہیں کہیں چونچیں بھی لڑجاتیں شاید جگہ کے لئے جھگڑا ہو رہا تھا۔ خیال آیا-- جھگڑا صرف آدمیوں میں ہی نہیں بلکہ پرندوں اور جانوروں میں بھی ہوتا ہے۔ نالے کے پار چھوٹے چھوٹے کھیت ایک کے اوپر ایک گاؤں کے اوپر چڑھتے چلے جا رہے تھے۔ کچھ مرد اور عورتیں کھیتوں میں اب بھی لڑائی کر رہے تھے۔

چٹان پر چت لیٹ کر آسمان کی طرف آنکھیں کیے سگریٹ پینے میں بہت آرام مل رہا تھا۔ آسمان آدھا آدھا تقسیم ہو رہا تھا۔ آدھا خوب نیلا اور آدھے میں اجلے اجلے بادل۔ خیال آیا' شاید رات میں پانی برس جائے۔ ہوگا' بے فکری سے سوچا' کون ابھی برسا جاتا ہے۔ آرام اور سکون محسوس کرنے کے لئے یوں ہی آنکھیں بند کرلی تھیں مگر اب سچ مچ نیند آگئی۔

چہرے پر چھینٹے محسوس کر کے گھبرا کر اٹھا۔ اندھیرا ہو گیا تھا۔ نئی بیاباں جگہ پر گھبراہٹ سے دل دھک دھک کرنے لگا۔ گھڑی پر نظریں جما کر وقت دیکھا' آٹھ بج رہے تھے۔ تقریباً دو گھنٹے سویا تھا۔ اندھیرے میں انجانے راستے پر جانے میں ڈر محسوس ہو رہا تھا۔ ایک بار جاکھولا واپس جاکر لالٹین اور آدمی لانے کا خیال آیا۔ جنگلی جانوروں کا خاصا خطرہ تھا لیکن افسر کے لئے یہ بات کچھ مناسب نہیں لگی کیونکہ میں پہلے ہی ساتھ کے لئے منع کر چکا تھا۔ وہ تو سمجھ رہے ہوں گے کہ میں واپس پہنچ چکا ہوں۔ یہ سوچ کر آگے چلنے کا ارادہ کیا اور چل پڑا۔

پانی کا چھینٹا جیسے مجھے ہوشیار کرنے کے لئے ہی آیا تھا۔ بادل دھیرے دھیرے گرجتا رہا لیکن برسا نہیں۔ میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ مجھے جگانے کے لئے آیا تھا اور ڈاک بنگلے پہنچنے کی تنبیہہ کر رہا تھا۔ بھگوان کتنا بے رحم ہے۔ میں جلدی جلدی ڈھلان پر چڑھنے لگا۔ روشنی کم ہونے کی وجہ سے بٹیا دکھائی نہیں پڑ رہی تھی لیکن جمن سنگھ نے بتایا تھا کسی بھی طرح سے اوپر پہنچ جانے سے سڑک مل جائے گی۔ نیچے گھنا' چکنا پرل (چیڑ کی پتیاں) بچھا ہوا تھا۔ پاؤں پھسل پھسل جاتے تھے۔ جہاں تک ممکن ہوا چلنے کی کوشش کرتا رہا۔ جتنا ڈر بارش کا تھا' اتنا کسی جانور کا بھی نہیں تھا۔ جنگلی جانور کے مقابلے کے لئے پستول کا سہارا تھا۔ اس کو چھونے سے ہمت بڑھ جاتی تھی۔

تقریباً پندرہ منٹ تک اوپر چڑھتا رہا لیکن سڑک نہیں ملی۔ دل میں اندیشہ تھا کہ اندھیرے میں پگڈنڈی سے بھٹک گیا ہوں یوں ہی چلتا رہوں گا تو کب تک چلوں گا۔ اسی وقت اچانک بادل پھٹ پڑے اور موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ چھتری کھول لی اور ایک بڑے سے پیڑ کے تنے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ سردی بھی محسوس ہونے لگی۔ سوچا' جاکھولا لوٹ چلوں۔ پہاڑوں سے نیچے گھنے پیڑوں کے بیچ سے کوئی روشنی ٹمٹماتی نظر آ رہی تھی۔ سوچا' بارش تھمے تو دیکھا جائے گا۔

پانی لگ بھگ دس منٹ تک بہت زور سے برستا رہا اور پھر اچانک ہی رک گیا۔ جاکھولا لوٹنا ٹھیک نہیں لگا۔ سوچا' سرکار اور اس کے افسروں کی سب سے بڑی طاقت عوام پر اس کا رعب ہے۔ لوگوں کے سامنے جاکر اندھیرے اور جانوروں کے ڈر سے

گڑگڑانا مناسب نہیں۔ چوٹی تک تو پہنچ ہی گیا ہوں۔ جنگلاتی بٹیا اسی طرف سے گذرتی ہے۔ اگر ترچھا آگیا ہوں تو سو پچاس قدموں کے فرق سے مل ہی جائے گی۔ اس کے بعد تو صرف ایک میل کا راستہ ہی رہ جاتا ہے۔ بس کوئی ریچھ یا چھوٹا چیتا نہ مل جائے۔

پیڑ کے نیچے سے نکل کر پھر چڑھائی کی طرف قدم بڑھائے۔ پرل بھیگ جانے سے اب پاؤں نہیں پھسل رہے تھے۔ جنگلی جانوروں کے متعلق سنی ہوئی باتیں یاد آرہی تھیں۔ ریچھ سامنے پڑ جائے تو پچھلے پاؤں پر کھڑا ہو کر حملہ کرتا ہے۔ کبھی پیچھے سے کھوپڑی نوچ لیتا ہے۔ آدمی کو نیچے ڈھلان پر دیکھتا ہے تو اوپر سے اس پر کود پڑتا ہے۔ جنگل میں گھاس کاٹنے والی عورتوں کو پریشان کرتا ہے۔ نر مادہ میں فرق سمجھتا ہے۔ بہت جنس زدہ ہوتا ہے۔ لیکن اس علاقے کے لوگ ایک بڑے ہنسیے سے ریچھ کا مقابلہ کر لیتے ہیں۔ گل دار چھوٹا باگھ بہت خطرناک ہوتا ہے۔ وہ دبک کر آدمی پر حملہ کر دیتا ہے۔ سڑک کے کنارے کسی پیڑ پر چڑھ کر موٹی شاخ پر چھپا بیٹھا رہتا ہے اور کسی راہ گیر کے سر پر یا کندھوں پر کود پڑتا ہے۔

ترکیبیں بھی یاد آرہی تھیں۔ ریچھ سے بچنا ہو تو چڑھائی کی طرف نہیں ڈھلان کی طرف بھاگنا چاہئے۔ ریچھ ڈھلان پر تیز نہیں دوڑ پاتا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے بال آجاتے ہیں۔ ریچھ کانٹوں سے ڈرتا ہے اس لئے کانٹوں میں چھپ جانا چاہئے۔ خود بھی سوچا۔۔ کوئی بھی جانور جھپٹے تو اگر چھتری کی نوک اس کے منہ میں بھونک دوں تو؟ نوک ایک بار گلے تک پہنچ جائے اور پوری طاقت سے دبا دی جائے تو جانور بے بس ہو جائے گا بارش رک چکی تھی اس لئے چھتری سے چھڑی کا کام لینے لگا۔ ذرا بھی کھٹکا ہونے پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ شکاریوں کی باتیں یاد کرتا جارہا تھا جو شیر اور بھالو کو تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ بس ہمت اور اوسان قائم رہیں تب ہی آدمی جنگلی جانوروں کو بس میں کر سکتا ہے۔ پہاڑی لوگ تو کلہاڑی اور ہنسیے سے شیر کا سامنا کرتے ہیں، اپنی جیب میں تو پستول ہے۔

کچھ اور اوپر چڑھ کر سڑک مل گئی۔ راہ بھول جانے کے ڈر سے جان بچی۔ امید پیدا ہوئی کہ شاید کوئی آدمی مل جائے۔ پہاڑی لوگ تو رات میں بھی چلتے رہتے ہیں۔

اوپر جا کر بانج کا جنگل ملا۔ اس وجہ سے سڑک پر اندھیرا اور بھی گہرا ہو گیا تھا۔ سنا ہے کہ بانج کے جنگل میں جانور بھی بہت ہوتے ہیں۔

پہاڑی لوگ جانوروں سے اتنا نہیں ڈرتے جتنا کہ بھوت پریت سے۔ دل میں سوچا، جانور نہیں ملے، بھوت پریت تو بے کار باتیں ہیں۔ مگر اس وقت بھوت پریت والے خیال کا مذاق اڑانا بھی ٹھیک نہیں لگا۔ دل میں سوچا— دنیا کیا کبھی ختم ہو سکتی ہے۔ جناتی طاقت بھی تو ہوتی ہے۔ جسم ختم ہو جاتا ہے مگر کیا روح زندہ رہتی ہے۔ غیر مطمئن روحیں کیا دوسروں کو ستا سکتی ہیں؟ اس میں تعجب کیا ہے۔

آنکھوں کو ہوشیاری سے کھولے تنگ جنگلاتی سڑک کے دونوں طرف دیکھتا جا رہا تھا۔ ہمت بڑھانے کے لئے جیب سے پستول نکال کر ہاتھ میں لے لیا تھا یقین تھا کہ اگر پستول کی گولی جانور کے سینے یا ماتھے پر لگ جائے تو رائفل جتنی ہی لگتی ہے۔ چوکنے کو تو رائفل کا نشانہ بھی چوک سکتا ہے لیکن ہتھیار کا بھروسا کیا؟ ہتھیار کے استعمال کا موقع ملے تب ہی تو۔ ایسے وقت میں بھگوان کا ہی سہارا ہوتا ہے۔ دل ہی دل میں کہتا جا رہا تھا۔ "ہے بھگوان، مصیبت میں صرف تم ہی رکھوالے ہو۔" بچپن میں ایسے وقت ہنومان چالیسا کا بڑا سہارا ہوتا تھا پڑھ لکھ لینے کے بعد گایتری منتر کی طاقت پر یقین آگیا۔ دل ہی دل میں گایتری منتر کا پاٹھ کرتا جا رہا تھا کہ دماغ ہوش میں اور دل پر سکون رہے۔ جتنے قدم چلتا گیا بھگوان کی مرضی سے ڈر اتنا ہی کم ہوتا گیا۔

اچانک دھیمی غراہٹ سنائی دی۔ قدم دھیمے اور رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے پستول کے دستے انگلیاں سخت ہو گئیں۔ غراہٹ داہنی طرف سے آ رہی تھی۔ ہوشیاری سے دیکھا، داہنی طرف ایک پیڑ کے اجلے تنے کے قریب کوئی بڑا سا کالا جانور سمٹ کر بیٹھا ہوا تھا، جیسے کوئی بڑا کتا چوکنا بیٹھا ہو۔ غراہٹ اور صاف سنائی دینے لگی۔ پورا بدن پسینے سے تر تھا۔ پستول اس پر سادھ لی۔ جانور غرانا چھوڑ کر پیچھے کی طرف ہٹتا ہوا دکھائی دیا جیسے بلی شکار پر کودنے کے لئے بدن کو اسپرنگ کی طرح کھینچتی ہے۔ لمحے بھر کی دیر تھی یا تو جانور میرے اوپر یا پھر میری گولی اس کے بدن میں— میں نے گولی چلا دی۔

جانور ایک چیخ کے ساتھ اچھل پڑا۔ اس کی سیاہ کھال پھٹ کر پھیل گئی اور

ایک آدمی کا ہیولا' کیا' آدمی ہی.... کچھ بڑے سائز کا ایک آدمی اچھل پڑا اور اس کے سر پر گھنٹیاں بج اٹھیں اور یہ سب کچھ میرے سامنے تھا۔

بھوت پریت کا ڈر لڑکپن کی بات تھی۔ تب رات کے اندھیرے میں اپنے ہی گھر میں پیپل کے نیچے' سب ہی جگہ بھوت کا خدشہ ہوتا تھا اور ہنومان چالیسا کا پاٹھ کرکے بھوت سے بچنے کی تدبیر بھی کیا کرتے تھے۔ ان باتوں کو تو اب تیس برس بیت چکے تھے لیکن اس وقت سب کچھ بھول کر سنسکار طاقت ور ہو گئے۔ گھٹنے لڑکھڑانے لگے اور منہ سے اچانک نکلا۔

"جے کپش تہوں لوک اجاگر...."

کالے جانور کی کھال میں لپسے ہنومان جی کی طرح ہی قلانچ مار کر اچھل پڑنے والی اس شے نے انسان کی واضح آواز میں پکارا۔۔ "تیرے مسان کی ماں کا...." اس گالی کے ساتھ پھر زور سے گھنٹیاں بجنے لگیں۔

انسان کی آواز اور روز مرہ کی جانی پہچانی گالی سن کر جان میں جان آئی۔ دماغ فوراً صاف ہو گیا۔ گھگھیائے ہوئے لہجے میں پکارا۔۔ "ڈاک والا ہے۔ - -" اور پستول فورا جیب میں رکھ لیا۔

جواب میں پھر پیدل ڈاک لے جانے والے ہرکارے کی لاٹھی کے گھنگھرو بج اٹھے اور پھر للکار سنائی دی۔۔ "بھاگ سالے! تیرے مسان کی ماں کا....! خوب جانتا ہوں سالے' صاحب کا روپ دھار کر آیا ہے۔"

کھانس کر میں نے پکارا۔۔ "کیوں ڈاک والے کمبل لپٹ کر سو گیا تھا؟ بہت زور سے خراٹے لیتا ہے!" اس کا ڈر دور کرنے کے لئے میں نے ماچس کی تیلی جلا کر اپنے چہرے کی طرف اٹھائی اور سوال کیا' "ڈاک بنگلہ کتنی دور ہے؟"

ہرکارے نے اپنا شک دور کرنے کے لئے ایک بار پھر گھنگھرو بجایا اور مطمئن ہو کر بولا۔ "ہاں حضور' زور کا پانی برس رہا تھا اس لئے پیڑ کے نیچے دم لے رہا تھا۔ حضور بنگلہ یہی آدھ میل پر ہو گا! ڈاک بنگلے جا رہے ہیں؟"

"ہاں!"

جسم اس لمحے بھر کے تناؤ سے چور چور ہو گیا تھا۔ جیب میں سے ایک سگریٹ

نکالا سلگا کر ستانے کے لئے کوئی پتھر ڈھونڈنے لگا۔ ہرکارے نے اپنا کمبل بچھا دیا۔ اس کے کمبل پر بیٹھ کر ایک سگریٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "ڈر گئے کیا' کوئی خواب دیکھ رہے تھے؟"

"نہیں حضور' بھوت پریت لگتا ہے اس سڑک پر۔ بڑا چھلیا ہے۔ بڑے روپ دھارتا ہے۔ کبھی سیٹی دیتا ہے' کبھی جانور کی بولی بولتا ہے' کبھی کان کے پاس بندوق چھوڑ دیتا ہے۔ ابھی دیکھا حضور نے؟"

"یہ ابھی جو کھنکا ہوا تھا' کسی پیڑ کی بڑی ڈال ٹوٹ گئی ہوگی۔" میں نے اسے سمجھانا چاہا۔

"ارے نہیں حضور' رات میں ڈال کون توڑے گا؟" ہرکارے نے پھر کہا' "یہ سب وہی کرتا ہے۔"

سگریٹ کا کش لے کر میں نے پوچھا' "جنگل میں تو جانور بھی ملتے ہوں گے؟"

"ہاں حضور کیوں نہیں ملتا۔ جنگل جو ٹھہرا۔ جنگل تو جانور کا گھر ہے۔ کبھی ریچھ' چھوٹا باگھ مل ہی جاتا ہے لیکن حضور بھوت پریت بدمعاشی کرتے ہیں۔"

میں نے پوچھا' "جانور یا بھوت مل جاتا ہے تو کیا کرتے ہیں؟"

"کوئی ڈر نہیں ہے حضور یہ انگریز کا گھنگھرو ہے جہاں تک اس کی آواز جاتی ہے' بھوت پریت یا کوئی جانور ٹھہر نہیں سکتا۔ حضور انگریز کا بڑا اثر رہا ہے۔ اب بھی یہ اسی کا گھنگھرو ہے حضور' پچیس برس ہوئے جب پہلے پہل یہاں ڈاک نکلی تب خطرہ تھا اب کیا ہے۔ تب بھی شام کے آدھ بجے "نگراسے" ڈاک لے کر ڈبل چوکی کر کے صبح چار بجے مال کوٹ میں ڈاک دیتے تھے۔ تب حضور ایک بار یہاں بڑا باگھ آگیا۔ الموڑہ جاکر رپٹ لکھوائی! تب ڈاک کے صاحب ایک بڑے بھاری اصلی انگریز افسر تھے۔ حضور بڑے مہربان صاحب لوگ تھے' ان کا کیا کہنا! صاحب نے حکم دیا' رات کے وقت جنگل میں ڈر ہوتا ہے۔ سب ہرکاروں کے گھنگھرو بڑھادو۔ حضور پہلے بھالے میں چار گھنگھرو ملتے تھے اب آٹھ ہوگئے۔ ۔ ۔ ۔ بھوت پریت اور باگھ کی کیا مجال کہ سرکار کے ہرکارے سے بولے' سرکاری ڈاک سر پر ہو تو کیا ڈر؟"

سگریٹ ختم کر کے وہ پھر بولا۔۔ "اب دیکھا حضور آپ نے! سالے نے پیڑ کی

ڈال توڑدی۔ بس چلتا تو اٹھاکر پٹخ دیتا لیکن ہم لوگ ایسے بے خبر تھوڑے ہی رہتے ہیں۔ دم لینے کو لیٹا تھا تب بھی گھنگھرو ہاتھ میں تھا' جہاں گھنگھرو بولا' سالے کا کہیں پتہ نہیں ہوتا۔ حضور ابھی پرسوں رات میں ڈاک اور بھالا سڑک کے کنارے رکھ کر پیشاب کرنے بیٹھ گیا تو سالے نے تھپڑ ماردیا۔ میں پیچھے کو گرا تو ہاتھ پڑا گھنگھرو پر اور سالا غائب۔

سگریٹ ختم ہوجانے پر میں اٹھ کھڑا ہوا اور ڈاک بنگلے کی طرف چل پڑا۔ دل ہی دل میں بھگوان کا شکر ادا کر رہا تھا کہ ڈر سے نشانہ چوک گیا۔ اگر کمبل میں لپٹے ہر کارے کو گولی لگ جاتی تو کیا ہوتا؟

کامیابی کے لئے اور ناکامی کے لئے بھی شکر بھگوان کا ہی کرنا چاہئے لیکن ہرکارے کو تو انگریز کے گھنگھرو کے سوا کسی پر بھروسہ نہیں۔ بھگوان اور انگریز کے گھنگھرو میں کون بڑا ہے۔ اعتقاد کے اس تنازعے میں تو اعتقاد ہی فیصلہ کرسکتا ہے۔

جیت کی ہار

"وکالت کے کام میں انصاف، ناانصافی سے اتنا مطلب نہیں رہتا جتنا کہ قانونی پینتروں کے ذریعہ مقدمے کی ہار جیت سے!" وکیل صاحب آرام سے کرسی پر پسرتے ہوئے بولے، "لیکن جب مقدمہ جیت لینے پر بھی دل ہار مان جائے، انسان اپنی آنکھوں میں ہی گر جاتا ہے۔ خواہش ہوتی ہے کہ موکل سے ملی فیس کو ٹھوکر ماردیں۔"

وکیل صاحب نے گردن کو کرسی کی پشت سے لگاکر جھٹکا دیا جیسے شرمندگی سے جھکی گئی گردن کو سیدھی کرنے کے لئے دماغ پر لدے بوجھ کو گرادینا چاہتے ہوں۔ میز پر کہنیاں ٹکادیں۔ ہتھیلی سے کنپٹی کو سہارا دیا اور دماغ پر سوار بوجھ کو اتارنے کے لئے سنانے لگے۔ عدالتی انداز میں کہی گئی پوری بات کا مطلب تھا۔۔۔۔

وہ لڑکا، لڑکا کیا، اچھا خاصا نوجوان۔۔۔ اور پھر اٹھارہ بیس برس کا آدمی عقل سے لڑکا ہی ہوتا ہے۔ تلوک سنگھ 'بڈوری' کے ہائی اسکول میں میٹرک میں پڑھ رہا تھا۔ بڈوری ضلع الموڑہ میں باگیشور سے آگے 'بیرناگ' کی سڑک پر بہت چھوٹی سی بستی ہے لیکن اس میں ایک ہائی اسکول ہے۔ سڑک کے دونوں طرف آمنے سامنے پندرہ بیس دکانیں ہیں۔ پہاڑی ڈھنگ کی دکانوں میں چھتیں ڈھال والی ہونے کی وجہ سے اندر کاٹھ کی پڑچھتی ڈال لینے سے اوپر کے لئے ایک منزل آپ ہی نکل آتی ہے۔ دکانوں میں اوپر کی منزل میں اور پچھواڑے کوٹھریوں میں دکان داروں کی گھر گرہستی ہوتی ہے۔ دو تین بزاز کی دکانیں، تین چار پرچون، نمک، تیل، تمباکو کی ان دکانوں میں کسانوں کے ہل کے لئے لوہے سے لے کر دوا دارو تک مل سکتی ہے۔ دو تین دکانیں بساطی کی، تین چار درزی، موچی اور لوہار کی۔ چائے، مٹھائی اور نمکین کی دکانیں تو پہاڑوں میں سڑک کے کنارے اکثر مل ہی جاتی ہیں۔ دو ڈھائی سال سے پانچ سات

پنجابی شرنارتھی آبسے ہیں تو کچھ رونق بڑھ گئی ہے۔ کبھی کبھی سرسبز پہاڑیوں پر شفاف نیلے آسمان کے نیچے جھومتے چیڑ کے پیڑ بھی گراموفون کے ریکارڈوں اور بیٹری کے ریڈیو سے 'دلارا لیا....' اور 'لال دوپٹہ ململ کا....' کی اور دوسری فلمی گانے بھی سن پاتے ہیں۔

الموڑہ کے دیہات میں مسلمانوں کی تعداد روپے میں پیسے بھر نہیں ہے جو ہیں وہ درزی، مستری، دھنکے اور نقارچی کا کام کرتے ہیں اور ایسی چھوٹی چھوٹی بستیوں کے بازاروں میں سمٹے رہتے ہیں۔ برہمن، راجپوت جیسے کاریگروں (اچھوتوں) کے ہاتھ کا پانی بھی نہیں پیتے ویسا ہی پرہیز ان لوگوں سے بھی ہے، بلکہ کچھ کم ہی سمجھئے کیونکہ اٹھنا بیٹھنا تو ان لوگوں سے برابری کا ہے۔ وہاں کے مسلمان قسم بھی کھاتے ہیں تو دیوی دیوتا کی۔ نہ برقع، نہ پردہ، نہ کوئی رواج کا فرق۔ کبھی کبھار ان کی عورتیں تھنا بھی پہن لیتی ہیں۔

پہاڑی شہروں میں ملک کے تجارتی شہروں جیسی خوشحالی تو نہیں ہے، لیکن دیہات کی جیسی غریبی بھی نہیں ہے۔ لوگوں کا دل مایوسی سے مردہ نہیں ہے۔ تعلیم و ترقی کا ولولہ ابھی باقی ہے۔ بڈوری، ہائی اسکول میں بہت سے لڑکے سامان (آٹا چاول) گھر سے باندھ لاتے ہیں اور اپنی روٹی اور بھات اپنے ہاتھ سے تیار کرتے ہیں۔ جو اچھے کھاتے پیتے گھروں کے ہیں وہ بورڈنگ میں رہتے ہیں۔ تلوک سنگھ باریا، کے تھوک دار (نمبردار) کا اکلوتا بیٹا ہے اور گھر سے کافی مالدار ہے۔ وہ بورڈنگ میں ہی رہتا تھا۔

ہائی اسکول اور بورڈنگ بڈوری کی بستی سے کچھ ہٹ کر واقع ہیں۔ شام کے وقت لڑکے چائے سگریٹ کے لئے بازار میں آجاتے ہیں۔ دکانوں پر اٹھ بیٹھ کر، آتے جاتے مسافروں سے مذاق یا دکان کے اوپر گرہستی والوں کی کھڑکیوں میں تاک جھانک اور چہل کرکے دل بہلاتے ہیں۔ موتی رام شرنارتھی کے ریڈیو سے گانا اور خبریں بھی سنتے ہیں۔

تلوک سنگھ ایک تو تھوک دار کا بیٹا، دوسرے اس عمر میں ہاتھ پاؤں چلنے کو بے چین رہتے ہی ہیں۔ وہ اکثر تین چار ساتھیوں سے گھرا رہتا تھا۔ وہ چائے پیتا تو ساتھی

بھی پی لیتے۔ وہ سگریٹ کی ڈبیا خرید تا تو سگریٹ سب میں بانٹ کر ڈبیا کو فٹ بال کی طرح ٹھوکر سے اچھال دیتا۔ اس کے ساتھی خوشامد کرتے ۰۰۰ ”ٹھوک دار جس لڑکی پر نظر ڈال دے بچ کر نہیں جاسکتی۔“ تلوک سنگھ دونوں ہاتھ کمر پر ٹکا دیتا۔ گردن ٹیڑھی کرکے، آنکھوں کی پتلیاں دائیں کونوں میں اور سگریٹ ہونٹوں کے بائیں کونے میں دبا کر جواب دیتا ”ہاں تو پھر کیا کہتے ہو۰۰۰۰ ڈر کس کا؟“

بشیر درزی کی بڑھاپے کی شادی سے واحد لڑکی نجمہ (نازو) سن بلوغت کو پہنچ رہی تھی۔ رنگ گورا اور آنکھیں بڑی بڑی۔ منڈوے، کی کالی روٹی، بیشونا (بچھو بوٹی) کا ساگ اور موٹا لال چاول کھاکر بھی جانے کیسے اس کے بدن پر پکی خوبانی کی سرخی اور دودھ کی چکنائی چھائی جارہی تھی۔ چھریرا بدن ابھی پوری طرح نہیں گدرایا تھا لیکن چھاتیوں پر ابھار آگیا تھا، اتنا کہ دوڑنے بھاگنے میں ہچکچاہٹ محسوس ہونے لگی تھی۔ بچپن میں بستی کے جن لونڈوں کے ساتھ ”جھونٹا کھولے“ کھیلتی تھی اور جن لوگوں کی گود میں بڑی ہوئی تھی اب ان ہی سے شرمانے لگی تھی۔

نازو کے ماں باپ دونوں ہی لڑکی کے، برسات میں، کدو کی اچانک لپک جانے والی بیل کی طرح بڑھ جانے سے فکرمند تھے۔ لڑکی ماں سے بھی دو انگلی اونچا سر اٹھا رہی تھی۔ بشیر کو گروڑ، بیری ناگ، باگیشور، سو تیشور یا الموڑہ جانے کا کوئی موقع ملتا تو لڑکی کے لئے کوئی لڑکا ڈھونڈ پاتا مگر فرصت ہی نہیں مل رہی تھی۔ لڑکی کا نکاح کرا دینے کے لئے دو چار کپڑے، برتن بھانڈے کی ضرورت تھی۔ ابھی مشین کی قیمت کا قرض ادا نہیں ہوپایا تھا۔ غلہ روپے کا ڈیڑھ دو سیر مشکل سے مل رہا تھا۔ سلائی کے دام بڑھانے پر کوئی راضی نہیں تھا۔ ایک دن کی مزدوری چھوڑ دے تو کھائے کیا۔ بشیر، نازو کی ماں اور نازو سب ہی مل کر کام کرتے تھے، تب کہیں کچھ بن پاتا تھا۔ بشیر کپڑے کاٹ کاٹ کر دیتا جاتا۔ اندر کوٹھری میں بیٹھی ماں اور بیٹی کچا کردیتیں یا کاج لگاتی رہتیں۔ بشیر مشین چلاتا رہتا۔

اسکول کے لڑکے نازو کی وجہ سے، مسعود اور لکھی رام کی دکانیں چھوڑ کر سلائی کے لئے بشیر کے یہاں آنے لگے۔ بشیر میاں کو اپنی مہارت پر غرور ہونے لگا۔ وہ اسے اللہ کی برکت سمجھ کر جی جان سے محنت کرنے لگا لیکن نازو خوب سمجھتی تھی۔ دل میں

گدگدی بھی ہوتی اور کبھی لڑکے زیادہ بے شرمی سے گھورنے لگتے یا پھر پچھواڑے کے جنگل سے ایندھن لاتے یا ادھر ادھر مرغیاں ڈھونڈتے اور کول سے پانی کا گھڑا لاتے وقت اشارے بازی کرنے لگتے تو اس کو جھنجلاہٹ بھی ہوتی۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی عزت بچانے کے لئے گالی دینے، پتھر مارنے یا باپ سے شکایت کرنے کی دھمکی دینے پر بھی مجبور ہو جاتی تھی۔

تلوک سنگھ نازو کے چکر میں دو تین قمیصیں پاجامے اور ایک کوٹ بشیر سے سلوا چکا تھا۔ وہ کوٹ کی بانہوں یا کالر کا عیب ٹھیک کرانے کے بہانے بار بار دکان پر جا پہنچتا۔ کبھی انڈا خریدنے کے بہانے پچھواڑے سے آواز دیتا۔ نازو خوب سمجھتی تھی۔ یوں تلوک سنگھ اسے بھی اچھا لگتا تھا، اس کا رعب داب تھا لیکن وہ تلوک سنگھ کو تنگ کرنے کے خیال سے یا تو چھپ جاتی یا نظریں نیچی کیے رہتی۔ وہ تلوک سنگھ اور دوسرے لڑکوں کے نام بھی جان گئی تھی یا لڑکوں نے ہی اس کے سامنے ایک دوسرے کو پکار پکار کر اپنے نام سنا دیے تھے۔

ایک اتوار کے دن تلوک سنگھ تین چار لڑکوں کو ساتھ لیے صبح ہی چائے پینے دکان پر گیا تھا۔ نازو سڑک پار لکھی شاہ کے یہاں سے بڑی سی ہانڈی میں چھاچھ لے کر، دونوں ہاتھوں سے سنبھالے، لوٹ رہی تھی۔ تلوک سنگھ نے انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔۔ "چھاچھ کے لئے اتنی تکلیف، کہو تو دودھ سے نہلا دیں۔؟"

"اپنی ایجا (ماں) کو نہلا۔" غصے سے پیچھے گھوم کر نازو نے انگوٹھا دکھا کر جواب دیا اور جھٹ اپنی دکان میں جا گھسی۔

ساتھیوں کے سامنے تلوک سنگھ کی بے عزتی ہو گئی۔ اس نے کندھے اچکا کر ہاتھ میں نہ آنے کے قابل مونچھوں کے روئیں سہلائے اور اپنے ساتھیوں کو سنا کر بولا۔۔ "اچھا، حرام زادی کی دیکھوں گا۔۔۔"

تلوک سنگھ نازو کو سیدھا کرنے کی تاک میں رہنے لگا۔ اسے معلوم تھا کہ تیسرے پہر کبھی نازو اور کبھی اس کی ماں دکانوں کے پیچھے کے جنگل میں ایندھن لینے جاتی ہیں لیکن عورتیں عام طور پر اکیلی نہیں بلکہ تین چار ایک ساتھ جاتی ہیں۔ وہ انتظار سے اکتایا جا رہا تھا۔ ایک دن اس نے پڑھائی کے وقت ٹیکری پر بنے اسکول کی

کھڑکی سے دیکھا کہ نازو کی ماں دو پڑوسنوں کے ساتھ ایندھن لینے جنگل کی طرف جارہی تھی۔ تلوک سنگھ اسکول سے اٹھ گیا۔ وہ بازار کی بستی کے پچھواڑے ساگ سبزی لگانے کے لئے بنائے گئے چھوٹے چھوٹے کھیتوں کی باڑوں کے پیچھے چھپتا ہوا بشیر کی مکان کے پیچھے والے دروازے پر جاپہنچا۔ نازو کی ماں آنگن کے کواڑ بھیڑ گئی تھی۔ کواڑ ہاتھ کے دباؤ سے کھل گیا۔ نازو پچھواڑے کی کوٹھری میں روشنی کے لئے آنگن کی طرف کے دروازے سے لگی، سر جھکائے گنگناتے ہوئے بیٹھی قمیص کے کاج بنا رہی تھی۔ دکان سے بشیر کی مشین کی گھر گھراہٹ سنائی دے رہی تھی لیکن دروازہ آمنے سامنے نہ ہونے کی وجہ سے دکان اوجھل تھی۔

تلوک سنگھ پنجوں کے بل آنگن پار کرگیا۔ پرچھائیں پڑنے پر نازو نے نظر اٹھاکر دیکھا تو اس کا چہرہ فق ہوگیا۔ تلوک سنگھ نے پنجوں کے بل اس کے سامنے بیٹھ کر دبی آواز میں کہا۔۔ "اب بول .... اور دکھا انگوٹھا!"

نازو نے گہرا سانس کھینچا اور پیچھے سرکتے ہوئے، دھیمے لہجے میں دھمکایا۔ "باپو کو پکارتی ہوں۔"

پکارا!" ڈھٹائی سے تلوک سنگھ نے جواب دیا، "کہوں گا، اسی نے پچھواڑے سے بلایا تھا۔ آجا، ایجا نہیں ہے۔"

"تیرے پاؤں پکڑتی ہوں، یہاں سے جا!" نازو گڑگڑائی۔

کیوں! ... اور سب سے تو خوب ہنستی بولتی ہے۔ ہم نے کون سا مرا کتا گھسیٹا ہے؟ ہماری کیا جات نیچی ہے؟ ہم تو تیرے لئے جان ہتھیلی پر لیے پھیرتے ہیں۔" تلوک سنگھ نے مسکرا کر نازو کی کلائی پکڑنے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

"جھوٹ" پیچھے سرک کر نازو نے تردید کی، "میں کب کس سے ہنسی بولی؟"

"اس دن گالی کیوں دی تھی؟"

"ہاں، تو تو سب کے سامنے ...." وہ چپ رہ گئی۔

"اچھا تو ہماری تیری رہی، کسی کو خبر نہیں ہونے کی۔" تلوک نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"تیرے پاؤں پکڑتی ہوں، یہاں سے جا!" سمٹی ہوئی نازو پھر گڑگڑائی، "باپو سن

لے گا، کوئی آجائے گا!"

"اچھا تو پھر باہر ملنا۔ کل دیا جلنے کے بعد آنا کھڈ میں، بھوت والے پیپل کے نیچے۔"

"ہائے اب جا۔" نازو نے پھر ہاتھ جوڑے، "ابھی جا!" نازو نے پیچھے سرکتے ہوئے دہرایا۔

تلوک سنگھ کا جسم سنسنا رہا تھا، "اچھا تو قبول کر، ہاتھ ملا۔"

نازو نے ڈرتے ڈرتے ہاتھ بڑھا دیا۔ تلوک سنگھ نے اسے ہاتھ سے کھینچ لیا اور اس کا سر پیچھے ہٹاتے ہٹاتے اس پر جھک کر اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیے اور پھسپھسایا۔۔ "اب تو ہماری ہوگئی، یاد ہے!" اور پھر وہ پنجوں کے بل باہر نکل گیا۔

تلوک سنگھ چلا گیا تو نازو کی جان میں جان آئی۔ کپکپی بند ہوئی۔ پھر اٹھ کر کواڑوں کو کنڈی لگائی۔ سوچنے لگی۔۔ ہائے یہ کیا ہوگیا؟ کپڑا اور سوئی اب بھی ہاتھ میں تھی لیکن آنکھیں تر ہوجانے کے وجہ سے اور سر گھومنے کی وجہ سے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہونٹوں پر اب بھی ہلکی ہلکی مرچ لگ رہی تھی۔ "ہائے کوئی دیکھ لیتا تو؟"

"بیٹی کاج بن گئے ہوں تو دے جا۔" نازو نے سنا اور سوکھے گلے سے جواب دیا، "بنا رہی ہوں ابا۔" اس نے کہہ تو دیا مگر بنا نہیں پا رہی تھی۔ جیسے تیسے کام ختم کرکے وہ باپ کے پاس گئی اور بولی، "سر میں بڑے زور کا درد ہو رہا ہے ابا، آنکھ نہیں ٹک پا رہی ہیں اس بخت۔"

نازو کھاٹ پر جالیٹی اور آنکھیں موند کر سوچنے لگی۔ ہائے کوئی دیکھ لیتا تو۔۔۔ اور پھر خیال آیا۔۔ دوسرے لڑکے تو بچے ہیں۔ اس کا کلیجہ تو ہے۔ وہ بہت دیر تک سوچتی رہی۔ اب اس کی اپنی بات ہے جسے کوئی نہیں جانتا۔ کانوں میں برابر گونج رہا تھا۔ "ہم تو تیرے لئے جان ہتھیلی پر لیے پھرتے ہیں۔" اس نے اپنے ہونٹوں پر زبان لگا کر انہیں چکھا اور خود شرما گئی۔ یاد آیا "اب تو ہماری ہوگئی، یاد رہے۔"

نازو، باپ اور ماں کی نظروں سے کترا رہی تھی جیسے وہ اس کے سینے میں دبی بات جان لیں گے۔ اس رات وہ اپنی ماں کی بغل میں لیٹی تو اسے ماں اور اپنے بیچ

ایک کول سی بتی محسوس ہوئی جیسے اس کی اپنی زندگی اب الگ بن گئی ہو۔ دل چاہتا تھا کہیں الگ سوئے۔ ماں سے کیوں چمٹی رہے؟ بڑی بھاری فکر تو اس بات کی تھی کہ کل کا وعدہ کیسے پورا کرے۔ بھوت والے پیپل کے نیچے ڈر کے مارے کوئی آئے گا تو نہیں! سوچا... اگر بھوت ہی آجائے؟ ہائے کیوں آئے گا بھوت۔ شام کو گھر سے باہر جانے کے کئی بہانے ڈھونڈ ڈالے اس نے۔

اگلے دن نازو کی ماں شام سے ہی عبیداللہ بزاز کے یہاں گئی ہوئی تھی۔ عبید کی بہو کے بچہ پیدا ہوا تھا۔ بشیر میاں سورج چھپنے کے بعد آنکھوں سے مجبور ہو کر کام نہیں کرپاتے تھے اس لئے دونی بھر کی افیم کھا کر اللہ کو یاد کرتے کرتے اونگھنے لگتے۔ اس وقت چاہتے کہ انہیں کوئی نہ پکارے۔ اندھیرا گھنا ہوا تو نازو نے دانت تلے آنچل دبایا اور کھنڈ کی طرف چل دی۔

تلوک سنگھ بہت بے چین ہو رہا تھا۔ کبھی نازو کو بانہوں میں بھرتا' کبھی اسے گود میں بٹھانا چاہتا اور کبھی ادھر ادھر ہاتھ چلاتا۔ نازو لڑکھڑاتی آواز میں اس سے کہہ رہی تھی۔۔۔ "لوگوں کو پتہ چل گیا تو میرا سر کاٹ دیں گے۔"

"کیسے پتہ چل جائے گا؟"

"کچھ ہو گیا تو۔" اس نے اندھیرے میں تلوک سنگھ سے آنکھیں ملاتے ہوئے کہا۔

"کیا کہتی ہے!" اسے کندھوں سے تھام کر تلوک سنگھ نے یقین دلایا۔ کوئی تجھے کچھ کہے گا تو میں تجھے اپنے دیس لے جاؤں گا۔ یہاں کیا رکھا ہے۔"

"سچ کہتا ہے؟" نازو کی آنکھیں چمکیں۔

"نہیں تو کیا؟"

"دیوی کی قسم؟"

"دیوی کی قسم!... تو کیا مجھے نہیں چاہتی؟"

"چاہتی نہیں تو کیا..." نازو اس کے کندھے پر سر رکھ کر بولی "مجھے دیس لے چل۔"

اس شام کے بعد سے تلوک سنگھ لڑکوں سے گھرا ہونے پر نازو سے تاک جھانک

نہ کرتا۔ اکیلا سامنے چائے کی دکان پر آکر بیٹھتا تو اوپر کھڑکی میں بیٹھی نازو سے آنکھیں ملاتا رہتا۔ نازو پیار کا اشارہ پاکر مسکرا بھی دیتی۔ نازو اندھیرا ہونے پر عبیداللہ کے یہاں سے کوئی چیز لے کر یا دے کر لوٹتی تو بہت دھیمے ٹھمکتی ہوئی کہ بازار میں کوئی ہے یا نہیں؟ ہے تو کون؟

تلوک سنگھ بھی سمجھ گیا تھا۔ ایک دن ایسے ہی پاس سے گذرتے ہوئے بات ہوئی۔ تلوک سنگھ نے کہا، "آج کھنڈ میں آنا۔"

"آج نہیں پھر کبھی" نازو نے دھیرے سے کہا۔

دوسری بار بھی نازو کو موقع نہیں ملا۔ تلوک سنگھ کو لگا کہ دھوکا دے رہی ہے۔ اس نے سوچا اچھا دیکھا جائے گا۔۔۔

"ایک مہینہ بھی نہیں بیتا تھا کہ۔۔۔

چوتھا پہر ڈھل رہا تھا۔ لڑکے اسکول سے بورڈنگ میں لوٹ کر آرام یا ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ بچی سنگھ، تاش کی گڈی لہراتا ہوا، کندن اور پیارے کو ساتھ لیے تلوک سنگھ کو کھیل کے لئے چیلنج کر رہا تھا۔

"سالے پہلی بار کی ہار کا بدلہ چکالے تو کھیل کا نام لینا! چوتڑوں میں گو نہیں، کوؤں کو نیوتا دے رہے ہیں۔" تلوک سنگھ بچی سنگھ کے چیلنج کے جواب میں کہہ رہا تھا۔ لڑکوں کا دھیان آہٹ پاکر ٹیکری کی پگڈنڈی کی طرف گیا۔ پگڈنڈی پر شرنارتھی بزاز موتی رام اور نند لال تیز قدموں سے چلے آرہے تھے۔

موتی رام ہاتھ میں اخبار لیے تھا۔ قریب آکر وہ غصے اور جوش میں گالی دے کر چلایا۔۔ "ڈوب مرو تم ہندوؤ! پنجاب میں اتنا کچھ ہوگیا۔ تم لوگوں کی۔۔۔ میں کھاج بھی نہیں ہوئی۔ سالو! ڈوب مرو اور حوصلے بڑھاؤ:۔۔۔ ان مسلوں کے اب اور کیا چاہئے؟ تمہارے پڑوس باگیشور میں ہی اس حرامی مادر۔۔۔۔ قادر نے برہمنی کو خراب کردیا۔ بنگال میں روز ہزاروں ہندوؤں کو کاٹا جارہا ہے۔ دیکھ لو یہ اخبار۔" اس نے اخبار دکھایا، "تم ان مادر۔۔۔۔ سانپوں کو دودھ پلا پلا کر پالو اور یہ تمہاری بہو بیٹیوں کو خراب کریں۔ دیکھتے کیا ہو؟ ہندو پنجاب اور بنگال سے نکالے گئے، اب یہ لوگ

تمہارے چوتڑوں پر لات مار کر انہیں یہاں سے بھی نکال دیں گے۔ تم کان میں تیل ڈالے پڑے رہو۔۔۔

سب لڑکے قریب آگئے۔ موتی رام کے ہاتھ سے پیارے اخبار لے کر سب کو سنانے لگا۔ ڈھاکہ سے ہزاروں ہندو ہائے ہائے کرتے مغربی بنگال جا رہے ہیں۔ ان سب کا سامان اور جوان لڑکیاں اور بیویاں چھین لی گئیں۔ جوان لڑکیوں کے ساتھ دس دس آدمی کا زنا بالجبر اور نیچے سے لے کر اوپر تک پیٹ پھاڑ دینے کی خبریں تھیں۔

نند لال نے آنکھوں سے چنگاریاں برساتے ہوئے کہا کہ پنجاب کے گجرات اور وزیر آباد شہروں میں ہندوؤں کے ہاتھ پاؤں باندھ کر ان کے سامنے ان کی عورتوں کا بلاتکار کیا گیا۔ "اس وقت کسی بہن۔۔۔ ماں کے لال نے ٹھیک سے بدلہ لیا ہوتا تو آج یہ ہوتا کیا؟ لیکن ہندوؤں کی تو قوم ہی۔۔۔ بزدل ہے۔ یہ سالے کل مرتے ہوں تو ان کا آج ہی مرنا اچھا۔۔۔"

"بہن ••• ٹھاکروں' راجپوتوں کے لونڈے ہو!" موتی رام نے نفرت سے للکارا' "مرجاؤ ڈوب کر اپنے ہی پیشاب میں۔ ہم لوگوں نے پوربی پنجاب میں ایک مسلے کو نہیں چھوڑا۔ ہماری تو یہ کانگریسی سرکار دشمن ہے۔ یہ ہمیں نہ روک لیتی تو ہم پیشاور تک بہن ••• مسلمانوں کا نشان مٹا دیتے۔ تم یہاں گھگھریاں اور چوڑیاں پہن لو! پاکستان میں ہندو نہیں رہ سکتے تو ہندوستان میں مسلے کیوں رہیں؟ وہ بہن ••• اپنے یہاں ہندوؤں کو دشمن مان کر مٹائے دے رہے ہیں اور تم ان سانپوں کو آستین میں رکھ کر پچکارو! ہونے تو لگا اب تمہارے گھر میں بھی۔ دیکھ لو ہو تو گیا باگیشور میں' دیکھ لو نہ جاکر؟ جب تک ایک ایک ہندو کی جان اور ہندو عورت کی عزت کا بدلہ نہیں لوگے' تمہارا بیج ختم ہو جائے گا۔ دیکھتے کیا ہو؟ کیوں تھوک دار!" اس نے تلوک سنگھ کو للکارا اور پھر بجی سنگھ کی طرف دیکھا' "کیوں ٹھاکر؟"

"ہاں بہن ••• مسلوں کی ماں •••!" بجی سنگھ نے تاش کی گڈی فرش پر پھینک دی اور اپنی کھاٹ کے پاس کونے میں رکھی لاٹھی کو اٹھانے کے لئے لپکا۔ سب ہی لڑکے آپے سے باہر ہو گئے۔ تلوک سنگھ نے بھی ایک ڈنڈا اٹھالیا۔ جس کے ہاتھ جو آیا لیکر موتی رام اور نند لال کے ساتھ ٹیکری سے ایسے دوڑے جیسے پتھروں کا ڈھیر

ڈھلان کی طرف لڑھک رہا ہو۔

بازار میں پہنچ کر ان لوگوں کے ہاتھ میں کھکری، بلم، تلواریں اور چھرے بھی آگئے۔ بازار کے ہندوؤں میں ڈھاکہ اور باگیشور کی افواہوں سے پہلے ہی اشتعال پھیلا ہوا تھا۔ لڑکوں کے ساتھ بازار کے بیس پچیس ہندو بھی آگئے۔

بھیڑ للکارنے لگی "مارو سالے .... مسلوں کو۔"

سب سے پہلے نندلال کے حریف بزاز عبیداللہ کی دکان اور گھر تھا۔ بچی سنگھ نے جاتے ہی ایک بلم اس کی پسلیوں کے پار کردیا۔ تلوک سنگھ بھی ڈنڈا پھینک کر کسی کے ہاتھ سے تلوار لے چکا تھا اس نے خوف سے چلاتے عبید کے جوان بیٹے اکبر کے پیٹ میں تلوار بھونک دی۔ شور مچ گیا... "مارو سالے مادر... مسلوں کو!"

مشتعل بھیڑ عبید کے گھر میں گھس گئی۔ مشرقی اور مغربی پاکستان میں ہندو عورتوں کے ساتھ کیے گئے زنا بالجبر اور خطرناک مظالم کی داستان مشتعل بھیڑ کو پاگل کیے ہوئے تھی۔ وہ اپنی ذات کی ماں بہنوں پر کیے گئے ظلم کا بدلہ لینے پر تلے ہوئے تھے پاکستان سے آئی خبروں کی پیروی کرتے ہوئے عبید کی جوان بہو اور بیٹی کو ننگا کر دیا گیا اور یاد کرکے ان کے جسموں کے ساتھ وہی سلوک کیا گیا جو مسلمانوں کے ذریعہ ہندو عورتوں کے ساتھ کیا گیا تھا۔ عبید کی بیوی کے سینے سے چمٹے پوتے کی پیٹھ کو چھیدتا ہوا بلم دادی کی پیٹھ کے پار ہوگیا۔ اس کے جسم کو جگہ جگہ سے کاٹ کر ہندو عورتوں کے ساتھ ہوئے ظلم کا بدلہ لیا گیا۔ پاکستان میں مسلمانوں نے ظلم کیے۔ ہندوستان میں ہندوؤں نے بدلہ لیا۔ ماری گئی دونوں طرف بے بس عورتیں۔

عبید بازار اور پاس پڑوس میں سینکڑوں آدمیوں کے کام آتا تھا۔ وہ کسی کا دشمن نہیں تھا اور نہ اس کا کوئی دشمن تھا لیکن یہاں کسی کی دوستی یا نفرت کا سوال ہی نہیں تھا۔ یہ مذہب کا معاملہ تھا۔ جو سب کو بے رحم اور ظالم بنا دیتا ہے۔

آدمی کا ضمیر دیے کی لو کی طرح ہوتا ہے اور بھیڑ کا اشتعال شعلوں کی طرح۔ انفرادی تعلقات اور لحاظ اس آگ میں جل کر خاک ہوجاتے ہیں۔ عبید کا خاندان ختم ہوگیا لیکن بھیڑ کی مارکاٹ کے جذبے میں کمی نہیں آئی۔ ان کے دل میں لاکھوں خاندانوں کی تباہی کی جلن تھی۔ ایک خاندان کو ختم کرکے بھیڑ اور بھڑک گئی جیسے اس

میں تیل پڑ گیا ہو۔ ان کے سر پر خون سوار تھا۔ مشتعل بھیڑ بربادی اور تباہی کے نعرے لگاتی جا رہی تھی۔

بساطی رسولے اور درزی بشیر کی دکانیں برابر برابر تھیں۔ انہوں نے عبید کی دکان سے شور کی آواز سنی تھی مگر سمجھ نہیں پائے کہ ماجرا کیا ہے۔ سمجھے دیہات کے جاہل آپس میں لڑ پڑے ہیں۔ ہندو مسلمان کا جھگڑا وہاں کسی نے سنا بھی نہیں تھا۔ بھیڑ کو "مارو مسلوں کو" چلاتے ہوئے اور خون سے لت پت بلم اور تلواریں لیے اپنی دکان کی طرف آتے دیکھ کر بشیر ہڑبڑا کر مشین سے اٹھا اور دکان کے کواڑ بند کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ تلوک سنگھ نے لپک کر بند ہوتے کواڑوں میں سے تلوار اس کے جسم میں گھونپ دی۔

بشیر چلا کر گر پڑا۔ کواڑ دھکیل کر بھیڑ اندر گھس گئی۔ سامنے دکھائی دی ہائے ہائے کرتی بشیر کی ادھیڑ عمر گھر والی۔ لوگوں نے اسے پکڑ لیا اور اس کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جو پاکستان میں حکومت الٰہی اور پوربی پنجاب میں ہندو راج قائم کرنے کا دعویٰ کرنے والوں نے سکھایا تھا۔

"مادر ••• حرام زادی لونڈیا کہاں گئی؟" کسی نے پکارا اور کچھ لوگ نازو کو اوپر ڈھونڈنے لگے۔ تلوک سنگھ اوپر نہ جا کر پچھواڑے کے آنگن میں گیا۔ آنگن کے کھلے دروازے سے اس نے دیکھا۔ نازو کھیت کی باڑ کے پیچھے سر پر پاؤں رکھے جنگل کی طرف بھاگی جا رہی ہے۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے بھاگا۔

بھیڑ نے اوپر کا کونا چھان مارا اور سمجھا کہ وہ بساطی رسولے کے یہاں چھپی ہے۔ نازو کے خاندان کو ختم کرنے کے بعد بھیڑ اس طرف پہنچ گئی۔ اتنی دیر میں نازو اور اس کا پیچھا کرتا ہوا تلوک سنگھ پیڑوں سے چھائی ایک ٹیکری کے پیچھے اوجھل ہو چکے تھے۔

نازو پیچھا کیے جانے کی آواز سن کر اور تیز دوڑی مگر عورت عورت ہوتی ہے اور مرد مرد۔ تلوک سنگھ اس کے قریب پہنچ کر ہانپ گیا تھا۔ زور سے ڈانٹتے ہوئے بولا "نامراد!"

نازو کے پاؤں دہشت سے لڑکھڑا گئے۔ اس نے ناامیدی سے پیچھے مڑ کر دیکھا اور

پہچان کر بولی، "تو" اور چین کا سانس لے کر اس نے بانہیں پھیلا دیں۔
تلوک سنگھ نے اسے بانہہ پکڑ کر زور سے جھنجھوڑا اور دانت سے اپنا ہونٹ کاٹ کر دھمکایا۔۔ "اور چھکالے اور بھاگ!"

دونوں ہانپ رہے تھے۔ دونوں کے دل دھک دھک کر رہے تھے۔ دونوں کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ ایک کی غصے اور اشتعال سے اور دوسرے کی ڈر سے۔ نازو تلوک سنگھ سے لپٹ گئی اور بولی۔ "میں تجھ سے تھوڑی ہی بھاگ رہی ہوں۔" اور آنکھیں بند کر لیں۔

تلوک سنگھ نے تلوار زمین پر ڈال دی اور نازو کو دونوں بانہوں سے پکڑ کر کانٹوں سے پرے ایک طرف گھسیٹ کر گرا دیا۔ نازو اس سے اور بھی چمٹتی جا رہی تھی۔ تلوک سنگھ کی بے رحمی سے اسے تسلی اور سکون کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ اسے تلوک سنگھ کے پیار کا غصہ سمجھ رہی تھی اور یہ کہ وہ حفاظت کا حق پا رہی ہے۔

نازو نے آنکھیں کھولیں تو بانہیں تلوک سنگھ کے گلے میں ڈال کر التجا کی۔ "مجھے دیس لے چل!"

"ہوں" اپنے کو سنبھالتے ہوئے تلوک سنگھ نے جواب دیا، "پہنچاتا ہوں تجھے دیس...."

اسی وقت جھاڑیوں کی اوٹ سے بھیڑ کی آہٹ پھر سنائی دی اور اس کے بعد جھاڑیوں کے اوپر لوگوں کے سر دکھائی دئے۔

رسولے کا گھر اور خاندان ختم کر کے بھی جب، نازو اور رسولے کا سولہ برس کا لڑکا رحمت نہ ملے تو بھیڑ کے کچھ لوگ انہیں ڈھونڈتے ہوئے ادھر آ نکلے تھے۔

"یہ ہے مادر .... مسلٹی!" اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے تلوک سنگھ بھیڑ کی طرف گھوم کر چلایا۔

"ہائے میں تیری ہوں! میں ہندو ہو گئی ہوں!" نازو تلوک سنگھ کی کمر سے لپٹ کر ڈر سے چلا اٹھی، "مجھے بچا!"

پکار سن کر لوگ اس طرف آ گئے۔ نازو چھپنے کے لئے ایک جھاڑی کے پیچھے دوڑی۔ تلوک سنگھ نے لپک کر اس کی بانہہ پکڑ لی اور بھیڑ کو مخاطب کیا۔۔ "سب لوگ

اس حرام زادی پر•••"

نندلال اور تارو نے نازو کو دونوں بانہوں سے تھام لیا۔

تارو بازار کا ہی لڑکا تھا۔ اسے پہچان کر نازو ہاتھ جوڑ کر گڑگڑائی۔۔ "داجیو (بڑے بھائی) میں تیری بہن ہوں۔ میں تیری بہن ہوں! •••• میں ہندو ہو گئی!"

ان لوگوں کے بیچ ہائے ہائے کرتی اور سسکتی نازو کا لہولہان بدن بری حالت میں کھلا پڑا تھا۔ وہ اپنے آپ کو سنبھال پانے میں ناکام تھی۔

"اب ختم کردو اس حرام زادی کو!" کوئی بولا۔

نوجوانوں کے غصے کی آگ اب دھیمی پڑ گئی تھی۔ تلوک سنگھ کے ہاتھ سے گری تلوار، کئی لوگوں کے پاؤں کی ٹھوکروں سے جھاڑیوں اور گھنی گھاس میں جانے کہا چھپ گئی تھی۔ تلوک سنگھ اور دوسرے لوگوں نے تلوار کی ادھر ادھر تلاش کی مگر وہ نہیں ملی۔

تلوک سنگھ نے جیب سے چھوٹا چاقو نکال لیا اور نازو پر جھپٹا۔ تلوک سنگھ کو چاقو لیے اپنے اوپر جھکتے دیکھ کر نازو بچاؤ کے لئے دونوں ہاتھ بڑھا کر چیخ اٹھی۔۔ "ہائے نہ! میں ہندو•••"

تلوک سنگھ نے حفاظت کے لئے اٹھے نازو کے ہاتھوں کو بائیں ہاتھ سے ایک طرف جھٹک کر اسے نیچے سے پیٹ تک پھاڑ دینے کے لئے چاقو چلادیا۔

نازو چیخ کر خاموش ہوگئی۔ تلوک سنگھ کے ہاتھ کانپ جانے سے یا چاقو چھوٹا ہونے کی وجہ سے زیادہ کاٹ نہیں سکا۔ بھیڑ نازو کو مرا سمجھ کر گالی دیتی ہوئی واپس چلی گئی۔

بڈوری اور پڑوس کے دیہات کے کانگریسی لوگوں کو اپنی بستی میں ایسا ظلم ہوجانا برداشت نہیں ہوا۔ انہوں نے فساد کی خبر پاتے ہی سرپنچ، مکھیا اور پٹواری کو بلوا کر زخمیوں کو ڈھونڈنا شروع کیا۔ بازار کے جو لوگ پہلے مسلوں کو مارو، چلا رہے تھے، اب شرمندہ ہو کر مدد کے لئے آگئے۔ جلے ہوئے مکانوں پر پہرہ لگادیا گیا تھا کہ چوری نہ ہوسکے۔ بشیر زخمی ہو کر بے ہوش ہوگیا تھا مگر زندہ تھا۔ ایسی ہی حالت نظیر کی ہوئی

تھی۔ لالٹین اور مشعلوں کی مدد سے بری طرح زخمی حالت میں نازو بھی ڈھونڈ نکالی گئی۔ کانگریس کے لوگوں نے زخمیوں کو ڈولیوں میں لاد کر اپنے کندھوں پر میلوں دور باگیشور کے اسپتال میں پہنچادیا۔ مردے، جانچ پڑتال کے بعد دفنائے جانے کے لئے ایک جگہ اکٹھا کردئے گئے۔

کانگریسی راج میں ایسا حادثہ ہوجانے کی وجہ سے، کانگریسی دکھی اور شرمندہ تھے۔ ان کی نظر میں ہندو مسلمان کا خیال نہیں بلکہ انسان کا خیال تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ مجرموں کو سزا ملے، انصاف ہو اور پھر ایسی واردات نہ ہوسکے۔ دنیا دیکھ لے، کانگریسی راج ہندوؤں کا نہیں، انصاف کا ہے۔ سرکار بھی بہت مستعدی سے معاملے کی جانچ کروا رہی تھی۔ بڈوری میں پولیس اور مسلح پولیس کے پڑاؤ پڑ گئے۔ کانگریسی لوگ عوام کو انصاف کے لئے پکار کر مجرموں اور مشتبہ افراد کو گرفتار کروا رہے تھے۔ بازار کے دس آدمیوں کے ساتھ چار پنجابی شرنار تھی، تلوک سنگھ، بچی نگھ اور اسکول کے چار اور لڑکے بھی گرفتار کرلیے گئے۔

تلوک سنگھ کے پتا جودھ سنگھ نے لڑکے کی گرفتاری کی خبر سنی تو اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ سب ہی نے سمجھایا کہ معاملہ سنگین ہے۔ سرکار سختی سے کام لے رہی ہے۔ پولیس کو کھلانے پلانے سے کچھ نہیں بنے گا۔ بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ تلوک سنگھ سچ سچ کہہ کر معافی مانگ لے اور سرکاری گواہ بن جائے۔

پولیس نے مجرموں کو ذرا دھمکا کر ساری بات بتانے کے لئے الگ الگ بند کردیا۔ سب ہی کو بتایا گیا کہ زخمیوں کے بیان سے اور دوسرے لوگوں کے بیان سے سب باتوں کا پتہ چل چکا ہے۔ تلوک سنگھ کو پھانسی اور کالے پانی کا ڈر دکھایا گیا۔ اس کے باپ نے رورو کر اسے سمجھایا اور تلوک سنگھ نے اپنی جان بچانے کے لئے سب بک دیا۔ پولیس نے کرید کرید کر پوچھا تو اس نے عبید کے قتل میں مدد، بشیر کو تلوار گھونپنے اور نازو کے ساتھ بدسلوکی کرکے اسے قتل کردینے کے لئے نیچے سے کاٹنے کا جرم بھی قبول کرلیا۔ اسے امید تھی کہ سرکاری گواہ بن کر سچ بولنے سے وہ بچ جائے گا۔

معاملے کی تحقیقات میں کئی مہینے لگ گئے۔ زخمیوں نے چلنے پھرنے کے قابل

ہوئے بغیر انہیں گواہی کے لئے عدالت میں لایا نہیں جا سکتا تھا۔ مقدمہ شروع ہونے پر جب سب لوگوں کو ایک ساتھ عدالت میں لایا گیا تو پتہ چلا کہ جرم کا اقبال صرف تلوک سنگھ نے ہی کیا تھا۔ لوگ اس پر لعنت ملامت کرنے لگے.... مرے گا تو ایک ہی بار؟ پھر کیے کرائے دھرم اور بہادری پر پانی پھیر کر منھ کالا کیوں کرواتا ہے۔

یہ بھی پتہ چلا کہ بیان صرف بشیر اور نظیر ہی کے ہیں اور پورا مقدمہ تلوک سنگھ کے اقبال جرم پر ہی کھڑا ہے۔ نازو اتنی ڈری اور سہمی ہوئی تھی کہ اس نے کوئی بیان دیا ہی نہیں تھا۔ لوگوں کے یقین دلانے پر تلوک سنگھ اپنے بیان سے پلٹ گیا۔ مقدمے کے لئے ایک قابل وکیل کی ضرورت تھی، اس لئے ہمارے دوست وکیل صاحب کو کھڑا کیا گیا تھا۔ وکیل صاحب نے معاملہ دیکھ کر گواہی کچی بتائی اور تلوک سنگھ کو چھڑا لینے کا یقین دلایا۔

اس بیچ پتہ چلا کہ نازو صرف ٹھیک ہی نہیں ہوگئی تھی بلکہ اس کے جسم میں ایک اور جان آگئی تھی۔ اس کے باپ نے ماتھا پیٹ لیا۔ جیسے تیسے نازو کا نکاح سومیسور کے ایک مسلمان لوہار کے لڑکے سے کرا دیا گیا۔ بیان دینے کے لئے نازو پر اس کی برادری اور پولیس کا بہت زور پڑ رہا تھا کیونکہ تلوک سنگھ کے بیان سے پھر جانے کی وجہ سے مقدمے کے پیر ہی کٹ گئے تھے۔ نازو بیان دینا نہیں چاہتی تھی۔ برادری کے لوگوں نے اسے پھٹکارا۔ اپنے دین اور قوم پر ظلم کرنے والے کافروں کو بچائے گی؟ ایسے گناہ کے لئے اللہ تجھے معاف نہیں کرے گا۔ نازو نے مجسٹریٹ کے سامنے اپنا بیان دے دیا۔

جوشیلے ہندو بھائیوں کی کوشش سے پولیس کی گواہیاں جم نہیں پا رہی تھیں۔ کچھ گواہ اکھڑ گئے، کچھ جرح میں کٹ گئے۔ بہت سے مجرم مجسٹریٹ کے یہاں سے بری ہوگئے۔ تلوک سنگھ، بچی سنگھ اور نازو کا معاملہ سیشن جج کے سپرد کر دیا گیا۔ ان پر بھی منظم حملے کی سازش کا الزام نہ بن سکا۔ ان پر الگ الگ الزامات عائد کیے گئے۔

پچھلے دن سیشن میں شام کے وقت تلوک سنگھ کے معاملے کے خاص گواہوں بشیر اور نازو کے بیان ہوئے تھے۔ بشیر کے بیان کی قیمت نازو کے بیان کے بغیر کچھ بھی نہ تھی۔ نازو چادر اوڑھے، آنکھیں نیچی کیے بیان دئے جا رہی تھی۔ اس نے باپ کے

جسم میں تلوار لگتے دیکھ کر اپنی جان بچانے کے لئے بھاگنے اور لڑکوں کے ذریعہ پکڑے جانے، اپنی بری حالت اور چاقو کے حملے سے بے ہوش ہو جانے اور اسپتال پہنچائے جانے کی ساری کہانی دھیرے دھیرے سنادی۔ وکیل صاحب کو لگ رہا تھا کہ نازو کا ایک ایک لفظ ان کے موکل کو جرم کی رسی سے باندھ رہا ہے۔ کٹہرے سے چلتے وقت نازو نے صرف ایک نظر تلوک سنگھ کی طرف ڈالی۔ تلوک سنگھ کا چہرہ فق تھا۔

اگلے دن وکیل صفائی کی طرف سے جرح تھی۔ وکیل صاحب رات بھر گواہی اور جرح کے قوانین اور نظیروں کا مطالعہ کرتے رہے۔ صبح ذہنی طور پر تیار ہو کر وہ کچھ جلدی ہی عدالت آگئے تھے اور برآمدے کے سامنے دھوپ میں کرسی پر بشیر اور نازو کے بیان کو باریکی سے ملا کر ان میں خامیاں ڈھونڈھ رہے تھے۔ نازو بھی پکار کے انتظار میں عدالت کے احاطے میں خوبانی کے پیڑ کے نیچے بیٹھی تھی۔ اس کا بچہ اس کی گود میں تھا۔

پولیس ہتھکڑی بیڑیوں میں جکڑے تلوک سنگھ کو عدالت میں لائی۔ بیڑیوں کی کھنکھناہٹ سے وکیل صاحب کی نظر اپنے موکل پر گئی۔ بیڑیوں میں جکڑا تلوک سنگھ سر جھکائے چلا آرہا تھا۔ وکیل صاحب نے گھوم کر نازو کی طرف بھی دیکھا۔ وہ ٹکٹکی لگائے تلوک سنگھ کو دیکھ رہی تھی۔ وکیل صاحب کو ایسا معلوم ہوا جیسے ایک غصے سے بھری شیرنی ہاتھ سے نکلے شکار کو گھور رہی ہو۔ انہیں ایسا معلوم ہوتا بھی کیوں نہیں؟ ایسی بھری ہوئی شیرنی کے پنجے سے انہیں تلوک سنگھ کو بچانا تھا۔

وکیل صاحب نے جرح میں بشیر کو کافی پریشان کیا تھا اور عدالت کو اس فیصلے پر پہنچا دیا تھا کہ حادثہ کے وقت وہ بدحواس تھا اس کے بیان کی سچائی کا ثبوت کیا؟ انہوں نے دل میں سوچ رکھا تھا کہ بشیر کے بیان کی گواہی ہے نازو، اس کی بیٹی۔ وہ عدالت کو سمجھائیں گے ہی کہ بیٹی تو باپ کی ہی حمایت کرے گی۔ کوئی اور بھی ثبوت تو ہونا چاہئے۔

نازو کو جرح کے لئے کٹہرے میں پکارا گیا۔ وکیل صاحب کو پھر لگا کہ نازو نے تلوک سنگھ کو اڑتی اڑتی نظروں سے دیکھا ہے۔ وہ پرسکون بے پرواہ دکھائی دے رہی تھی۔ جیسے بلی شکار کو پنجے کے نیچے محفوظ سمجھ کر مطمئن ہو جاتی ہے۔

"تمہارا نام نجمہ ہے؟" وکیل صاحب نے جرح کا پہلا سوال کیا۔

"ہاں۔"

"تم بشیر درزی کی بیٹی ہو؟"

"ہاں۔" نازو نے حامی بھری۔

"تم نے تحقیقات کے وقت پولیس یا مجسٹریٹ کے سامنے بیان دیا تھا؟"

"نہیں" نازو نے انکار میں سر ہلا دیا۔

"کیوں؟ کیا کسی کا ڈر تھا؟"

"نہیں"

"تو بیان کیوں نہیں دیا؟"

"ایسے ہی۔"

"تو اب بیان کیسے دے رہی ہو؟"

"لوگ مانتے ہی نہیں تو کیا کروں۔"

وکیل صاحب نے جج صاحب کی طرف دیکھا۔ جج صاحب نے نازو کی طرف' نازو نے نظریں جھکا لیں۔ وکیل صاحب نے کنپٹی کھجا کر کچھ سوچا اور سوال کیا۔۔ "اس کا مطلب ہے کہ تم پر بیان دینے کے لئے زور ڈالا گیا ہے؟"

"ہاں ڈالا تو ہے۔" نازو نے حامی بھری۔

"کس نے زور ڈالا ہے۔ پولیس نے؟"

"اور کیا۔"

"باپ اور برادری کے لوگوں نے بھی زور ڈالا ہے؟"

"ہوں" نازو نے سر جھکا کر اقبال کیا۔

وکیل صاحب ایسے حیران تھے جیسے انہوں نے اپنی حفاظت کے لئے حملہ کرنے کو ہاتھ اٹھایا ہو لیکن ان کو تو اور سہارا مل رہا ہو۔ جلدی بازی نہ کرتے ہوئے انہوں نے دھیمے سے پوچھا۔

"تم تلوک سنگھ کو پہچانتی ہو؟"

"ہاں"

"جن لوگوں نے دکان پر حملہ کیا تھا' انہیں پہچانا تھا؟"

"ہاں"

وکیل صاحب نے کنپٹی کھجاتے ہوئے سوال کیا۔۔ "ان میں تلوک سنگھ تھا؟"

"نہیں"

وکیل صاحب نے چین کا سانس لے کر عدالت کا شکریہ ادا کیا اور بولے کہ انہیں اب اور جرح کی ضرورت نہیں' نہ صفائی کی طرف سے اور کوئی گواہ پیش کرکے وہ عدالت کا وقت برباد کریں گے۔ نازو کو کٹہرے سے ہٹ جانے کی اجازت دے دی گئی۔ تلوک سنگھ کا باپ فساد کے دن تلوک سنگھ کے بڈوری میں نہ ہونے کی گواہی مجسٹریٹ کو پیش کرچکا تھا لیکن وکیل صاحب نے اب اس کی ضرورت نہیں سمجھی۔

اس کے بعد سرکاری وکیل بولے اور وکیل صفائی میں بھی کچھ کہا مگر جج صاحب کے ماتھے پر پڑتی سلوٹوں کو دیکھ کر لگ رہا تھا کہ عدالت کا وقت بے کار ہی ضائع کیا جارہا ہے۔ انہوں نے اسیسروں کی رائے لی۔ ان میں صرف ایک مسلمان تھا۔ گواہی کو دیکھ کر اس نے بھی ملزم کے بے گناہ ہونے کی رائے دی۔ جج صاحب فیصلہ لکھنے اندر کمرے میں چلے گئے۔ معلوم ہوا فیصلہ ابھی سنادیا جائے گا۔

وکیل صاحب تلوک سنگھ کے باپ کو ایک طرف لے جاکر بولے۔۔ "تم لڑکے کی بیڑی کاٹنے کے لئے ایک لوہار یہیں بلوالو۔"

جودھ سنگھ کی آنکھوں میں احسان مندی کے آنسو چھلک آئے۔ وہ وکیل صاحب کے پیر چھونے کے لئے جھک گیا۔ جج صاحب نے فیصلے میں پولیس کی دھاندلی پر تنقید کرتے ہوئے تلوک سنگھ کو فورا بری کردینے کا حکم جاری کردیا۔

وکیل صاحب تلوک سنگھ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے برآمدے میں سے لے جارہے تھے تب دوبارہ ان کی نظر پیڑ کے نیچے گئی۔ نازو اپنے بچے کو گود میں لیے' بشیر اور ایک دوسرے آدمی کے ساتھ پیڑ کے قریب کھڑی تھی۔ شاید جج صاحب کے فیصلہ لکھنے میں مشغول ہوجانے کی وجہ سے اس کے خوراکی خرچ پر دستخط نہیں ہوسکے تھے۔ وہ اب بھی ٹکٹکی باندھے تلوک سنگھ کو دیکھ رہی تھی۔

تلوک سنگھ کی نظر بھی اس طرف گئی۔ نازو نے بچے کو اسے دکھا کر چوم لیا اور

مسکرادی۔

وکیل صاحب کے قدم ڈگمگا گئے۔ انہوں نے تلوک سنگھ کی طرف دیکھا' اس کی آنکھیں چھلک آئی تھیں اور سر جھک گیا تھا۔

وکیل صاحب کرسی پر جوش میں سیدھے ہو کر بولے۔ "ہندو اس جیت سے خوش تھے۔ پولیس دانت پیس کر کھسیا کر رہ گئی لیکن جانتے ہو تین ماہ بعد آج کیا دیکھا؟"

وکیل صاحب نے میرے بازو پر ہاتھ رکھ کر بتایا' "آج دوپہر کو تلوک سنگھ کو اسپتال کے پاس دیکھا۔ اس کا باپ اسے ڈولی میں لایا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ بولا' "وکیل صاحب جانے اسے کیا ہوگیا ہے؟ بھوک نہیں لگتی۔ بخار سا رہتا ہے۔ ڈاکٹر کو دکھایا' اس نے تپ دق بتایا ہے۔ حضور میں تو برباد ہوگیا۔ اس کا تو جیسے دل ہی مرگیا ہے۔ جانے بھاگ میں کیا بدا ہے"

وکیل صاحب ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔ "اسے کس کی جیت کہا جائے۔ ہندو کی جیت' مسلمان کی جیت یا انصاف کی جیت؟ نازو ہندو دھرم کو نہیں سمجھتی' اسلام کو نہیں جانتی' اہنسا اور فراخ دلی نہیں سمجھتی' اسے ہندو راج اور مسلمان حکومت کا فرق نہیں معلوم۔ وہ عورت ہے۔ پیار کرنا جانتی ہے اور پیار میں معاف کرنا جانتی ہے۔۔۔ اسے کون ہرائے گا۔ کتنا ہار کر بھی وہ جیت گئی!"

وان ہنڈن برگ

سوناما گرمی کی چھٹیاں، باہر گذار کر آئی تھی۔ تین ہفتے الہ آباد میکے میں اور ایک ماہ آگرہ سسرال میں۔ دوہی مہینے کے بعد پھر درگا پوجا کی دو ہفتے کی چھٹی آگئی۔ اسکول سے چھٹی کا خیال اسے اچھا لگا۔ چھٹی جتنی بھی ہو اچھی ہے لیکن پھر سے اتنی جلدی نہ سسرال اور نہ میکے ہی جانے کے خیال سے اسے خوشی ہوئی۔ دونوں ہی جگہوں کے تجربے ابھی ذہن میں تازہ تھے۔ ان تجربوں کی یاد سے اس کا سر ادھیڑبن میں لگ کر جھک جاتا۔ چمچماتے تانبے کی جھلک لیے گندمی رنگ پر فکر کے سایے لہرا جاتے اور باریک ہونٹ اندر کی طرف بھنچ جاتے۔

سوناما نے سوچا، دو ہفتے تنہائی اور سکون کے ساتھ گذارے گی۔ اسکول کے دنوں میں وقت نہ ملنے کی وجہ سے بہت سے کام ادھورے پڑے تھے۔ اسکول کے دوران، تعلیمی سرگرمی سے شہد کی مکھیوں کے چھتے کی مانند گونجتا رہنے والا لڑکیوں کے اسکول کا بڑا بنگلہ اور اس کا احاطہ چھٹی کے وقت تنہا اور پرسکون ہوجاتا ہے، جیسے میلہ ختم ہوجانے پر میلے کا مقام ویران ہوجاتا ہے۔ چھٹی کی گھنٹی بجنے پر جب دس جماعتوں کی لڑکیاں اور بچے ایک ساتھ کمروں سے نکل پڑتے، ان کے پیروں سے اڑتی دھول آدمی کے قد تک اٹھ جاتی اور پھر وہی ویرانی اور سکون۔ سوناما اپنے کمرے کی طرف لوٹ جاتی اور ویسا ہی محسوس کرتی جیسے منزل پر پہنچنے کے بعد کندھے سے بوجھ اتار کر مزدور محسوس کرتا ہے۔ چھٹیوں کے پونے دو ماہ میں بچوں کے پیروں سے محفوظ رہ کر اور چوماسے کی بارش سے پنپ کر احاطے کے لان، مخمل ہریالی سے بھرے تھے۔ وسیع وعریض احاطے کے ایک طرف بنے کوارٹروں میں دو چپراسیوں، ایک مالی اور ایک مہری کے سوا کوئی نہیں تھا۔

اسکول کے بنگلے میں ہی پچھواڑے کی طرف اس کا کمرہ تھا۔ شروع میں اس

کمرے کو سونا مانے اپنے خاص ڈھنگ اور پسند کے مطابق سجایا تھا۔ اب کمرے کی سجاوٹ کا نیا پن ختم ہوچکا تھا لیکن اس کی اپنی شخصیت اس میں سما گئی تھی۔ اب یہ کمرہ اس کے لئے اس طرح آرام دہ بن گیا تھا جیسے کسی چیز کے لئے بنائی گئی ڈبیا اس چیز کے لئے مکمل ہوتی ہے۔

بی ٹی کا امتحان پاس کرکے چودہ ماہ قبل سونا مانے ہندو گرلز اسکول میں پرنسپل کا عہدہ سنبھالا تھا۔ اس وقت ہندوستان کی شمالی مشرقی سرحد پر جاپانی حملے کے سبب مغربی علاقوں کی طرف بھاگ آئے لوگوں کی وجہ سے اس علاقے کے شہروں میں خالی پڑے گوداموں اور اصطبل کو بھی مکان قرار دے کر کرایے پر اٹھادیا گیا تھا' اسکول کمیٹی کو سوناما کی ضرورت تھی۔ کمیٹی نے اسے یقین دلایا کہ اگر مکان کا انتظام کرنے میں آپ کو پریشانی ہوئی تو فی الحال آپ کے لئے اسکول کی عمارت میں ہی قیام کا بندوبست کردیا جائے گا پھر بعد میں مکان کا انتظام ہونے پر آپ اس میں جاسکتی ہیں۔

اسکول کی عمارت میں رہنے کے قابل کمرہ پاکر گذارہ کرنے کا خیال سوناما کے لئے خوشی کا باعث نہ تھا لیکن وہ سسرال سے جان بچان کے لئے کہیں پناہ حاصل کرنے کے لئے بے چین تھی۔ بیوگی کے بعد کسی طرح تین سال آگرہ میں گذار کر سسرال سے چھٹکارا پانے کے لئے ہی اس نے ٹریننگ کالج میں بھرتی ہوکر اپنے میکے الٰہ آباد میں رہنے کا فیصلہ کیا۔ دو برس تک میکے میں قیام کے دوران جانے کتنی بار اس کے بے چین دل نے آواز دی۔ ایک بار میکے سے بیگانی ہوجانے پر عورت کے لئے پھر میکہ اپنا نہیں ہوسکتا' جیسے پیڑ سے ٹوٹا ہوا پھل پھر سے پیڑ میں نہیں لگ سکتا۔ اور سسرال میں اب اس کے لئے کیا تھا؟ سسرال سے اس کے تمام حقوق ختم ہوگئے تھے اگر بیل سے پھل کو ملائے رکھنے والی ٹہنی ٹوٹ جائے تو پھل کھیت میں پڑا سڑتا رہتا ہے بڑھتا نہیں۔

بیوگی کے صدمے سے تین سال تک ذہنی موت کی حالت میں رہ کر اور موت کی آرزو کرکے بھی جب وہ نہ مرسکی تو حقیقت سے ہارنے کے بجائے اس نے زندہ رہنے کی طرف دھیان دیا۔ بی ٹی کی پڑھائی اسی فیصلے کا نتیجہ تھی۔ پڑھائی ختم کرکے اسی پرانی دنیا میں' پرانے جسم میں وہ نئے جذبے کے ساتھ داخل ہوئی۔

سوناما کی دنیا پیچیدگیوں سے بھری تھی جیسے بجلی کا موٹر ساکن رہ کر بھی انتہائی سرگرم ہوتا ہے ہاں کی شکل میں فطرت اور 'نہ' کی شکل میں سنسکار بجلی کے پازیٹو اور نگٹیو تاروں کی مانند اس کے ذہن میں خیالات کے پہیئے کو بہت تیز رفتار سے گھماتے رہتے۔ جیسے بجلی کا موٹر خود ساکن رہ کر بھی اپنے اثر سے دوسری چیزوں کو رفتار دیتا ہے' ویسے ہی سوناما کا اثر اس کے چاروں طرف ہوتا۔ خواہش نہ ہونے پر بھی عزت اور تعریف کا ماحول اس کے چاروں طرف ایک کہرے کی مانند اٹھ کھڑا ہوتا لیکن پھر رسوائی کی اوس کی شکل میں جم کر ہراس اور خوف پیدا کرتا۔ یہ تضاد اس کی حقیقی زندگی میں بھی تھا۔ اس کی پرکشش خوانی سنجیدگی بن کر اس کے ہر عضو سے جھلکتی تھی۔ اس کی سادگی خوش ذوقی سے آراستہ ہو کر اور بھی خوبصورت بن جاتی۔ سیدھی مانگ کے نیچے بندیا سے خالی ماتھا اور بھی کشادہ لگتا۔ اس کی یگانگت میں متانت جھلکتی۔ اس کے حسن اور عزم واستقلال کے پیچھے اس کی بیوگی کی بدنصیبی چھپ گئی تھی۔

پرکشش شخصیت اور ذاتی تحفظ کی وجہ سے سوناما کی زندگی کا پہیہ رواں دواں تھا۔ یہ رفتار داخلی نوعیت کی تھی۔ اس لئے اس کی اپنی شخصیت ہی اس رفتار کا مرکز تھی۔ ہندو گرلز اسکول کے پرنسپل کی نوکری میں اسے اپنی خود مختار زندگی کے لئے ایک بنیاد مل گئی تھی۔

درگا پوجا کی چھٹیوں کی شروعات' آرام اور سکون کے جذبے سے ہوئی۔ کنوار بیت رہا تھا۔ چھڑی ہوئی بارش اپنے ارمان پورے کر رہی تھی۔ سرمئی گھٹاؤں سے اندھیرا چھاجاتا تھا پہر پہر کی جھڑی لگ جاتی۔ اسکول کے کمروں میں اندھیرا ہوجانے سے سوناما کو بڑی کوفت ہوتی۔ ایک عجیب سی ٹھنڈ کا احساس ہونے لگتا۔ چوماسے کی دھوپ اور حبس کی جگہ وہ ٹھنڈا سا جذبہ اس کو بھلا لگتا۔ لیکن اسکول کے چپراسی کنہائی اور مالی "بڑھنو" فکر سے آسمان کی طرف منہ اٹھا کر کہتے۔ "جانے کیا بسی ہے اس کے دل میں....؟ کھیتی سب ستیاناس ہوگئی! پراسرار غیبی طاقت کے سامنے اس شودر انسان کی یہ سپراندازی سوناما کے دل میں ہمدردی کا جذبہ پیدا کردیتی۔ اس کی اپنی زندگی بھی اسی غیبی طاقت کا کھلواڑ ہو کر رہ گئی تھی۔

لٹھ بند چوکسی کرتے چپراسیوں اور مالی کی حفاظت میں سونا مانے رات برآمدے میں گذاری۔ کچھ تاخیر سے جاگ کر، آخری تاروں کی رخصت کے وقت مسہری چھوڑ کر وہ رات کی ٹھنڈ سے سرد زمین پر اتر آئی۔ مہترانی بولو اسکول کا احاطہ تاروں کی چھاؤں میں ہی جھاڑ رہی تھی۔ زمین چھو کر بولو نے اسے سلام کیا اور دعا دی۔ سوناما کو ماسٹرنی جان کر بھی وہ اسے رانی صاحبہ کہہ کر مخاطب کرتی تھی۔ یہ اس کے ذاتی خلوص اور احترام کا اظہار تھا۔ اوس سے دبی ہوئی دھول پر جھاڑو سے لہریں بناتی بولو پیچھے کی طرف ہٹتی جا رہی تھی۔

ٹھنڈی ہوا سے سوناما کو تازگی کا احساس ہوا۔ پرندوں کی چہچہاہٹ سن کر اس کی نظر آسمان کی طرف گئی۔ آسمان صاف تھا۔ ساڑھیاں دھوئی جاسکیں گی! اور کتنی ہی ایسی باتیں اس کے ذہن میں گھوم گئیں۔

سردھو کر بھیگے بال کاندھوں پر پھیلائے جب سوناما غسل خانے سے نکلی، آسمان میں بادل گھر آئے تھے۔ ایک مایوسی کا احساس ہوا۔ نوکر چائے اور ناشتہ لا رہا ہوگا، اس انتظار میں وہ برآمدے میں ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ یوروپ کی جنگ کی وجہ سے بیبی وول بہت مشکل سے مل پائی تھی۔ بہن کے نئے بچے کے لئے اس اون کا آدھا بنا سوئیٹر سلائیوں پر اس کے ہاتھوں میں تھا۔

سامنے سے بوڑھا مالی ٹٹ کے دو تازے گلدستے دونوں ہاتھوں میں لیے آتا دکھائی دیا۔ مالی کو دیکھ کر ایک ہلکی مسکراہٹ سوناما کے چہرے پر آجاتی تھی۔ چوٹی سے ایڑی تک اس کی ہر بات میں ایک خاصیت تھی۔ بڑھاپے کے باوجود اونچا اور چوڑا قد، خوب کھلا سینہ، کھردرے بڑے بڑے ہاتھ پاؤں۔ دائیں گھٹنے میں کچھ لنگڑا پن ہونے سے وہ دھڑ کو پیچھے پھینک کر چلتا۔ چکنے سر پر کہیں کہیں سفید بال تھے۔ سر سائنسدانوں اور فلسفیوں کی طرح بڑا۔ بالکل سفید تراشی ہوئی لمبی مونچھیں، چھتری کی گولائیوں جیسی، بھوری کی طرف گھومی ہوئی۔ بات کرتے وقت جسم کو متوازن رکھنے کی کوشش میں ریڑھ کی ہڈی پیچھے جھک جاتی۔ سینہ اور تن جاتا، اس پر بار بار مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے رہنا۔ چوڑے کندھوں پر ریلوے کے پائنٹ مین کا نیلی جین کا کرتا یوں پڑا رہتا جیسے دسہرے کے راون کے بدن پر کاغذ کے کپڑے، نیچے دھوتی گھٹنوں تک کسی

ہوئی۔

مالی کا نام نہیں لیا جاتا تھا۔ مہترانی سے لے کر ہیڈ ماسٹرنی تک ہر عمر کے لوگ اسے عزت سے "بڑھئو" پکارتے تھے۔ اس عزت کی وجہ سے بڑھئو کا مزاج اور تنک ہوگیا تھا۔ جنگ کے بعد بڑھی مہنگائی کی وجہ سے دوسرے بنگلوں میں مالی پچیس تیس روپے پا رہے تھے جبکہ بڑھئو اب بھی انیس پر جمے تھے۔ ان میں سے بھی چار روپے سوناما کی سفارش سے ہوئی ترقی کا نتیجہ تھے۔ بڑھئو کی اس مہربانی کے نتیجے میں اسکول پر ان کا حق بھی کچھ کم نہ تھا۔ دن میں ایک دو بار چھوڑ کر جانے کی دھمکی دیتے۔ اگر سوناما کو اپنی طرف متوجہ پاتے تو کہتے۔ "ارے جانکار مالی کو کام کی کیا کمی ہے؟ گن فیٹری (گن فیکٹری) میں مالی چالیس پچاس روپے پا رہے ہیں۔ ہجور بی بی جی' قدموں کی بدولت یہاں پڑے ہیں۔"

اسکول کے چپراسی کنہائی اور لکھن' مہرا اور مہترانی بڑھئو کے چٹکی لینے سے باز نہیں آتے تھے۔ "بڑھئو' لام پر کاہے نہیں چلے جاتے۔ اب بوڑھے بھی بھرتی ہو رہے ہیں۔ فوج میں بوڑھوں کو دودھ بھات ملتا ہے۔

بڑھئو ہاتھ میں کھرپی سادھے تن جاتے۔ "ہم سب کا کھید دے اوب! ملا اسکول کے لئے ادمن کی کمی نہیں ہے بی بی جی کے اقبال سے!" ان کی یہ ادا فوج کو حکم دیتے کمانڈنگ آفیسر سے کم نہ ہوتی۔ سوناما یہ سنتی اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل جاتی۔ اس کے پتلے ہونٹوں پر آجاتا۔ "وان ہنڈن برگ!"

اسکول کی سیکریٹریٹ کے اکاؤنٹینٹ مسٹر بھٹناگر نے ایک دن بڑھئو کے تن کر سلام کرنے کے جواب میں مسکراہٹ دبا کر جواب دیا تھا۔ "تھینک یو' وان ہنڈن برگ!" اس کو یاد کر کے سوناما کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آجاتی۔

بڑھئو سوناما کے کمرے میں روز تازہ پھول لگا جاتے تھے۔ یہ پھول لگانا سوناما کے عہدے کی وجہ سے نہیں بلکہ بڑھئو کے اپنے حق کی وجہ سے تھا۔ اگر کوئی ٹیچر اپنے بالوں میں پھول لگانے کے لئے کسی پھول کی طرف ہاتھ بڑھاتی تو وہ بڑبڑانا شروع کردیتے مگر سوناما کے گلدان کے لئے وہ نہ جانے کہاں کہاں سے نایاب پھول لاکر حضور بی بی کے یہاں سجادیتے۔ گلدان میں پھول نہ رکھنے کی صورت میں لوٹا' گلاس جو

بھی مل جاتا وہ گلدان بن جاتا۔

بڑھئو کا پھول سجانے کا طریقہ سوناما کی پسند کی مطابق نہیں تھا۔ شروع میں ایک دو بار اس نے بڑھئو کے لگائے پھولوں کو اٹھاکر قاعدے سے لگادیا۔ گلاب ایک میں، پیٹونا دوسرے میں، لمبی لمبی ٹہنیاں دھیمی رفتار سے بل کھاتی اور پھیلی ہوئی لیکن بڑھئو نے گلدان میں سب پھول ایک ساتھ سجا دینے کے اپنے ڈھنگ میں تبدیلی ضروری نہیں سمجھی۔ ایک صبح کو ایک گلدان خالی دیکھ کر بڑھئو نے غصے میں پہاڑی نوکر تیجو کو مخاطب کیا۔ "اے! اے پھول کو اچاس رہا؟"

اس ڈانٹ سے سوناما کا دل مسکرا اٹھا۔ بڑھئو کے پیچھے کھڑے ہوکر اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر پہاڑی نوکر کو چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ پھول سوناما نے ہی ملاقات کے لئے آئے ایک شخص کے بیٹے کو تھما دیے تھے۔ تب سے وان ہنڈن برگ کے ہاتھوں سجائے ان گل دانوں میں گلاب کے ساتھ گیندا اور سورج مکھی خوبصورتی میں اضافہ کرتے رہتے۔

چودہ ماہ کی مختصر مدت میں ہی بڑھئو اور سوناما کے تعلق کو مزید مستحکم کر دینے والے متعدد واقعات پیش آئے۔ پوس کی راتیں بڑھئو ایک پرانے سوتی کمبل میں کاٹ رہے تھے۔ ان پھیلا ہوا مضبوط بدن سونٹھ کی طرح سکڑ رہا تھا۔ سوناما کی نظر بار بار اس طرف جاتی لیکن وہ کچھ کہہ نہ پاتی۔ ہمت ہمت کرکے ایک دن بولی۔ "بڑھئو اس برس جاڑا بہت ہے۔"

کا بتائی ججور ایسا جاڑا پچپن برس کی عمر میں نہیں دیکھا۔" بڑھئو نے کہا

"ایک کمبل ہے، بڑھئو بھائی اوڑھا ہوا ہے۔ ایسے ہی رکھا ہوا ہے کام آسکے تو۔۔۔ وہ چپ ہوگئی

"ارے ججور کا اوڑھے پہرے میں کیا؟" اعتراض کو نامنظور کرنے کے لئے سرہلاتے ہوئے بڑھئو نے پاؤں بدلا۔

سوناما فوراً اندر گئی اور کمبل لاکر بڑھئو کے بازو پر رکھ دیا۔ بڑھئو کچھ بول نہیں پائے۔ اور پھر تین دن بعد بڑھئو کو ایک چیتھڑے سے کان باندھے دیکھ کر اس نے ایک تولیہ بڑھئو کی طرف بڑھادیا۔

اسکول کے پچھواڑے بڑھئو کے اپنے ہاتھ سے لگائے کٹھل کے پیڑ میں پہلا پھل لگا تھا۔ بڑھئو صبح شام اور دن بھر میں تین چار بار اسے دیکھ لیتے۔ کسی کو دیکھتا پاتے تو اپنی مٹھی میں کھرپی بھینچ کر اسے خبردار کردیتے" "جو ایکا ہاتھ لگائی تو ہم اس کا ہاتھ کاٹ ڈاری!"

جھوٹا چپراسی چٹکی لیتا۔۔ "فلاں فلاں آدمی کٹھل کی طرف دیکھ رہے تھے... بھئی مزہ ہے تو نرم نرم کٹھل کھانے میں! کیوں کنہائی دادا، کٹھل میں کیا مسالہ پڑتا ہے؟

بڑھئو بوکھلا جاتے اور ہاتھ گوڑ اور سر کاٹنے کی للکار اکثر سوناما کے کان میں پڑتی رہتی۔ وہ مسکراہٹ سے ہونٹ دبا کر رہ جاتی۔

بڑھئو اکثر اس پیڑ کی نسل کا تذکرہ کرتے۔ بردوان کے اصل کٹھل کا بیج ہے۔ اس کا پھل بیس پچیس سیر سے کم نہ ہوگا۔ لیکن بڑھئو اپنی امید تک نہیں پہنچ پائے۔ ابھی پھل سیر بھی کا ہو پایا تھا کہ ایک صبح دونوں ہاتھوں میں پھل تھامے انہوں نے اسے ہجور بی بی جی کے سامنے پیش کردیا۔

سوناما نے سوچا، جانے اتنے دن بڑھئو نے کیسے صبر کیا ہوگا؟ بولی، ہائے، ابھی کاہے توڑلیا؟ بڑھنے دیتے!"

بڑھئو نے سمجھایا۔۔ "برے لوگن کا کیا ٹھکانا؟ پہلا پھل چوری نہ جانا چاہی۔ اس سے پیڑ کنیا جات ہے۔"

"بہت بڑھیا کٹھل ہے، بڑھئو۔ تم اپنے یہاں بناؤ نہ۔"

اپنا بھاری سر ہلا کر اپنے صحیح پاؤں پر دھڑ کو تول کر بڑھئو نے محبت بھرے لہجے میں جواب دیا۔ "ایسے کیسے ہوسکتا ہے، ہجور! ہم تو آپ ہی کے لئے..." اور کچھ وہ کہہ نہ پائے۔

اس شام سوناما نے خود باورچی خانے میں جاکر کٹھل پکایا اور بڑھئو کی ضیافت ہوئی۔ کٹھل کی ترکاری سب لوگوں میں بانٹی گئی۔

ملک میں اناج کا قحط پڑا۔ اس سے زیادہ بھیانک صورت حال ہوگئی کپڑے کی۔ میں لاج ڈھانکنے میں ناکام بھلے گھر کی عورتوں کی خودکشی اور اسکول کی لڑکیوں کے

امتحان کے لئے جاپانے کی خبریں اخباروں میں چھپنے لگیں۔ سوناما بھی سفید وائل کی ساڑھیوں کے لئے ترس گئی۔ گرمی اور برسات کے حبس میں بھی ریشمی ساڑھیاں نکال کر پہنتی پڑ رہی تھیں۔ ان ساڑھیوں کے پہننے میں جھجک بھی ہوتی لیکن مجبوری تھی۔ سوناما نے ساڑھیوں کی زری کی کناری چھوڑا کر جہاں تک ممکن ہوا سادہ بنالیا تھا۔

بڑھئو اخبار اور بلیک مارکیٹ کچھ نہیں جانتے تھے۔ اتنا جانتے تھے کہ سوتی ساڑی اور دھوتی کہیں نہیں ملتی۔ دھوتی میں چندی اور گانٹھ لگاتے لگاتے وہ چندی اور گانٹھ سہارنے کے لائق نہیں رہی۔ براہ راست ہجور بی بی سے تو نہیں لیکن انہیں کمرے میں موجود سمجھ کر پہاڑی نوکر تیجو اور چپراسی لکھن کو سنا کر بڑھئو بولے۔۔
"اب بی بی جی ہم کا دھوتی نہ دے ہیں تو ہم ان کی دھوتی اٹھالے بے!"
لکھن نے چھیڑا۔۔ "بڑھئو ریشمی ساڑی پہر ہو؟"

سوناما اندر چائے پی کر پان لگا رہی تھی۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ پان منھ میں رکھ کر باہر آئی۔ بولی۔۔ "بڑھئو کیا کریں، مردانی دھوتی ہے نہیں۔ جوڑے کنارے کی پہرو گے؟"

بڑھئو ہاتھ میں کھرپی سنبھالے لنگڑاتے چلے جارہے تھے۔ پلٹ کر نہیں دیکھا۔ کہتے گئے۔ "تو پھر ہم کا کری؟"

درگا پوجا کی چھٹیوں کے پہلے دن صبح کو گلدان میں پھول سجا کر بڑھئو سوناما کے سامنے آکھڑے ہوئے۔ اسکول کے نوکروں کے سامنے سوناما سر نہیں ڈھکتی تھی۔ رات دن کا ساتھ تھا۔ لیکن بڑھئو کو سامنے دیکھ کر کسی سنسکار کے تحت ساڑی کا آنچل بھیگے بالوں پر رکھ لیا۔

بڑھئو سر جھکائے کاٹھ کی سی خشک انگلیاں آپس میں رگڑتے ہوئے بولے۔
"ہجور بی بی جی، ہم ہو ویسات جاب۔ ہم ہو کا دوئی ہفتہ کی چھٹی ملے۔"
"کاہے بڑھئو کیا کروگے جاکر؟" سوناما نے صبح کے غسل کی تازگی لیے اپنی بڑی بڑی آنکھیں بڑھئو کی طرف جماویں۔

صحیح پاؤں پر زور دیتے بڑھنو نے اپنی پیلی آنکھیں چھت کی طرف اٹھا کر کہا۔ ”ہجور لکھن کہت ہیں آپ ہو الٰہ آباد جائے رہی ہیں۔ ہم کا ہیاں نیک نہیں لاگت۔“

سوناما کے دل کا خون چہرے پر چھلک آیا۔ ”نہیں بڑھنو‘ ہم کہاں جا رہے ہیں؟ ہم تو یہیں ہیں۔“

بڑھنو نے پاؤں بدلا اور اطمینان سے کہا۔۔ ”تو پھر ٹھیک ہے‘ ہجور!۔۔۔ افسر نہ رہے تو ہم کا نیک نہیں لاگت۔ گرمی کی چھٹی میں آپ ہو چلی گئی رہیں۔ ہم کا بہت اکراسا لاگت رہا۔“

سوناما کی نظر بنائی پر گہری ہو گئی۔ اس نے بات بدلی۔ ”بڑھنو‘ جاڑے کے نئے پھول نہیں لگائے؟“

سوناما الٰہ آباد اور آگرہ پیچھے چھوڑ آئی تھی مگر اس کے پیچھے لگی زندگی کی کشمکش ساتھ لے آئی تھی۔ سیکریٹری صاحب پہلے عزت سے پیش آتے تھے اور پھر اچانک برا مان گئے۔ اس نے دل میں کہا‘ ”میں کیا کروں‘ میری بلا سے۔۔۔۔!“

سیکریٹری مسٹر بھٹناگر کی ناراضگی کی وجہ سے چھپی نہیں تھی۔ انتظامیہ کمیٹی کے صدر لالہ بشن نارائن کے لڑکے کی شادی کی پارٹی میں سوناما شریک ہوئی تھی۔ سیکریٹری صاحب نے اسے اپنے یہاں ہولی کی پارٹی میں آنے کی دعوت دی تھی مگر وہ نہ جا سکی۔ تب سے دو تین بچوں کے سرپرستوں نے اسکول کے انتظام کی خرابی کی شکایتیں لکھ بھیجیں۔ پہلے سوناما جھنجلا کر رہ گئی اور پھر سمجھ گئی۔

درگا پوجا کی چھٹیوں سے پہلے ہی اتوار کی شام کو انتظامیہ کمیٹی کی میٹنگ ہوئی۔ کمیٹی میں یہ سوال اٹھایا گیا کہ پچھلے ہفتے درجہ اول اور دوم کی پڑھائی بالکل نہیں ہوئی۔ بارش کی وجہ سے بچوں کو تین دفعہ گھر واپس جانا پڑا۔

سوناما نے جواب دیا۔ ”ان کے لئے عمارت میں جگہ نہیں ہے! سب بچے کسی ایک کمرے میں نہیں بیٹھ پاتے۔ موسم صاف ہو تو بچوں کو پیڑوں کے نیچے بٹھایا جا سکتا ہے۔ بارش کے وقت کوئی ترکیب نہیں ہے ان کلاسوں میں زیادہ بچے نہ لے جائیں تو اچھا ہے۔“

کمیٹی کے دوسرے ممبروں کو مخاطب کر کے سیکریٹری صاحب بولے، "عمارت کے دو کمرے ہیڈ مسٹریس کے پاس ہیں۔ یہ کمرے کچھ مدت کے لئے دیے گئے تھے تاکہ وہ اپنے لئے مکان کا بندوبست کر لیں۔ اب تو ایک سال سے زیادہ ہو گیا ہے۔"

سوناما کے دل پر گہری چوٹ لگی۔ تلملا کر رہ گئی۔ رائے بہادر سیتارام نے کہا۔ "ٹھیک ہے، لیکن شہر میں کہیں بالشت بھر جگہ خالی نہیں۔ بچوں کی تعداد کم کرنا ٹھیک ہے۔"

اسکول کا حساب کتاب آڈیٹر سے پاس کرانا ضروری تھا۔ درگاپوجا کی چھٹیوں میں سیکریٹری صاحب نے رجسٹروں کا معائنہ کرنا شروع کیا۔ کبھی وہ رجسٹر منگاتے، کبھی خود اسکول آتے اور کبھی پرنسپل کو بلوا بھیجتے۔ بس چلتا تو سوناما انکار کر دیتی لیکن نوکر تھی۔ اس لئے مجبور تھی۔

بڑھنو جا کر رکشا لائے اور سوناما سیکریٹری صاحب کے یہاں گئی۔ واپس آئی تو سورج ڈوب چکا تھا۔ چہرہ ایسے بھربھرا رہا تھا کہ آنکھیں جھڑ پڑیں گی۔ رکشا اسکول کے احاطے میں داخل ہوا تو بڑھنو پھاٹک پر بیٹھے سرتی ملتے دکھائی دیے۔ جیسے انتظار کر رہے ہوں لیکن سوناما انہیں آواز نہ دے سکی۔

رکشا سے اتر کر وہ برآمدے میں کھڑی بٹوے میں سے ریزگاری ڈھونڈ کر کرایہ چکا رہی تھی۔ اتنے میں بڑھنو پھاٹک سے برآمدے میں آپہنچے۔ سوناما کو اب بھی نہ بولتے دیکھ کر بڑھنو بولے۔ "بڑی ابیر ہو گئی ہجور بی بی جی!"

"یہ سیکریٹری جان لے لے گا اور کیا!" جھنجھلا کر سوناما اندر جا کر پلنگ پر لیٹ گئی۔ اس کا دماغ موٹر کے آرمیچر کی طرح گھوم رہا تھا۔ لعنت ہے ایسی نوکری پر۔ آگرہ اور الٰہ آباد میں بھی اس کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔"

بڑھنو شام کا کھانا بھی صبح کو ہی پکا لیتے تھے۔ شام کے لئے پیاز کی چٹنی بنائی تھی، اسی سے روٹی کھانے کی تیاری کر رہے تھے کہ دیوار کی دوسری طرف سے کوارٹر میں کنہائی اور لکھن کی بات چیت سنائی دی۔ یوں تو بڑھنو بہت کم سن پاتے تھے۔ کم سننے سے بیسیوں جھنجھٹوں سے بچے رہتے تھے۔ مطلب کی بات یا چپکے سے کہی بات پکڑ لینے میں ان کے کان بہت تیز تھے۔

لکھن نے کہا۔ "مھتو! بڑی بی بی ابھی لوٹی ہیں سیکریٹری صاحب کے پاس سے۔ روئی ہوئی سی جان پڑتی ہیں۔"

کنہائی کے منہ میں نوالہ تھا۔ الجھے ہوئے لہجے میں اس نے جواب دیا۔ "سیکریٹری صاحب بڑے کھلاڑی ہیں۔ پیچھے پڑے ہیں۔ بی بی کے۔ پہلے تو بی بی اینٹھ جاتی تھیں۔ اب رقعہ آتا ہے تو دوڑی جاتی ہیں۔ ارے بھائی افسر ہیں' جب چاہیں گھر بلالیں' جب چاہیں یہاں آجائیں۔" کنہائی اور لکھن میں دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ بڑھئو سنتے رہے جیسے گھات لے رہے ہوں۔

بڑھئو کی تھریا کی روٹی پیٹ میں نہ جاسکی۔ بہت دیر تک ویسے ہی بیٹھے رہے۔ اور پھر روٹی اٹھاکر ایک پیڑ کی جڑ میں رکھ دی کہ دن چڑھے کوئی کتا کھالے۔

رات میں دونوں چپراسی' مہرا اور مالی باری باری پہرہ دیتے تھے۔ جس کا پہرہ ختم ہوتا دوسرے کو جگادیتا۔ بڑھئو کے پہرے کی باری چوتھے پہر کی تھی۔ اپنا پلنگ انہوں نے روز کی جگہ سے کچھ آگے برآمدے کی طرف ڈال لیا تاکہ بی بی جی کا برآمدہ دکھائی دیتا رہے۔ ساتھ میں لٹھیا لے کر لیٹے۔ رات بھر آنکھ نہیں لگی' جیسے انہیں کوئی خدشہ ہو۔ دن چڑھے پھول دینے گئے تو بی بی جی غسل خانے میں تھیں۔ دل بہت اداس تھا۔ روز کی طرح روٹی سینکی' دال بھی پکائی مگر کھا نہیں سکے۔ سوناما کے برآمدے کی طرف کئی بار نظر گئی وہ چھوٹی سی میز پر بڑے بڑے رجسٹر پھیلائے ان میں نظریں گڑھائے بیٹھی تھی۔ بہت اداس۔

چوتھے پہر سیکریٹری صاحب کی چھوٹی سی موٹر اسکول کے احاطے میں داخل ہوئی اور ہیڈ مسٹریس کے دفتر کے سامنے رکی۔ کنہائی سرپر ٹوپی سنبھالتا ہوا دوڑا آیا۔

"ہیڈ مسٹریس کو دفتر میں بلاؤ۔" سیکریٹری صاحب نے حکم دیا۔

پیغام پاکر سوناما نے ساڑی بدلی' بالوں کو کنگھا کیا' کنہائی سے رجسٹر اٹھواکر دفتر کے طرف چلی۔ بغل کے برآمدے سے سامنے کی طرف گھومتے ہوئے اس کے قدم نہ اٹھ سکے۔

سیکریٹری صاحب کے سامنے' کندھے پر پہرہ دینے کی لمبی لاٹھی لیے بڑھئو اپنے صحیح پاؤں پر اچک رہے تھے۔ دائیں ہاتھ کی انگلی دکھاکر وہ للکار رہے تھے۔ "مسٹری

اٹری سب چور کردے اب۔ ای ہاتا میں قدم نہ رکھیو' سب افسری جھاڑ دیب۰۰۰۰!"

سیکریٹری صاحب کا چہرہ بالکل سفید تھا۔ آنکھیں خوف اور حیرت سے پھیل رہی تھیں سوناما کو خود کاٹھ مار گیا۔ کنھائی فورا آگے بڑھا۔ مٹناگر صاحب کی آڑ لے کر بڑھو کے ہاتھ سے لاٹھی لے لی لکھن اور مہرا بھی تماشا دیکھنے پہنچ گئے۔

مصیبت سے راحت پاکر سوناما نے ایک لمبی سانس لی اور بڑی مشکل سے کہہ پائی۔۔ "کیا بات ہے؟"

بڑھو بانہیں پھینکتے' بکتے' لنگڑاتے' اچکتے اپنی کوٹھری کی طرف چل دیے۔ بے خوف ہوکر سیکریٹری صاحب نے سوناما کو انگریزی میں مخاطب کیا۔ "کیا یہ آدمی پاگل ہوگیا ہے۔ پہلے بھی کبھی ایسا برتاؤ کیا ہے؟"

"نہیں تو! کبھی دیکھا نہیں۰۰۰۰ کسی نے کہا بھی نہیں۔ سنجیدہ اور ذمہ دار آدمی ہے۔"

سکریٹری صاحب پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالے اپنے جوتے کی نوک کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ۔ ۔ "ہو سکتا ہے۰۰۰ لیکن خطرناک تو بہت ہے۔ لڑکیوں اور بچوں کا معاملہ ہے۔ آپ اسے فورا ڈسمس کرکے احاطے سے باہر نکلوا دیجئے۔" انہوں نے کنہائی کی طرف دیکھا' "سنا؟"

اپنی بات چپراسیوں اور ہرے کو سمجھانے کے لئے ۔مٹناگر صاحب نے ہندی میں دہرایا۔ "خطرے کو رکھنا ٹھیک نہیں۔ ابھی نکال دیجئے۔ ضرورت ہو تو تھانے میں رپورٹ کرکے پولیس بلوالیجئے۔ میں بھی تھانے میں فون کردوں گا۔" رجسٹر دیکھنے کی اب ان میں ہمت نہیں تھی۔ وہ فوراً ہی واپس لوٹ گئے۔

سوناما کے پیر کانپ رہے تھے۔ دفتر میں جاکر کرسی پر بیٹھ گئی۔ کہنیاں میز پر ٹکی ہوئی تھیں اور ہتھیلی پر ٹھوڑی۔ دونوں چپراسی حکم کا انتظار کررہے تھے۔ سوناما کا رواں رواں کانپ رہا تھا منہ سے کچھ بولنا ممکن نہیں تھا۔ پچیس منٹ گذر گئے۔

کنہائی بولا۔ "حضور کیا حکم ہے؟"

سوناما فیصلہ نہیں کرپائی۔ وہ مالی کو نکال دے یا خود چلی جائے۔ اس کشمکش میں اس کا ذہن کہیں دور گھوم آیا۔ کہیں دور' ہرے بھرے آزاد دیہات میں وہ اور

بوڑھو.... ؟ بڑھو کھیت سنبھالنے جائے اور وہ کھانا پکار کر انتظار کرے۔

کنہائی کے دوبارہ ٹوکنے پر سوناما نے اپنی کمزوری جھنجلاہٹ میں چھپائی۔۔ "کیا ہے؟"

"حضور مائی کے واسطے... سیکریٹری صاحب کہیں..."

سوناما ہل نہ سکی۔ ایسا لگا جیسے سر پھٹا جارہا ہو۔ نہ جانے کتنے منٹ بیت گئے۔ چپراسی اور مہرا کھڑے رہے۔ تھک کر کئی بار انہوں نے پاؤں بدلے، جماہی لی۔ سوناما کی سوچ کا سلسلہ نہ ٹوٹا۔ کنہائی نے پھر ٹوکا۔۔ "حضور!"

سردرد سے سوناما کی آنکھیں بالکل لال ہوگئی تھیں۔ پوری طرح سے اپنے کو سنبھالتے ہوئے اس نے سخت لہجے میں جواب دیا۔۔ "کیوں بار بار سر کھاتے ہو؟ کہہ تو دیا ایک بار! جاؤ نکال دو!"

"حضور اس کی تنخواہ...." کنہائی نے ہمت کی۔

جھٹکے سے میز کی دراز کھول کر سوناما نے دس دس کے دو نوٹ نکال کر فرش پر پھینک دیے اور سب کو ڈانٹا۔ "جاؤ یہاں سے!"

سر آنچل سے ڈھک کر اس نے میز سے ٹکادیا۔ نہ معلوم کتنا وقت گذر گیا۔ ویسی ہی بے ہوشی جیسے بیوہ ہونے کے بعد پہلے جھٹکے کی شکل میں اس پر چھائی تھی۔ پھر سنائی دیا۔ "حضور مائی نمستے کرنے کو کھڑے ہیں۔" کچھ ٹھیک سے سمجھ میں نہیں آیا' اور آنسو سے بھیگے آنچل سے سر اٹھانا بھی ممکن نہیں تھا۔ اندر دبی آگ بھڑک اٹھی۔ "جاؤ یہاں سے۔"

کچھ منٹ بعد سوناما سنبھلی۔ آنسوؤں کے طوفان نے اسے بے بس سا کردیا تھا۔ آنسوؤں کو روکنا ممکن نہیں تھا اور آنسوؤں بھرا چہرہ اسکول کے نوکروں کو دکھانا ٹھیک نہیں تھا مگر بڑھو جارہے تھے۔

وہ رہ نہ سکی۔ سر اٹھاکر کھڑکی سے جھانکا۔ آنسو بھری پلکوں میں سے دکھائی دیا۔ وہی نیلا کرتا پہنے، بغل میں ہلکا پھلکا بچکا دبائے، لاٹھی ٹیکتے، لنگڑاتے بڑھو پھاٹک سے نکل رہے تھے۔ سوناما کا دل چاہا کہ چیخ پڑے۔ بڑھو رک جاؤ!"

لیکن پرنسپل کے وقار نے ہونٹ نہ کھلنے دیے۔ اس کے دل نے آہ بھری۔

”وان ہنڈن برگ!“ اور آنسو بھری پلکوں کے سامنے لنگڑے بڈھے وان ہنڈن برگ سے زیادہ پروقار دکھائی دیے۔ وہ سوناما کے دل کی کتنی عزت لیے چلے جا رہے تھے۔

سچ کی قیمت

کوشم کے قریب جمنا کے مشرقی کنارے پر دناک کے آباؤاجداد کی زمین تھی۔ زمین خاندان کی پرورش کے لئے بہت تھی۔ ہل، بیلوں کی جوڑی، دو گائیں اور محنت سے زمین میں سے اناج پیدا کرنے کی تمام سہولیات تھیں۔ زمین کی پیداوار کا پانچواں حصہ زمین ٹیکس کی شکل میں جیشٹھک کو دے کر اس کا اور اس کے بیوی بچوں کا گذارا دوسرے کسانوں کی طرح ہو جاتا تھا لیکن وہ مطمئن نہیں تھا۔

دناک کے دل میں تشنگی تھی۔ زندگی میں سب سے زیادہ آرام کا سامان حاصل کر کے مزید دولت مند اور خوش حال بننے کا خواب اس کے دل و دماغ پر چھایا رہتا۔ پیسہ جمع کر کے اور زیادہ زمین خرید کر دوسروں سے کھیتی کرانے والا زمین دار بننا چاہتا تھا۔ مٹی کی دیواروں پر پھوس سے چھائے اپنے چھپر کی جگہ وہ ایک پکا مکان بنانے کا خواہش مند تھا۔ اپنے گاؤں کے جلاہے کے ہاتھ کے بنے موٹے کپڑے کی جگہ وہ مگدھ، ودیشہ اور کلنگ کا ریشمی لباس پہننے کا خواہش مند تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ نوکرانیاں اس کے جسم پر صندل کا لیپ کر کے سنگھل کے موتیوں کی ٹھنڈی مالائیں اس کے گلے میں پہنائیں، صندل کے پنکھے سے ہوا کریں۔ اس کے بالوں میں مختلف موسموں کے مطابق خوشبو لگائی جائے سواری کے لئے رتھ ہو جو خوبصورت رنگین پردوں سے ڈھکا ہو۔ رتھ کے خوبصورت بیلوں کے سینگ تیل جیسے چکنے اور کالے ہوں۔ بیلوں کی پیٹھ پر کامدار جھولیں پڑی ہوں۔ خوشحالی اور دولت کا تمام سامان جو اس نے ودیشہ نگری میں اپنا اناج بیچنے کے لئے جانے پر دیکھا تھا اور جنہیں پورب کی طرف جانے والے شاہی راستوں پر وزیروں وغیرہ کے پاس دیکھا تھا، اس کی دلی تمنا بن کر اس کے ذہن میں سما گئے تھے۔

اس سامان کو حاصل کرنے کے لئے دناک گرمی، برسات، سردی غرضیکہ تمام

موسموں میں سورج نکلنے سے سورج ڈوبنے تک مسلسل محنت کرتا رہتا۔ جسم کی تکلیف امید کی امنگ میں محسوس نہ ہوتی۔ دولت بڑھانے کے لئے وہ کچھ پیسہ جمع کرپاتا کہ بدقسمتی سے برسات کے موسم میں اوپر تک بھری گنگا میں سینکڑوں میل دور ہونے والی بارش کا پانی بہہ کر آجاتا۔ گنگا اپنے کناروں کو پار کرجاتی۔ سیلاب میں دناک کے چھپر چھاجن بہہ جاتے۔ کبھی وقت پر بارش نہ ہونے پر اس کی فصل اس طرح سوکھ جاتی کہ اس کی پیداوار کھیت میں ڈالے گئے بیج سے بھی کم ہوتی۔ ایسی حالت میں دناک بہت مایوس ہوجاتا لیکن اس کے جسم میں جانے والی ہر سانس باہر آتے وقت غیر محسوس طور پر اس مایوسی کا کچھ حصہ باہر آتی اور جینے کی امنگ پھر جاگ جاتی۔ اسی کشمکش میں دناک ادھیڑ عمر کو پہنچ گیا اور اس کی امیدیں اور خواہش ناکام ہی رہیں۔

جوانی میں سکھ اور پیسہ حاصل کرنے کی تمام کوششیں ناکام ہوجانے کے باوجود، دناک نے ادھیڑ عمر ہوجانے پر بھی کوشش جاری رکھی۔ اسے امید تھی کہ جو کچھ وہ حاصل نہیں کرسکا، وہ اس کی اولاد پائے گی اور بڑھاپے میں وہ اپنے آخری دن آرام سے گذارے گا۔ لیکن اسی دوران تمام دیہات، اضلاع اور صوبوں میں یہ خبر پھیل گئی کہ چکرورتی دگ وجے سمراٹ شری ہرش وردھن تمام دنیا فتح کرنے کے بعد بھگوان بدھ کے رحم اور قربانی کے جذبے سے معمور مذہب میں شامل ہوکر، بھکشو کا بھیس اپنانے جارہے ہیں۔

اس عجیب سی خبر سے دناک کے منصوبے منتشر ہوگئے۔ اپنے کھیتوں میں ہل چلاتے وقت، نرائی کرتے وقت، جنگل سے ایندھن لاتے وقت اور رات میں تھک کر پوال کی چٹائی پر بچھی کتھری پر لیٹے ہوئے اسے گھوڑے، پالکیوں اور رتھوں سے گھرے، بڑے ہاتھی پر بیٹھے چمچماتے جواہرات سے مزین تاج پہنے سمراٹ ہرش وردھن دکھائی دینے لگتے۔ جن کے پاس دولت، طاقت اور خوشحالی کے سامان کی کوئی کمی نہیں، جنہیں محض خواہش ظاہر کرنے پر ہی سب کچھ مل جاتا، وہی مہاراجہ اپنی مرضی سے سب کچھ چھوڑ کر بھکشو کے کپڑے پہننے کے لئے بھگوان بدھ کے دھرم میں شامل ہوں گے اور دناک کو تصور میں بھکشو کے گیروے کپڑے پہنے، ہاتھ میں لوہے کا بھیک کا پیالہ لیے سرمنڈے بھکشو کا پرسکون اور خوشی سے بھرپور چہرہ دکھائی دینے لگتا۔

سمراٹ شری ہرش وردھن کی عقیدت بھگوان بدھ کے دھرم میں ہوجانے کی وجہ سے بھگوان کے چیلوں کی بہت حوصلہ افزائی ہوئی۔ روزانہ ہزاروں بھکشوؤں کی خاطر تواضع شاہی خزانے سے کی جاتی۔ حکومت کی دولت ہزاروں بودھ بھکشوؤں سے بھرے مٹھوں کے لئے بہنے لگی اور سمراٹ کی فراخ دلی کی خبریں سن کر دنیا کے کونے کونے سے گیروا لباس زیب تن کیے بھکشو بھاری تعداد میں سمراٹ ہرش وردھن کی راجدھانی کی طرف آنے لگے۔

ان تارک الدنیا بھکشوؤں کے نزدیک پھولوں کے باغوں سے بھرے محل اور پلی گاؤں میں گوبر اور کھاد سے گھرے پھوس کے چھپر میں کوئی فرق نہ تھا۔ یہ بھکشو اپنے اپدیش' آسمان سے برسنے والے پانی کی مانند تمام انسانوں پر برابر برابر برساتے تھے۔ ان کے پر سکون اور کشادہ چہرے پر دکھ سے مکتی اور بیراگ سے حاصل شدہ اطمینان بسیرا کرتے تھے۔ وہ اپنی خوشی سب کو بانٹنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ وہ اپدیش دیتے:

> ہے سنسار کے دکھی لوگو! راگ کی طرح جلانے والی دوسری آگ نہیں۔ نفرت کی طرح آلودہ کرنے والا کوئی میل نہیں۔ پانچ سکندھوں کی طرح کوئی دکھ نہیں۔ شانتی سے بڑھ کر کوئی سکھ نہیں۔ اے انسانو! بھوک سب سے بڑا روگ ہے' دنیا ایک بڑا دکھ ہے' یہ جاننے والا نروان کا سکھ پاتا ہے۔ سو سکھ وت! جیوام نیس نرتیہ' ہم لوگوں کے پاس کچھ نہیں اور ہم کیسے خوشی سے جیتے ہیں۔ ہم آبھاسور دیوتاؤں کی طرح پریتی کا بھوجن کرتے ہیں۔ اے کسانو! کھیت کا دوش 'ترن' ہے ویسے ہی انسان کا دوش اچھا ہے۔ یہ جسم فانی ہے۔ یہ سنسار فانی ہے۔ مایا کو چھوڑو' گیان حاصل کرو! بودھی ورکش کے نیچے تتھاگت نے یہ گیان حاصل کیا ہے۔ دکھوں سے بچنے کے لئے بدھ کی پناہ میں آؤ! دھرم کی پناہ میں آؤ! سنگھ کی پناہ میں آؤ!'

خوشی سے چمکتے چہرے اور پر سکون دل ودماغ والے بھکشوؤں کو دیکھ کر اور ان کا اپدیش سن کر دناک کو انتہائی شرمندگی ہوئی۔ اسے پچھتاوا ہوا کہ تمام زندگی سکھ کی

آرزو میں دکھ کے راستے پر چلتا رہا۔ بھکشوؤں کے اپدیش سے وہ لامحدود سکھ کے حصول کے بارے میں سوچنے لگا۔ ایسے سکھ کو پانے کی ترکیب جس کے مقابلے میں چکرورتی مہاراجہ ہرش وردھن کی بے پناہ دولت اور طاقت بھی کچھ نہیں تھی۔ بھکشوؤں کے منھ سے سنی تتھاگت کی زندگی کی کہانیوں اور اپدیش کو دل میں بار بار یاد کرنے سے دناک کے تصور میں ہمیشہ ہی بودھی ورکش کے سایے میں سمادھی میں مگن، نور سے معمور بودھی ستو کا روپ دکھائی دیتا رہتا۔

جس سکھ کو دناک تمام زندگی کی کوشش سے نہ پا سکا۔ اس سے بھی بڑے سکھ کو محض جان لینے کی کوشش سے ہی اس کا حوصلہ بلند ہو گیا۔ اس گیان کو دوسرے کے منہ سے اور دلائل سے حاصل کرنے کے بجائے اس نے اپنے آپ ہی تپسیا کرنے کا فیصلہ کیا۔ بیراگ کی طرف جھکاؤ اور گیان کی پیاس سے دناک اپنی زمین اور خاندان کی فکر کا بوجھ اپنے نوعمر بیٹوں اور اپنی ادھیڑ بیوی پر چھوڑ کر تپسیا کے ذریعہ گیان کے بے کراں سکھ کی تلاش میں نکل پڑا۔

گنگا کے ویران کنارے پر تنہائی دیکھ کر ایک گولر کے پیڑ کے نیچے اس نے سمادھی لگائی۔ اس نے فیصلہ کیا، اس پرم گیان کے ذریعہ حاصل کیے گئے سکھ اور نروان میں ہی اس کی سمادھی بدل جائے گی۔

سنسان گنگا کنارے پر سورج غروب ہو گیا۔ گولر کے پیڑ پر گھوسلہ بنائے سینکڑوں پرندوں کی چہچہاہٹ سے کچھ دیر کے لئے وہ جگہ گونجنے لگی۔ چاروں طرف پھیلے پت سر کے جنگل کی ہوا، سورج کی کرنوں سے ملی گرمی کھو کر ٹھنڈی ہو گئی۔ گھنے اندھیرے میں متعدد جانور گنگا کا پانی پی کر گولر کے نیچے گرے پھل کھانے کے لئے گھومنے لگے مگر دناک پدم آسن سے بیٹھا مسلسل دھیان میں لگا رہا۔ سچ کیا ہے؟ پرم سکھ کیا ہے؟ اور دکھوں سے مکتی کیسے ہو؟ پھر سورج نکلنے سے پہلے پیڑوں پر پرندوں کا شور سنائی دینے لگا۔ سورج کی نرم کرنوں نے سختی اختیار کی۔ دوپہر ہوئی اور پھر سورج پچھم کی طرف ڈھلنے لگا۔ سمادھی میں مگن دناک تبدیلی کے اس چکر میں مکتی کو کھوج رہا تھا۔

اس طرح سولہ سورج نکلے اور سترہ ڈوبے مگر دناک ثابت قدمی کے ساتھ سمادھی میں مگن گیان کی روشنی کے حصول میں لگا رہا۔ جسمانی تکلیفوں کا احساس اتنا

سے زیادہ بڑھا لیکن پھر معدوم ہونے لگا۔ وناک نے سکون محسوس کیا۔ وہ دکھوں سے نہ ڈر کر دکھ کے احساس سے مکتی حاصل کر رہا تھا۔ وہ مسلسل دھیان میں مگن تھا لیکن اس کا دھیان اور سوچنے کی طاقت بے کار سی ہوتی جارہی تھی۔ وہ بے سدھ ہوتا جارہا تھا۔۔۔

سدھ آنے پر اس نے دیکھا۔ اس کے پاؤں سمادھی کے آسن میں بندھے رہنے پر بھی پیٹھ پیڑ کے تنے سے لگ گئی ہے اور ویسے ہی اس کا سر بھی۔ گیان کی روشنی ابھی یہ نہیں دیکھ پائی تھی۔ اپنی ناکامی سے اسے بہت دکھ ہوا۔ اس کے دل نے اعتراف کیا کہ وہ بچار اور دھیان میں ناکام ہوگیا ہے۔ لیکن بچار' دھیان اور تپیا کے ذریعہ گیان کے حصول کے لئے اس کا عزم اور بھی مضبوط ہوگیا تھا۔ اس نے دل کو سمجھایا۔۔ بچار اور دھیان کے لئے طاقت حاصل کرنا ضروری ہے جسم کے بے جان اور کمزور ہوجانے پر وہ بچار اور دھیان کیسے کرے گا؟

خود بخود اس کے ہاتھ پھیل گئے اور جسم کو طاقت دینے کے لئے وہ زمین پر گرے گولر کے پھل اٹھا کر چوسنے لگا۔ بہت دیر تک ایسا کرنے پر اسے لگا کہ اب اس میں بچار کرنے کی طاقت آگئی ہے۔ اسے احساس ہوا کہ ڈراگرہ سے اپنی طاقت کو برباد کرنا بے کار ہے۔ جو ہے اسے ٹھکرا کر ذہن سے کچھ نئی بات نکالنے کا دراگرہ بھی بیکار ہے۔ دکھ سے ڈر ہی دکھ ہے۔ بہت دیر تک گولر کے پھولوں کا رس چوستے ہوئے وہ اسی طرح کے خیالات میں ڈوبا رہا اور پھر بے کار تکلیف برداشت کرکے حقیقت کو بے حقیقت مان لینے کا خیال چھوڑ کر چل دیا۔

وناک نے دیکھا کہ روزانہ' دن اور رات میں گنگا کے سینے پر سیکڑوں کشتیاں گنگا جمنا کے سنگم کی طرف چلی جارہی ہیں۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ شاہی راستے پر بھی ہر گاؤں' ضلع اور شہر سے مسافروں کے جھنڈ آکر ندیوں کے سنگم کی طرف جانے والے انسانوں کے بہاؤ میں شامل ہورہے ہیں۔ اس نے تجسس کے تحت اس سلسلے میں مسافروں سے سوال کیا۔ جواب میں مسافروں نے بھی حیرت سے پوچھا۔ "کیا تم نہیں جانتے' چکرورتی سمراٹ شری ہرش وردھن نے گنگا جمنا کے سنگم پر 'مہینہ پرو' کا آیوجن

کیا ہے۔ اس ست سنگ میں دھرم کے تتوؤں کا فیصلہ ہوگا اور اس موقع پر سمراٹ اپنی بے پناہ دولت بھکشوؤں کو دان کریں گے۔ اس دان کے بعد زمین پر کوئی سوالی نہیں رہ جائے گا۔

دناک بھی رتھوں، پالکیوں اور دوسری سواریوں سے بھرے راج مارگ پر ہزاروں امیرو کبیر گرہستیوں، گیروا لباس زیب تن کیے بھکشوؤں اور پیسے کے آرزومند عام غریب لوگوں کے ساتھ سنگم کی طرف چل دیا۔

دناک نے دیکھا۔ گنگا جمنا کے سنگم کے جنوبی کنارے کی ریت پر انسان ہی انسان پھیلے ہوئے ہیں۔ تمام دنیا سے طرح طرح کے رنگ وروپ اور دھرم کے لوگ دھرم کے تتو جاننے کے لئے بے چین ہوکر سنگم پر آگئے تھے۔ دیس پردیس کے تاجر بھی طرح طرح کے پرکشش سامان سے دکانیں سجائے، دنیا سے بے زار لوگوں کو دنیا کی طرف کھینچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ تقریب کے مرکزی مقام پر ایک وسیع وعریض پنڈال لگا تھا جس میں دس ہزار بھکشوؤں کے ایک ساتھ مل کر بودھ سوتروں کا پاٹھ کرنے کی آواز سے آسمان آٹھوں پہر گونجتا رہتا تھا۔

اس موقع پر جگہ جگہ تتھاگت بودھی ستو کی زندگی کی تصویریں لگائی گئی تھیں۔ ان کے اپدیشوں کا پرچار ہورہا تھا۔ جگہ جگہ پر بودھ دھرم کے اصولوں، ضابطوں، اور جذبہ رحم اور انسان دوستی کے دھرم کو ماننے کا شاہی حکم بہت بڑے بڑے پتھروں پر سمراٹ شری ہرش وردھن کی مہر کے ساتھ کندہ کیا گیا تھا۔ پنڈال کے کناروں پر نقاروں کی چوٹ سے مسلسل اعلان ہو رہا تھا۔۔ چکرورتی سمراٹ ہرش کے ذریعہ اپنائے گئے بودھ دھرم کے اپدیش کے ہنسایان مسلک سے متعلق اگر کسی شخص کو کوئی شک وشبہ ہو تو وہ عظیم عالم اور چینی مہمان راج گرو آرہت اِتسنگ سے بحث کرے۔ بحث میں جیتنے والے کو سمراٹ کی طرف سے پنڈال میں بنا سونے کی مہروں کا پہاڑ اور بے شمار قیمتی جواہرات تحفے میں دیے جائیں گے اور ہارنے والے کا سر، دھرم کی مخالفت کرنے کے جرم میں کرپان سے کاٹ دیا جائے گا۔ شاہی حکم سے دھرم کی برائی کرنے والوں کا خاتمہ ہونے کے بعد دھرم کی فتح ہورہی تھی۔

دناک بھی پنڈال میں گیا۔ پنڈال کا تین چوتھائی حصہ گیروا رنگ کا لباس پہنے

بھکشوؤں سے بھرا ہوا تھا۔ استرے سے منڈے بھکشوؤں کے سر ایسے دکھائی دیتے تھے جیسے گیروا مٹی پر کوری ہانڈیاں دور تک اوندھا کر رکھ دی گئی ہوں۔ ایک چوتھائی حصے میں مختلف طرح کے خوبصورت اور نرم مسندوں پر رنگین ریشمی لباسوں اور زیورات سے سنگار کیے' سامنت طبقہ اور مالدار شریشٹھی سماج بیٹھا تھا۔ ان کے پیچھے عوام الناس کے حلقے میں اونچے منچ پر سونے کی چھتری کی نیچے' سونے کے تخت پر' چنور دھاری یوگی اور تلواروں سے لیس محافظوں سے گھرے سمراٹ گیان کی تلاش میں سنجیدہ چہرہ لیے بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے سونے کی چوکی پر کشاسن بچھائے چین کے رہنے والے راج گورو موجود تھے۔ ایک طرف سونے کی مہروں کا پہاڑ اور جواہرات کے تھال سجے تھے۔ دوسری طرف لال کپڑوں میں کندھے پر لمبی کرپان لیے جلاد موت کی سزا دینے کے لئے کھڑا تھا۔

بودھ بھکشوؤں نے سوتر پاٹھ کیا اور راج گورو نے عجیب سے لہجے میں دھرم کا اپدیش دیا۔ "اسار کو سار اور سار کو اسار سمجھنے والے' جھوٹے خیالات میں الجھے ہوئے انسان سار کو نہیں پا سکتے۔ انسان جیسے بلبلے کو دیکھتا ہے' جیسے ریگستان میں پانی کے بھرم کو جھوٹ سمجھتا ہے ویسے ہی جو انسان اس مایا سے بھرے سنسار کو پہچانتا ہے' وہی امر ہوتا ہے۔"

پھر نقارے کی چوٹ پر بحث کی لئے چنوتی دی گئی۔

سامنت اور مالدار طبقہ کے پیچھے سے اونچی مگر کانپتی ہوئی آواز سنائی دی اور لوگوں نے دیکھا' ایک دیہاتی ہاتھ اٹھا کر کچھ کہہ رہا تھا۔

مسلح راج سیوک جو منتظمین میں شامل تھے' اس دیہاتی دناک کو شاہی تخت کے قریب لے آئے۔ اس دیہاتی کے پاگل پن سے تمام بھیڑ حیران رہ گئی۔

اس تقریب کے صدر راج منتری نے اس سے سوال کیا۔ "تم راج گورو سے دھرم کے سلسلے میں بحث کرو گے یا اپنا شبہ ظاہر کرو گے؟

دناک نے سر جھکا کر حامی بھری۔

"بحث میں ہار کا مطلب موت ہے' جانتے ہو؟" وزیر نے تنبیہہ کی۔ دناک نے دوبارہ حامی بھری۔

راج گورو کے قریب بیٹھے ایک شاگرد نے راج گورو کی طرف سے ان سے سوال کیا۔

"اے انسان، تم کس مت کے ماننے والے ہو، تمہاری پر کھیا کیا ہے؟"

دناک آنکھیں اور ہونٹ پھیلائے چپ رہا۔ دیہاتی کے اس انداز سے بھکشو سماج میں اس کی معصوم ضد کے لئے نفرت سے بھری مسکراہٹ پھیل گئی۔ شہریوں میں سے کچھ لوگ مسکرا دیے، کچھ لوگوں کی آنکھیں سے خوف جھلک رہا تھا۔

دیہاتی کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے راج گورو نے مسکرا کر سوال کیا۔

"اے سومیہ، تمہیں کس بات پر شبہ ہے؟"

ہمت کر کے دناک نے جواب دیا۔ "آپ جو کہتے ہیں وہ سچ نہیں۔ یہ سنسار جھوٹ اور مایا نہیں ہے۔"

راج گورو کے شاگرد نے پھر سوال کیا، "تمہارے شبہ کی بنیاد کیا ہے؟"

دناک کو خاموش دیکھ کر راج گورو نے دوبارہ مسکرا کر اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا، "تمہارا تجربہ، مت اور کہنا کیا ہے؟"

"ایسا میں نے دیکھا ہے۔"

تمام افراد اس عجیب وغریب صورت حال سے حیران تھے اور سمراٹ اپنے تخت کی پیٹھ سے سہارا لیے بائیں ہاتھ کی بند مٹھی پر ٹھوڑی رکھے اتنی سی بات کہنے کے لئے موت کا خوف نہ رکھنے والے اس شخص کی طرف نظر کیے ہوئے اس کا مطلب جاننے کی کوشش کر رہے تھے۔

اس تقریب کے صدر راج منتری نے سمراٹ کی طرف دیکھا اور اس دیہاتی کو مخاطب کیا، "تم جانتے ہو راج گورو سے بحث میں ہارنے والے کو موت کی سزا ملتی ہے تمہیں یہ سزا ملے گی۔"

"لیکن میں ہارا نہیں ہوں!" دناک نے جواب دیا۔ ہر طرف پھر ایک عجیب سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

راج گرو کے شاگرد نے پھر کہا، "اگر تم ہارے نہیں ہو تو اپنی بات کا ثبوت دو۔"

"اگر میرا اگیان راج گورو کی فتح ہے تو" دناک نے سونے اور جواہرات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس مایا کو حقیقت تصور کرنا ہی ان کے اپدیش کی ہار ہے۔ اگر راج گورو کا اپدیش سچ ہے تو وہ یہ مایا سے بھرے اسار مجھے دے دیں اور اسار (فانی زندگی) سے مکتی کی طرف خود جائیں۔" دناک نے لال کپڑے پہنے جلاد کی طرف اشارہ کیا۔ سبھا میں پہلے خوف کا سناٹا اور پھر تجسس سے بھرا طنز پھیل گیا۔ راج گورو بھی مسکرا دیے۔

تقریب کے صدر راج منتری نے سمراٹ کے سامنے سر جھکا درخواست کی' "زمین پر انصاف کے محافظ' چکرورتی سمراٹ شری دیو انصاف کے تخت سے اجازت دیں۔"

سمراٹ نے جیسے خیالات کی نیند سے جاگ کر جواب دیا۔ "اس سلسلے میں دوبارہ بچار ہوگا۔ اس وقت محفل برخاست کی جائے۔

ہار کے لئے سزائے موت کی تنبیہ کو نظر انداز کرنے کی جرات کرنے والے اس جاہل دیہاتی کی بات چیت کی خبر رات بھر میں تمام لوگوں میں پھیل گئی۔ دوسرے سمراٹ کی دھرم سبھا میں عوام ٹوٹ پڑے۔ سمراٹ کے تخت پر بیٹھنے پر لوہے کی زنجیر سے بندھے دناک کو سمراٹ کے سامنے پیش کیا گیا۔ دناک کے چہرے پر بے خوفی تھی' سکون تھا۔

سمراٹ رات بھر اس کے بارے میں سوچتے رہے تھے۔ راج منتریوں اور راج گورو سے خطاب کرتے ہوئے سمراٹ بولے' "ملزم نے بحث میں ہار نہیں پائی کیونکہ وہ شاستر نہیں جانتا۔"

راج گورو نے مسکرا کر سمراٹ کو مخاطب کیا' "دیو کا کہنا بالکل صحیح ہے۔ شری دیو انصاف کا جیتا جاگتا روپ ہیں۔ شری دیو کی رحم دلی بے کراں ہے۔ رات بھر اس آدمی نے اپنے سر پر تلوار لٹکتی محسوس کی ہے۔ اس کے معاوضے میں ایک لاکھ مہریں دان کرنے کی مہربانی کریں۔

راج گورو کی فراخ دلی پر عوام حیران رہ گئے۔ سمراٹ رحم دلی سے مسکرا دیے۔ سب طرف سے "سادھو راج گورو کی جے ہو!" کی آوازیں اٹھنے لگیں۔

اس تقریب کے صدر راج منتری کے اشارے پر پہرے داروں نے دناک کو لوہے کی بیڑیوں سے آزاد کردیا۔ خزانچی نے آگے بڑھ کر ایک لاکھ سونے کی مہریں سمراٹ کے سامنے رکھ دیں اور دناک کو مخاطب کرکے کہا۔۔ "اے خوش قسمت انسان، راج دان قبول کرنے کے لئے آگے بڑھو۔"

اپنی ہی جگہ پر کھڑے رہ کر دناک نے ہاتھ جوڑ کر اور سر جھکا کر نرم لہجے میں کہا، "زمین کو پالنے والے دھرم راج سمراٹ معاف کریں، سچ کی قیمت میری جان ہے، ایک لاکھ مہریں نہیں۔"

سمراٹ نے حیرت سے راج گورو کی طرف دیکھا۔ راج گورو کا سوچ میں ڈوبا ہوا چہرہ انتہائی سنجیدہ ہوگیا تھا۔

ساگ

ضلع جیل کی پھانسی کوٹھریوں میں بشیشر پرساد اور رحمان خاں بند تھے۔ جیسے لوہے کے پنجروں میں سرکس کے شیر اور چیتے کو لوگ حیرانی اور تجسس سے دیکھتے ہیں، ویسے ہی بڑے بڑے انگریز سول سرجن صاحب، بغاوت کے بعد ضلع کا انتظام سدھارنے کے لئے آئے انگریز کلکٹر صاحب پھانسی کی کوٹھریوں کے جنگلے کے سامنے کھڑے ہو کر ان قیدیوں کو دیکھتے تھے لیکن ان بڑے افسروں کے چہروں پر سرکس دیکھنے والوں کا تجسس نہیں بلکہ نفرت ہوتی تھی۔

جب یہ دونوں قیدی جیل میں آئے، ان کے بدن پر گولیوں کے زخم تھے۔ انگریز سول سرجن نے فرض پورا کرنے کے لئے چیڑ پھاڑ کر بشیشر پرساد کے گھٹنے سے اور رحمان خاں کی کمر سے گولی نکالی اور ان کی دوا دارو کی۔ اس فرض کو پورا کرتے وقت صاحب کا چہرہ نفرت سے چھوارے کی مانند سکڑ جاتا تھا۔

اپنے چاروں طرف ادب سے سہمے کھڑے ہوئے اپنے ہندوستانی مصاحبوں، جیلر، جیل کے ڈاکٹر، کمپاؤنڈر، جیل کے بابو اور وارڈروں کو سنا کر صاحب ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی زبان میں یہ کہنا نہ بھولتے۔ "ان بدمعاش لوگوں نے صاحب لوگ کو بنگلے میں جلا کر مارا ہے۔"

گولیوں کے زخم ٹھیک ہو جانے سے پہلے ہی دونوں قیدیوں کے پیروں میں صاحب کے حکم سے بیڑیاں ڈال دی گئیں۔ ان پر فوراً مقدمہ چلا کر سزا دینے کے لئے سیشن جج خود جیل میں تشریف لائے۔ فوراً ہی ضروری گواہی اور ثبوت پیش ہو جانے پر انہیں سیشن جج نے آگ لگانے اور قتل کے جرم میں پھانسی کا حکم سنا دیا۔

سرکار کے قاعدے سے پھانسی کی سزا دیے جانے والے ہر شخص کو ہائی کورٹ میں اپیل کرنے کی اجازت ہوتی ہے۔ ان دونوں مجرموں کی طرف سے اپیل کی گئی۔

ہائی کورٹ سے پھانسی کی سزا رد ہوجانے یا سزا پر ہائی کورٹ کی منظوری کی مہر لگ جانے تک انہیں سلاخوں والی کوٹھری میں بند کردیا گیا۔

انگریز سول سرجن صاحب جب بھی کوٹھریوں کے سامنے آتے، نفرت سے ان کے ماتھے پر بل پڑجاتے۔ زیادہ کچھ کہنے کا موقع نہ ملنے پر "مرڈرر" کہہ کر ایک طرف تھوک دیتے۔

صاحب کا رخ دیکھ کر ایسے خطرناک قیدیوں کے اوپر ہندوستانی جیلر، دوسرے افسروں اور وارڈر سب خاص طور پر سختی کرتے تھے۔ کبھی کوئی دوسرا قیدی ان کی کوٹھری کے سایے کے قریب بھی نہ جاتا۔ ان کے سامنے آتے ہی سب افسروں اور وارڈروں کے چہرے پتھر کی طرح کسی بھی جذبے سے عاری اور سخت ہوجاتے۔

بشیشر پرساد اور رحمان خاں اپنے جرم کا بوجھ جانتے تھے۔ معافی کی انہیں کوئی امید نہیں تھی لیکن انہیں یہ مایوس کن حیرانی تھی کہ ان تمام ہندوستانیوں کو ان سے نفرت اور خوف کیوں ہے؟ جس انگریز سرکار سے وہ لڑنے گئے تھے، اس سرکار کا انگریز تو کبھی کبھی ہی دکھائی دیتا ہے۔ وہ سرکار تو خود ان جیسے ہندوستانیوں کے ہاتھوں سے چل رہی ہے۔ ملک کو آزاد کیا جائے تو کس سے؟

انگریزوں کو جلاکر ان کو ختم کرنے والے قاتلوں کے لئے صاحب لوگوں کے غصے اور نفرت کی کوئی حد نہیں تھی۔ ہائی کورٹ سے دونوں کو پھانسی لگانے کی اجازت مل جانے پر انہیں پھانسی کی رسی سے چھٹپٹاتے دیکھنے کے لئے، جیل کے بڑے صاحب اور بغاوت کے نتیجے میں ضلع کی بگڑی ہوئی صورت حال کو بہتر بنانے کے لئے آئے دوسرے انگریز افسر تڑکے ہی جیل پہنچ گئے۔

موت سامنے تھی۔ موت کی طرف انہیں دشمن کی نفرت لے جارہی تھی۔ جسم دے کر بھی اس ظلم وتشدد کے سامنے آزادی کے جذبے کو زندہ رکھنے کے لئے، نہ ہارنے کے لئے، انہوں نے پھانسی کے تختے پر پہنچ کر بھی نعرہ لگایا۔ "انقلاب زندہ باد! بھارت ماں کی جے!"

اور پھر انہوں نے اپنے چاروں طرف کھڑے ہندوستانیوں کو دیکھا۔ وہ لکڑی کی مورتیوں کی طرح جذبات سے عاری سیدھے کھڑے تھے۔

موت کے لمحے میں بھی انہیں اپنوں سے اپنے پن کا کوئی اشارہ نہ ملا۔ صرف دشمن دانت پیس رہے تھے۔

بشیشر اور رحمان کے رشتے دار روتے ہوئے اپنے آدمیوں کی لاشیں لینے کے لئے جیل کے پھاٹک پر کھڑے تھے۔ کلکٹر صاحب نے ان کی درخواست منظور نہیں کی۔ باغیوں کی لاشوں کے مظاہرے سے شہر میں ہنگامہ کھڑا ہونے کا اندیشہ تھا۔

سول سرجن صاحب کے حکم سے ہندوستانی جیلر حاضر ہوا۔ صاحب نے حکم دیا۔ "دونوں باغیوں کی لاشیں جیل کے اندر ہی دفنا دی جائیں۔" دانت پیس کر صاحب نے کہا "اور ان لوگوں کی لاشوں پر 'مرسا' کا ساگ بویا جائے۔ ساگ تیار ہونے پر وہ سب لوگوں کے یہاں بھیجا جائے۔

"مرسا" کا ساگ بہت جلدی تیار ہوجاتا ہے۔ گہرائی تک بھربھری قبروں کی زمین پاکر وہ اور بھی جلدی اونچا اٹھ گیا۔ ایک دن ساگ کو خوب ہرا بھرا دیکھ کر سول سرجن صاحب نے ساگ صاحب لوگوں کے یہاں بھیجنے کی فرمائش کی۔

جیل بھر میں خبر پھیل گئی ــ باغیوں کی قبر کا ساگ آج صاحب لوگوں کے یہاں بھیجا گیا ہے۔ رات ہونے پر جیل بند ہوئی۔ بارکوں میں بند ہر قیدی کے دل میں ساگ کی بات تھی۔ ہر قیدی سوچ رہا تھا۔ ہندوستانی کو انگریز کھا رہا ہے لیکن سب ہی کا منھ بند تھا۔ ایسی بات کہنے کی رپورٹ اگر صاحب کے سامنے پہنچ جائے۔

جیل کے ہر افسر کے دل میں بھی ساگ کا خیال موجود تھا۔ ہر افسر اور وارڈر سوچ رہا تھا کہ انگریز ہندوستانی کو کھا رہا ہے لیکن جیلر صاحب دودھیا مسہری پر' پنکھے کے نیچے' دل میں ابال لیے تکیے میں منھ دبائے پڑے تھے۔ ڈاکٹر اور کمپاؤنڈر صاحب بھی چادر میں منھ چھپائے یہ سوچ رہے تھے۔ بڑے وارڈر میلے پھٹے کمبل پر آنکھ موندے اور صرف بیس روپے ماہوار پانے والے نئے سپاہی پلنگ پر منھ اوندھا کیے یہی سوچ رہے تھے لیکن کوئی لفظ کسی کے ہونٹوں پر نہ تھا۔

ضلع میں امن قایم ہوجانے کی خوشی میں صاحب لوگوں کے کلب میں اس دن

ڈر تھا۔ ہندوستانی بیرے صاف پلیٹوں میں ہندوستانی باغیوں کی قبر پر اگا ہوا وہ ساگ صاحب لوگوں کے سامنے پیش کر رہے تھے۔

انہوں نے بھی ساگ کی کہانی سنی تھی۔ ان کے چہرے خوف سے سہمے ہوئے تھے۔ پیروں میں کمزوری کا احساس تھا لیکن ہاتھ خوف سے صاحب کی خدمت میں مشین کی طرح اپنا کام کرتے جا رہے تھے۔

بات سب کے دل میں تھی لیکن کسی کے ہونٹوں پر نہیں آتی تھی۔ صاحب کے خوف سے اور آپس میں ایک دوسرے کے خوف سے۔

آہ سب کے دل میں تھی لیکن آہیں سب کی الگ الگ بکھری ہوئی' بے جان سانسوں کی طرح ان کے دل سے نکل کر ہوا میں غائب ہو رہی تھیں۔ ایک ساتھ مل کر وہ آدھی بھی طاقت نہیں پا سکتی تھیں کیونکہ انہیں ایک دوسرے کا ڈر تھا۔ ڈر۔۔۔ انہوں سے ڈر' دشمن سے ڈر' سب طرف ڈر ہی ڈر۔۔۔

پھولو کا کرتا

اگر مجھے شور شر اور کشمکش سے بھرے شہروں میں ہی اپنی زندگی گذارنی پڑتی تو میں یا تو خودکشی کرلیتا یا پاگل ہوجاتا۔ خوش قسمتی سے سال میں تین مہینے کے لئے کالج کی چھٹیاں ہوجاتی ہیں اور میں شہر کے تعصب پسند ماحول سے بھاگ کر پہاڑ میں اپنے گاؤں چلا جاتا ہوں۔

میرا گاؤں جدید زندگی کے ہنگاموں سے بہت دور' ہمالیہ کے دامن میں ہے۔ بھگوان کی مہربانی سے ریل' موٹر اور تار کی لعنت نے اس گاؤں کو ابھی تک نہیں چھوا ہے۔ پہاڑی زمین اپنا قدرتی سنگار لیے ہوئے ہے۔ انسان اس کی پیداواری طاقت سے مطمئن ہے۔

ہمارے یہاں گاؤں بہت چھوٹے چھوٹے ہیں۔ کہیں کہیں تو بہت ہی چھوٹے' دس بیس گھر سے لے کر پانچ چھ گھر تک اور بہت پاس پاس۔ ایک گاؤں پہاڑ کی تل ہٹی میں ہے تو دوسرا اس کی ڈھلان پر۔ جہالت ہے لیکن تعصب اور بے چینی جیسی کوئی بات نہیں ہے۔

بنکو ساہ کی چھپر سے چھائی دکان گاؤں کی تمام ضروریات پوری کردیتی ہے۔ ان کی دکان کا برآمدہ ہی گاؤں کی چوپال یا کلب ہے۔ برآمدے کے سامنے دالان میں یا پیپل کے نیچے بچے کھیلتے ہیں اور ڈھور ڈنگر بیٹھ کر جگالی کرتے ہیں۔

صبح سے زور کی بارش ہورہی تھی۔ باہر جانا ممکن نہیں تھا اس لئے میں موجودہ دور کے ایک ترقی پسند مصنف کا ناول پڑھ رہا تھا۔

کہانی تھی ایک اونچی ذات کے نوجوان کی جس کی شادی ایک پڑھی لکھی لڑکی سے ہوگئی تھی۔ شہر میں نوجوان کی آمدنی میں گذارہ نہیں ہوپارہا تھا۔ اس لئے اس کی بیوی نے بھی نوکری کرکے کچھ کمانا چاہا لیکن یہ بات اس نوجوان کے ضمیر کو گوارا نہ

تھی۔ ان کے یہاں اولاد پیدا ہوگئی۔ ہونی ہی تھی۔ ایک دو اور پھر تین بچے۔ مہنگائی کے زمانے میں بھوکوں مرنے کی نوبت آگئی تھی۔ ان کا بیمار ہوجانا۔ اپنی بیوی کی رائے سے نوجوان کا ایک سیٹھ جی کے یہاں نوکری کرنا اور ان کا خوشحال ہوجانا۔

ایک دن راز کھلا کہ ان کی خوشحالی کی قیمت اس کی اپنی قابلیت نہیں بلکہ اس کی بیوی کی عزت تھی۔ شوہر نے غصے میں آکر بیوی کا گلا گھونٹ دینا چاہا۔ بیوی نے گڑگڑا کر معافی مانگی اور کہا کہ اس نے جو کچھ کیا' ان بچوں کے لئے کیا۔ بیوی نے صرف بچوں کی پرورش کرنے کے لئے اپنی جان کی بھیک مانگی۔ شوہر سوچنے لگا۔ میری عزت کی قیمت زیادہ ہے یا تین بچوں کی جان کی۔

میں نے نفرت سے کتاب پٹک دی۔ سوچا۔ یہ ہماری گراوٹ کی حد ہے۔ آج ایسا ادب تیار ہورہا ہے جس میں بدعنوانی اور بدکاری کے لئے صفائی دی جاتی ہے۔ یہ ادب ہماری تہذیب کی بنیاد بنے گا! ہماری زندگی کتنی کھوکھلی اور بے معنی ہوتی جارہی ہے۔ خود غرضی کے پاگل پن میں چھینا جھپٹی اور مارا ماری ہمیں بدحواس کر رہی ہے۔ ہم اپنی اس انسانیت اصول پسندی اور ثابت قدمی کو کھوچکے ہیں جس کو ہمارے رشیوں نے دنیاوی عیش و آرام کو چھوڑ کر بڑھاوا دیا تھا۔ ہم خود غرضی کی پٹی آنکھوں پر باندھ کر بھارت کی آتم گیان کی تہذیب کا پرسکون راستہ کھوچکے ہیں.... کیا پیٹ اور روٹی ہی سب کچھ ہے؟ اس کے علاوہ انسانیت' تہذیب اور اخلاق کوئی معنی نہیں رکھتے؟ ایسے ہی خیالات میرے ذہن میں اٹھ رہے تھے۔

بارش تھم کر دھوپ نکل آئی تھی۔ گھر میں دوا کے لئے کچھ اجوائن کی ضرورت تھی میں گھر سے نکل پڑا کہ بنکو ساہ کے یہاں سے لے آؤں۔

بنکو ساہ کی دکان کے برآمدے میں پانچ سات بھلے آدمی بیٹھے تھے۔ حقہ چل رہا تھا۔ سامنے گاؤں کے بچے کوڑا کڑی کا کھیل کھیل رہے تھے۔ ساہ کی پانچ برس کی بیٹی پھولو بھی ان ہی میں شامل تھی۔

پانچ برس کی لڑکی کا پہننا اور اوڑھنا کیا! ایک کرتا کندھے سے لٹکا تھا۔ پھولو کی منگنی ہمارے گاؤں سے فرلانگ بھر دور چولا' گاؤں کے سنتو سے ہوگئی تھی۔

سنتو کی عمر رہی ہوگی' یہی کوئی سات برس۔ سات برس کا لڑکا کیا کرے گا! گھر

میں دو بھینسیں ایک گائے اور دو بیل تھے۔ ڈھور چرنے جاتے تو سنتو چھڑی لے کر ان کی دیکھ بھال کرتا اور کھیلتا بھی رہتا۔ ڈھور کیوں کسی کے کھیت میں جائیں۔ شام کو انہیں ہانک کر گھر لے آتا۔

بارش تھمنے پر سنتو اپنے ڈھوروں کو ڈھلان کی ہریالی میں ہانک کر لے جا رہا تھا۔ بنکو ساہ کی دکان۔ سامنے پیپل کے نیچے بچوں کو کھیلتے دیکھا تو ادھر ہی آگیا۔

سنتو کو دیکھ کر سنسار کا چھ برس کا لڑکا ہریا چلا اٹھا۔۔ آیا' پھولو کا دولہا آگیا۔

دوسرے بچے بھی اسی طرح چلانے لگے۔

بچے بڑے بوڑھوں کو دیکھ کر' بغیر بتائے سمجھائے بھی سب کچھ سیکھ اور جان لیتے ہیں۔ یوں ہی آدمی کے علم اور تہذیب کی روایت چلتی رہتی ہے۔ پھولو پانچ برس کی بچی تھی تو کیا' وہ جانتی تھی کہ دولہا سے شرم کرنی چاہیے۔ اس نے اپنی ماں کو اور گاؤں کی سب ہی بھلی عورتوں کو شرم سے گھونگھٹ اور پردہ کرتے دیکھا تھا۔ اس کے سنسکاروں نے اسے سمجھا دیا تھا' شرم سے منھ ڈھک لینا ہی ٹھیک ہے۔

بچوں کے چلانے سے پھولو شرما گئی لیکن وہ کرتی تو کیا۔ ایک کرتا ہی تو اس کے کندھوں سے لٹک رہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے کرتے کا آنچل اٹھا کر اپنا منھ چھپا لیا۔

چھپر کے سامنے' حقے کو گھیر کر بیٹھے ادھیڑ عمر کے لوگ پھولو کی اس شرم کو دیکھ کر قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

کاکا رام سنگھ نے پھولو کو پیار سے دھمکا کر کرتا نیچے کرنے کے لئے سمجھایا۔

شرارتی لڑکے مذاق سمجھ کر ہوہو کرنے لگے۔

بنکو ساہ کے یہاں دوا کے لئے تھوڑی اجوائن لینے آیا تھا لیکن پھولو کے بھولے پن سے دل پر چوٹ لگی۔ یوں ہی لوٹ آیا۔

سوچتا جا رہا تھا۔۔ بدلتے حالات میں بھی روایتی سنسکار سے ہی اخلاق' اصول اور عزت کی حفاظت کرنے کی کوشش میں کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔

ترقی پسند مصنفوں کی بہکی بہکی باتیں۔

ہم پھولو کے کرتے کے آنچل میں پناہ لینے کی کوشش میں بھٹکتے چلے جا رہے ہیں اور یہ نئے مصنف ہمارے چہرے سے کرتا نیچے کھینچ دینا چاہتے ہیں۔

مہمان نوازی

رام شرن کو بھارت سرکار کے محکمہ مال میں کلرکی کرتے تین سال گذر گئے تھے۔ اتنی بڑی سرکار کی انتظامیہ میں جگہ اور اس کا سہارا پاکر رام شرن نے ایسی متعدد سہولیات حاصل کرلی تھیں جو عام آدمی کے لئے محض خواب تھیں۔ ہر سال میدانوں کو تڑپا دینے والی گرمی سے بھاگ کر چھ مہینے تک شملہ کے پہاڑوں پر قیام اور چھ ماہ تک دہلی کے شاہی شہر کی رونق۔

رام شرن کی پیدائش ہوئی تھی ضلع میرٹھ کے ایک گاؤں میں، جہاں زمین ہر موسم میں اپنے پیٹ پر ہل کے پھلے کی تکلیف برداشت کرکے مسلسل فراخ دلی سے بیج قبول کرنے کے لئے تیار رہتی ہے۔ ہری بھری فصلوں کو کاٹ کر اپنے کھلیانوں میں جمع کرلیتے ہیں۔ زمین بے چاری بے رونق اور اداس ہوجاتی ہے اور اپنے آپ کو ڈھکنے کی امید میں پھر ہل کی مار کو برداشت کرنے کے لئے تیار ہوجاتی ہے۔ ان زرخیز علاقوں کی خوبصورتی انسان کے ذریعہ بار بار استعمال سے ایک ادھیڑ عمر گرہستن کی طرح ہوگئی ہے، جسے کام کاج اور الجھن کے بوجھ سے دب کر کبھی سنگار کرنے یا مسکرانے کا موقع نہیں ملتا اور جس کی طرف نگاہ جانے پر عاشق مزاج نوجوان کے دل میں گدگدی نہیں ہوتی۔

رام شرن اپنے گھر سے کنستر میں لایا ہوا گھی کھاتا تھا اور دفتر میں سرکار کی آمدنی اور خرچ کا حساب، کروڑوں کی تعداد تک کرکے اپنے دماغ کو تھکا دیتا تھا۔ چھٹی کے دن وہ آس پاس کی پہاڑیوں پر کھلی ہوا میں سینہ پھیلا کر، گہرے سانس لے کر، میلوں دور تک نگاہیں دوڑا کر قدرت کے نظاروں سے لطف اندوز ہوتا۔ اپریل اور مئی کے مہینوں میں شملہ کی وادیاں پھلوں کے رنگ لے کر کھلکھلا کر ہولی کھیلتی دکھائی دیتیں۔ برسات کے مہینے میں آسمان پر مسلسل گہرا پن رہتا۔ بادل برس برس کر بھی

مطمئن نہ ہوتے۔ وہ اٹھ اٹھ کر گھر کے اندر چلے آتے۔ زمین دھوپ کی مسکراہٹ کے انتظار میں بے چین ہوجاتی۔ لیکن بادل کسی خوددار عاشق کی طرح مغرور بنے رہتے۔ ان کی آن کا خاتمہ محبوب کے بے چین ہوجانے پر بھی نہیں ہوتا۔ اور پھر جب قدرت چوماسے کی اداسی کو چھوڑ کر مسکرا اٹھتی تو ستمبر کا مہینہ گذرتے گذرتے وادیوں پر پھولوں کا دیوانہ پن چھاجاتا۔ رام شرن کا دل کھل کر بے قرار ہوجاتا۔ سوچتا تھا کہ اس حیرت انگیز ملک میں آنکھ سے پرے نہ جانے اور کیا کیا ہے۔

رام شرن نے ان پہاڑی دیسوں میں دور دور تک گھوم آئے متعدد جرات مند افراد سے پوچھ پوچھ کر بہت سی انوکی کہانیاں' داستانیں اور وہاں کے قدرتی حس اور عجیب وغریب طور طریقوں کی باتیں معلوم کی تھیں۔ اس نے سن رکھا تھا کہ اس دیس کے فراخ دل اور بھولے باشندے بھٹکے ہوئے مسافروں کی خاطر تواضع کا موقع حاصل کرنے کے لئے آپس میں جھگڑنے لگتے ہیں۔ وہاں چمپا کے رنگ کی عورتیں مہمان کی تھکان مٹانے کے لئے اس کے بدن کو اپنے ہاتھوں سے دباتی ہیں' اپنی بساط کے مطابق مہمان کو ہر سہولت فراہم کرنے کے لئے تیار رہتی ہیں۔ وہ دیس دیکھنے کے لئے رام شرن کا دل بے قرار ہو اٹھتا تھا۔

اس سال جب اکتوبر میں سرکاری دفتر شملہ سے دہلی جارہا تھا۔ رام شرن نے تین ماہ کی چھٹی لے لی۔ اس کا خیال تھا کہ دور دور تک پہاڑوں میں گھومے گا اور جاڑوں میں شملہ کو برف کی رضائی اوڑھ کر سوتے ہوئے دیکھے گا۔

رام شرن ایک جھولے میں ایک معمولی سا کمبل اور بلم لگی لاٹھی لے کر شملہ سے چل پڑا۔ وہ شوبرا' ٹھیوگ' نارکنڈا' اور باگی' ہوتا ہوا چلتا جارہا تھا کہ ایسی جگہ پہنچے جو جدید تہذیب کی فریب کاریوں سے آزاد اور قدرتی طور پر آرام دہ ہو۔ وہ رام پور بشیر سے آگے نکل گیا۔

رام شرن تھکن کی وجہ سے سڑک پر گرتے ایک چھوٹے سے پہاڑی جھرنے پر بیٹھ گیا تھا۔ جھولے میں سے نکال کر اس نے کچھ سوکھا میوہ کھایا اور پانی پی کر آرام کرنے لگا۔ اس کی پیٹھ کے پیچھے ایک بڑی چٹان تھی۔ اونچے درختوں سے چھن کر آتی چتلی دھوپ خوشگوار لگ رہی تھی۔ سامنے وادی سے اترتے "توش" کے جنگل پر

تیرتھ اس کی نظر نیچے تل ہٹی میں بکھرے گاؤں کی طرف لگی تھی۔ بیتھو کی فصل پک کر پتے پیلے پڑ گئے تھے اور اناج کی سرخ بالیں دھوپ میں دہک رہی تھیں۔ کچھ دن پہلے کئی مکا کے بھٹے مکانوں کی ڈھلوان چھتوں پر سوکھنے کے لئے پھیلا دیے گئے تھے۔ اس کی وجہ سے چھتیں زعفرانی چادر سے ڈھکی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ رام شرن کی آنکھوں کے سامنے تو یہ سب تھا مگر اس کے تصور میں کچھ اور ہی تھا۔

سڑک کے پچھلے موڑ پر، نیچے کے کھیت سے کسی انسان کی آواز سن کر اس نے گھوم کر دیکھا تھا تو پتہ چلا کہ دو پہاڑی عورتیں اس کی طرف دیکھ کر آپس میں ہنس رہی تھیں۔ اس نے سوچا۔ کتنی معصومیت ہے ان لوگوں میں.... اچھا ہوتا اگر وہ ان سے دو باتیں کر لیتا۔ اب کی بار چوک گیا پھر ایسا موقع آنے پر سہی۔

جھرنے کے قریب ہی ایک پگڈنڈی پہاڑی سے اتر کر سڑک پار کر رہی تھی۔ قدموں کی آہٹ ملی۔ پگڈنڈی سے چل کر رنگین ٹوپی پہنے ایک بوڑھا اس کے قریب آگیا۔ بوڑھا ہاتھ کی لاٹھی ایک طرف رکھ کر زمین پر بیٹھ گیا۔ اس نے مٹھی ہونٹوں پر رکھ کر بابو سے ایک سگریٹ مانگ لی۔ رام شرن سگریٹ اور تمباکو کے لئے پہاڑیوں کے لگاؤ کو جانتا تھا۔ چلتے وقت اس نے سگریٹ کی کئی ڈبیاں اپنے جھولے میں رکھ لی تھیں۔ ایک سگریٹ نکال کر اس نے بوڑھے کو دی اور سامنے تل ہٹی ہی میں سے گاؤں اور اس کے آس پاس کے دیہات کے نام پوچھنے لگا۔

رام شرن نے پہاڑی پر چڑھتی پگڈنڈی کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔ "یہ راستہ کہاں جاتا ہے؟"

"لنگوڑی کو۔" بوڑھے نے تمباکو کے دھوئیں سے کھانستے ہوئے جواب دیا۔ "آگے 'تلہ' ہے، پھر 'شورا'۔ ایسے ہی گاؤں گاؤں چین تک چلا جاتا ہے۔ اس کے آگے چھوٹا تبت ہے۔ ہم لوگ انہی راستوں سے آتے جاتے رہتے ہیں۔ سڑک تو بہت گھوم کر جاتی ہے۔ اس پگڈنڈی سے دو دن کی منزل ایک دن میں ہو جاتی ہے"

"راستے میں گھنے جنگل ہوں گے۔" رام شرن نے پوچھا "آدمی راہ بھول جائے تو؟"

"جنگل بھی ہے، گاؤں بھی ہے۔ سارا علاقہ بسا ہوا ہے۔"

"جنگل میں کون سے جانور ہوتے ہیں؟"

"گھرڑ ہے، ریچھ ہے، کبھی باگھ بھی ہوتا، چیتا بہت ہے۔"

"جانور آدمی کو نہیں مارتا؟"

"آدمی کو کم چھیڑتا ہے۔ جانور پر پڑتا ہے۔"

بوڑھا سگریٹ ختم کر کے رام رام کہہ کر اپنی راہ چل دیا اور رام شرن پگڈنڈی پر چڑھنے لگا۔ دل میں سوچتا جارہا تھا۔۔۔ مجھے راستے بھولنے کا ڈر کیا؟ جہاں پہنچ گئے، وہیں ہمیں جانا ہے، کوئی نئی جگہ ہو۔ کچھ دور چڑھ کر وہ اس ٹیلے کی چوٹی پر پہنچ گیا۔ متعدد ٹیلوں کی پیٹھ پر بیٹھے اس ٹیلے کی چوٹی پر کھڑے ہو کر وہ اپنے آپ کو زمین سے بہت اونچا محسوس کر رہا تھا۔ اس نے پیچھے گھوم کر دیکھا۔۔۔ سورج پچھم میں پہاڑوں کی اونچی دیوار کی چوٹی کو چھو رہا تھا۔ شام ہونے سے اسے ڈر نہیں لگا۔ سامنے توش اور کھرشو کے پیڑوں کے سایے میں ایک اور چھوٹا سا ٹیلہ تھا اور اس کے پار اونچے پہاڑ کی ڈھلان پر چھوٹا سا گاؤں سورج کی زرد کرنوں میں چمک رہا تھا۔ رام شرن رات اسی گاؤں میں ایک انجان مہمان کی شکل میں گذارنا چاہتا تھا کتنے ہی تصورات سے اس کا ذہن بھرا پڑا تھا۔

رام شرن جنگل سے گھرے ٹیلے پر چڑھ رہا تھا تو سورج کی کرنیں چھپنے لگیں اور چڑھائی ترچھی ہونے لگی۔ اس کے سینے کی دھڑکن اور ہر سانس کے ساتھ اندھیرا گہرا ہوتا جارہا تھا۔ جھاڑیوں اور درختوں کے رنگ برنگے پتے اور ساخت سب کاجل کے کھلونے ہوتے جا رہے تھے۔ گھنے درختوں کے نیچے گھنی گھاس میں پگڈنڈی کبھی کی چھپ چکی تھی۔ اجالے کی امید میں آنکھیں اوپر کی طرف اٹھانے سے سر پر صرف کالے پتوں کا گھنا چھاجن دکھائی دیتا تھا۔ رام شرن صرف سمت کے اندازے سے چل رہا تھا۔ اندازے کے مطابق ٹیلے کی چوٹی بہت دور پیچھے چھوٹ چکی تھی۔

رام شرن اپنی طاقت لگا کر تیزی سے چلنے لگا۔ اس کے بدن کے رونگٹے کسی بھی آہٹ پر کھڑے ہو جاتے تھے۔ اگر اس وقت کوئی بھالو یا چیتا آجائے تو؟ اس نے ہمت بنائے رکھنے کا فیصلہ کیا۔ جانور کے منہ کھول کر جھپٹنے پر اس کے منہ میں بلم ڈال کر دھنسا دے گا۔ کھرشو کے کانٹے دار پتے بار بار اس کے رخسار اور ہاتھوں کو چھیل

دیتے تھے۔ چڑھائی پر اس کے آگے بڑھنے والے قدم کے لئے زمین موجود رہتی تھی مگر ڈھلان آنے پر آگے بڑھنا اور بھی مشکل ہو جاتا۔ وہ کئی بار گرتے گرتے بچا۔ گر پڑتا تو جانے کہاں پہنچ جاتا؟ اگلا قدم بالشت بھر نیچے پڑے گا یا گز بھر یا پچاس ہاتھ' کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کے پیر لڑکھڑانے لگے اور چوٹی سے ایڑی تک پسینہ بہنے لگا۔

رام شرن نے آڑے وقت کے لئے سنبھال کر رکھی ہوئی ٹارچ جھولے میں سے نکالی اور بلم کے سہارے ایک ایک قدم اترنے لگا۔ گھنے اندھیرے میں ایسی انجانی جگہ آمرنے کی اپنی بے وقوفی پر وہ پچھتانے لگا۔ لحہ لحہ ریچھ اور چیتے کا خیال آرہا تھا۔ ایسے وقت میں اگر کوئی جانور آجائے تو ٹارچ کیسے سنبھالے اور کیسے بلم تھام کر حملہ کرے؟ سنا تھا جنگلی جانور آدمی کی آواز سے گھبراتے ہیں۔ سوچا زور سے گانے لگے مگر منھ سے ایک لفظ بھی نہ نکل پایا وہ سوچنے لگا۔ پہاڑ جیسی بری جگہ اور کوئی نہیں۔ دیس دیکھنا تھا تو کلکتہ یا بمبئی جاتا۔

رام شرن کو ٹارچ کی گول روشنی میں ایک پگڈنڈی راستہ کاٹتی دکھائی دی۔ پچھتانے لگا کہ اب تک یوں ہی بھٹک رہا تھا۔ وہ اترائی کی طرف چل پڑا۔ ایک گھنٹے کے قریب تیز تیز چلنے پر وہ گھنے جنگل سے باہر آگیا۔ جنگل کے باہر اندھیرا اتنا گھنا نہیں تھا۔ آسمان میں چھائے اجلے بادلوں سے کچھ روشنی بھی جھلک رہی تھی۔ گھڑی دیکھی صرف ساڑھے سات بجے تھے۔ کچھ ہی دور روشنی کے دھبے جیسے دکھائی دیے۔ وہ سمجھا کہ گاؤں آگیا۔ وہ دھیمے دھیمے اسی طرف چلنے لگا۔ رام شرن کا ڈر اور چال کی تیزی کم ہوئی تو ٹھنڈی پہاڑی ہوا بدن میں لگنے سے کپکپی شروع ہوگئی۔ اس نے کمبل اوڑھ لیا اور اس انجان گاؤں کی طرف بڑھنے لگا۔ انجان اور سیدھے سادے پہاڑیوں کے گھر رات گذارنے کی خواہش پھر سر اٹھانے لگی۔ گاؤں بہت چھوٹا تھا' یہی دس بارہ گھر۔ مکان نیچے اور چھوٹے' پہاڑی مکانوں کی طرح دو منزلیں۔ پہلی منزل نیچی اور دبے کواڑوں کی اونچائی تک۔ دوسری منزل ڈھلوان چھت کی وجہ سے بن جانے والے تکون میں سمائی ہوئی۔

رام شرن پہلے ہی مکان کے پاس پہنچا تھا کہ ایک کتا غرا کر بھونکنے لگا' پھر دوسرا

اور پھر بہت سے کتے بھونکنے لگے۔ کتوں کے بھونکنے سے رام شرن کو ڈر نہیں لگا۔ کتا انسانوں کی بستی کی علامت اور انسان کا ساتھی ہے۔ اس نے کتوں کو پچکارا لیکن ان کی طرف بڑھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اس نے دور ہی سے پکارا۔ "کوئی ہے؟ ذرا دیکھنا، مسافر ہوں۔"

رام شرن کے تین بار پکارنے پر مکان کے اوپر کی منزل کی کھڑکی کھلی۔ پہاڑی بولی میں آواز آئی، "کون ہے اس وقت؟"

"مسافر۔" رام شرن نے جواب دیا۔

کھڑکی سے ایک چراغ ہاتھ کی اوٹ سے باہر نکلا۔ چراغ کے پیچھے ایک چہرہ دکھائی دیا۔ قریب کے دو اور مکانوں کے اوپر کی کھڑکیوں سے بھی پکار سنائی دی۔ "کون ہے اس وقت؟ کیسا مسافر؟"

سب سے پہلے کھڑکی سے باہر جھانکنے والے چہرے نے دوہرایا، "کیسا مسافر؟ کس گاؤں سے آیا ہے؟ کہاں جانا ہے؟"

قریب کے مکانوں سے دو آدمی باہر نکل آئے۔

"شملے سے آیا ہوں؟ ایسے ہی گھومنے سیر کرنے کے لئے۔" رام شرن نے جواب دیا۔

باہر نکلنے والا آدمی کھڑکی سے بات کرنے والے کی طرف دیکھ کر بولا۔ "بدمعاش ہے۔" اور اس نے رام شرن کی طرف دیکھ کر اسے دھمکایا، "چلے جاؤ یہاں سے! یہاں دکان سرائے نہیں ہے۔ بدمعاش، چور! آئے بڑے سیر کرنے والے! بھاگ جاؤ۔"

رام شرن کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ پیچھے چھوٹا گھنا جنگل، ریچھ، چیتے اور آسمان میں امڑتے کالے بادل، سب ایک ساتھ اسے یاد آگئے۔

رام شرن پل بھر خاموش کھڑا ان لوگوں کی طرف دیکھتا رہا اور پھر دل مضبوط کر کے رندھے گلے سے بولا۔ "سڑک سے بھٹکا پردیسی ہوں۔ رات کاٹنے کے لئے کوئی جگہ دے دو۔ غریب پر مہربانی ہوگی۔"

کھڑکی سے جھانکنے والا آدمی بھی نیچے اتر آیا اور اس کے پیچھے پیچھے تیسرا آدمی

بھی قریب آگیا۔ اس آدمی کی بغل میں ہاتھ بھر لمبا داؤ دکھائی دے رہا تھا۔ وہی داؤ جس سے پہاڑی لوگ بکرے کا سر اور پیڑ کی موٹی ڈال ایک ہی وار میں کاٹ ڈالتے ہیں۔

بعد میں آنے والا آدمی پہلے سے بھی زیادہ سخت اور غصے کے لہجے میں بولا۔ "نکل جا ابھی یہاں سے، ورنہ کاٹ ڈالوں گا۔" اس نے بغل میں دبا ہوا داؤ ہاتھ میں لے کر اسی سڑک کی طرف اشارہ کیا جدھر سے رام شرن آیا۔ "چل پیچھے۔"

کتے اپنے مالک کا ارادہ جان کر زور سے لپکے۔ رام شرن پیچھے ہٹ گیا۔ ایک پہاڑی آدمی نے کتوں کو روک لیا۔ دو آدمی رام شرن کو اور نیچے کے دیس کے لوگوں کو گالیاں دیتے ہوئے اسے گاؤں سے دور جنگل کی طرف کھدیڑتے ہوئے لے چلے۔

رام شرن گڑگڑا کر جنگل کے خطرے اور برسنے کے لئے تیار بادل کی طرف اشارہ کر کے پناہ کی درخواست کر رہا تھا لیکن وہ لوگ کچھ سننے کے لئے تیار نہ تھے۔ اسے گاؤں سے سو قدم پیچھے ہٹا کر، داؤ دکھا کر انہوں نے تاکید کر دی۔ "اگر اس سے آگے قدم بڑھایا تو کاٹ کر کتوں کو کھلا دیں گے۔" اور وہ لوگ لوٹ گئے۔

رام شرن جنگل میں کہاں جاتا؟ جنگلی جانوروں سے حفاظت کے لئے وہ بستی کے جتنے قریب ممکن ہو سکا، ایک اخروٹ کے پیڑ کے نیچے بیٹھ گیا۔ کمبل میں بدن کو لپیٹ لیا اور پیڑ کے تنے کے سہارے ٹک گیا۔ ٹارچ اور بلم اس نے تیار رکھ لیے۔ کچھ دیر بعد بوندیں پڑنے لگیں اور ہوا کا زور بڑھ گیا۔ رام شرن کا سر بھوک اور تھکن سے دکھنے لگا، سردی سے دانت بجنے لگے۔ جوں جوں جاڑا زیادہ لگ رہا تھا، سر کا درد بڑھتا جا رہا تھا۔

رام شرن نے اپنا سر اور جسم کس کر کمبل میں لپیٹ لیا۔ اسے اپنی بے وقوفی پر رونا آ رہا تھا۔ کب دن نکلے اور وہ سڑک پر پہنچ کر شملہ لوٹ جائے۔ جنگل کی طرف سے عجیب سی آواز آئی۔ اس کے جواب میں گاؤں کے کتے زور زور سے بھونکنے لگے۔ رام شرن کا کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ وقت گذرتا نہ دکھائی دیتا تھا۔ کمبل کے اندر ٹارچ جلا کر گھڑی پر نظر ڈالی۔ صرف نو بجے تھے۔ وہ اور بھی مایوس ہو گیا۔۔ صبح ہونے تک وہ شاید ہی بچ پائے گا۔ سر کے درد کی طرف سے دھیان ہٹانے کے لئے وہ گھٹنے پر

سر رکھ کر سانسیں گننے لگا۔

••• تین سو گیارہ تین سو بارہ رام شرن اپنی سانسیں گن رہا تھا۔ اسے لگا کوئی اس کے کندھوں کو دبا رہا ہے اور کمبل کھینچ رہا ہے۔ ریچھ! بھاگ! وہ ڈر سے اور بھی دبک گیا۔ منھ باہر نکالتے ہی جانور اس کو دبوچ لے گا۔ منھ ڈھک کر سخت بھول کی۔ اب منھ نہ کھولنے سے کیا جانور اس کو چھوڑ دے گا••• اس کا کلیجہ زور سے دھڑک رہا تھا۔ سوچنے لگا۔۔ کہ ایک جھٹکے سے کمبل اٹھاکر ٹارچ جلا کر جانور کو چندھیادے اور بلم سے حملہ کردے۔ رام شرن سانس روکے ٹارچ کا بٹن ٹٹولنے لگا۔

رام شرن اچھل کر کمبل پھینکنے کو ہی تھا کہ کان میں آواز پڑی۔ "او مسافر!"

رام شرن نے دھیان سے سنا۔ بہت دھیمی آواز تھی۔۔ "او پردیسیا' او مسافر!"

رام شرن نے سمجھ لیا کوئی آدمی ہے۔ انسان ہے تو اس سے بات کرکے وہ اپنی جان بچالے گا' گڑگڑائے گا' روئے گا۔ بلم نہیں اس وقت آنسو بچا سکتے ہیں۔ اس نے کمبل سے منھ نکالا۔

"اٹھ' آجا! ••• گھر میں آجا!"

رام شرن سامنے کھڑے آدمی کو دیکھتا رہ گیا' جیسے کچھ سمجھ نہ پایا ہو۔

"یہاں سردی میں مرجائے گا۔ دیکھ امبر (آسمان) میں پانی کیسے زور سے چڑھ رہا ہے۔"

رام شرن نے لمبی سانس لی اور اس کے پیچھے چل دیا۔

اس آدمی نے کواڑ بغیر کوئی آواز کیے کھولے۔ دھیمی آواز میں بولا۔ "کھٹکا مت کرنا۔"

پہاڑی نے رام شرن کو کوٹھری میں لاکر کواڑ بند کردیئے اور کواڑوں میں کنڈی لگادی۔ کوٹھری کی چھت کا ایک حصہ کھلا ہوا تھا۔ اوپر سے آتی روشنی میں وہاں کچا زینہ دکھائی دے رہا تھا۔ آدمی اوپر سے آتی روشنی کی طرف منھ اٹھاکر کچھ بولا۔ اوپر سے کوئی جواب ملا۔ آدمی نے پھر کچھ کہا اور پھر جواب ملا۔

رام شرن صرف اتنا سمجھ پایا کہ اسے ساتھ لانے والے آدمی نے پہلی دفعہ

نے پاہونے اور آگ کی بات اور دوسری دفعہ کھاٹ کی بات کہی تھی۔

رام شرن کا دل دھڑک رہا تھا۔ فوراً ہی ایک بڑی لڑکی دونوں ہاتھوں میں مٹی کی پرات جیسی انگیٹھی تھامے زینے سے اتری۔ انگیٹھی میں انگارے تھے اور اس کی روشنی میں لڑکی کا چہرہ، "گولڈن" سیب کی طرح چمک رہا تھا۔

لڑکی نے انگیٹھی دیوار سے ملی ہوئی چارپائی کے قریب رکھ دی اور رام شرن سے کہا، "پاہونے، آگ کے پاس بیٹھو، جاڑا ہے۔"

رام شرن کے جبڑے ابھی تک سردی سے جکڑے ہوئے تھے اور رہ رہ کر جسم میں پھریری سی دوڑ جاتی تھی۔ اسے تھوڑی ہچکچاہٹ محسوس ہوئی لیکن وہ آگ کے قریب چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اسے ساتھ لانے والا آدمی بھی آگ کے پاس زمین پر بیٹھ گیا اور اپنی جیب ٹٹول کر ایک پوٹلی نکالی۔ لڑکی ایک چھوٹی سی چلم لے آئی۔

مرد دھیرے دھیرے لڑکی سے باتیں کرتا ہوا چلم بھرنے لگا۔ "پڑوسی بہت خراب ہے۔ کوئی دیکھ تو نہیں رہا تھا؟ تو نے چاروں طرف دیکھ لیا تھا؟ •••• یہ دیس کے آدمی بڑے بدمعاش ہوتے ہیں، سب جانتے ہیں۔ رکھیڑی، گاؤں میں تو رتو کی گھروالی کو ایک پنجابی بھگا لے گیا۔ کوئی ان لوگوں کو گھر میں پاؤں کیسے رکھنے دے۔ رتو اور بیتا عورت کی تلاش میں باغوں تک گئے، ملی نہیں۔ ملتی تو اس کے (اس نے گالی دی) کے ٹکڑے کر دیتے اور اس کی ناک کاٹ دیتے۔ ••• دیس کے لوگ بڑے بدمعاش ہوتے ہیں •••• اس گاؤں کے لوگ بڑے ظالم ہیں کسی نے دیکھا تو نہیں؟" لڑکی مرد کی بات پر ہامی بھرتی جاتی تھی۔

لڑکی نے رام شرن کے پاؤں کو ہاتھوں میں لینے کی کوشش کی۔ رام شرن سہم گیا۔

"ہاں ہاں، پاؤں آگ پر سینک لو۔" مرد بولا۔

رام شرن نے پھر نہیں روکا۔ لڑکی اس کے دائیں اور بائیں پاؤں ہاتھ میں لے کر باری باری سینکنے لگی۔ جلدی ہی رام شرن کی سردی ختم ہونے لگی۔

کچھ دیر بعد زینے سے ایک جوان عورت اتری۔ اس کے ایک ہاتھ میں پانی کا لوٹا اور دوسرے ہاتھ میں چھوٹی سی تھالی تھی۔ تھالی میں رکھی مکئی کی روٹی سے بھاپ

اٹھ رہی تھی۔ روٹی کی سوندھی مہک کوٹھری میں پھیل گئی۔ تھالی میں کچھ بھیگا ہوا گڑ اور بہت سا مکھن رکھا تھا۔

لڑکی نے دیوار کے سہارے رکھی چٹائی انگیٹھی کے پاس بچھا دی۔ عورت نے پدنی کا لوٹا اور تھالی چٹائی کے پاس رکھ کر مسکرا کر نرم لہجے میں کہا۔ "کھاؤ پاہونے جی۔"

رام شرن نے مرد کی طرف دیکھا اور اپنا ماتھا چھو کر کہا۔ "بہت درد ہو رہا ہے، کھایا نہیں جائے گا۔"

"ہاں" مرد نے کہا، "جاڑے اور تھکان سے ایسا ہو گا۔ نیچے دیس کے لوگ بہت کچے ہوتے ہیں"

مرد چلم سلگا چکا تھا۔ چلم رام شرن کی طرف بڑھا کر بولا۔ "لو دم لگالو۔ گرمی آجائے تو درد ٹھیک ہو جائے گا۔"

رام شرن کو چلم کی عادت نہ تھی۔ اس نے انکار کر دیا۔ مرد نے حکیمانہ لہجے میں ضد کی۔ "پیو، پیو، خون میں گرمی آجائے گی، طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔

رام شرن نے مجبوری میں چلم لے کر دو سانس کھینچے۔ سر چکرا گیا۔ دل ڈوبتا سا محسوس ہوا، اور سر درد کی بات وہ بالکل بھول گیا۔

لڑکی کی ماں اوپر چلی گئی۔ واپس آئی تو کٹورے میں دودھ اور دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر چٹکی بھر سونٹھ رکھے ہوئے تھی۔

عورت رام شرن پر ممتا بھری نظر ڈال کر نرمی سے بولی۔ "پاہونے، یہ پھانک لو سردی مٹ جائے گی۔"

رام شرن جیسے چلم کے لئے انکار نہ کر سکا ویسے ہی سونٹھ پھانک کر دودھ کا کٹورا اس نے پی لیا۔

رام شرن کو دودھ پلا کر لڑکی کی ماں اس سے روٹی کھانے کے لئے کہنے لگی۔ بے دلی سے اور بڑی مشکل سے وہ ایک ایک ٹکڑا نگلنے کی کوشش کرنے لگا۔ مرد قریب بیٹھا دیس کے لوگوں کے بدمعاش ہونے اور اپنے گاؤں کے لوگوں کے ظالم ہونے کی بات دہراتا جاتا تھا کہ اگر کوئی دیکھ لے تو کیسی مصیبت ہوگی۔ دیس کے لوگوں کو تو داؤ

سے دو ٹکڑے کرکے کتوں کو ڈال دیا جائے تو سب سے اچھا۰۰۰۰ دروازے پر پاہونا آئے تو مصیبت ہے۔ ٹکاؤ تو گھر کی عورت کو بھگالے جائے' گاؤں کے لوگ لڑیں۔ نہ ٹکاؤ تو دھرم بگاڑو کہ پاہونے کو ٹکایا نہیں۔۔۔

عورت' ممتا اور مسکان بھری نگاہ سے دیکھ رہی تھی کہ کہیں پاہونا روٹی کھانے میں لاپروائی نہ کرے۔ وہ ہاتھ جوڑ جوڑ کی کہتی جارہی تھی۔ "دھن بھاگ کہ پاہونا پرمیشور دوارے آئے۔"

رام شرن بہت کوشش کے باوجود روٹی ختم نہیں کرسکا۔ اس نے ہاتھ کھینچ لیا۔

عورت نے رام شرن کے ہاتھ دھلائے اور برتن اٹھاکر چلی گئی۔

لڑکی نے اونی کپڑوں کا ایک بستر لاکر پلنگ پر رکھ دیا۔ بچھونے کی سلوٹیں دور کرکے رام شرن سے کہا۔ "لیٹو پاہونے جی!"

رام شرن تھکان سے ٹوٹا ہونے پر بھی بستر پر لیٹ نہ سکا کیونکہ مرد دیوار کا سہارا لیے گھٹنے پر رکھے پیتل کے ناریل کو گڑگڑاتے ہوئے رام شرن سے شملہ کے بازار میں گڑ' چینی' نمک اور بیتھو کے بھاؤ معلوم کررہا تھا۔ ان باتوں سے رام شرن کا کوئی تعلق نہ تھا لیکن پہلے سے شکی اور بوکھلائے ہوئے اپنے محسن کے سوالوں کا جواب کیسے نہ دیتا! وہ کچھ نہ کچھ کہتا ہی جارہا تھا۔

کچھ دیر بعد لڑکی اور اس کی ماں پھر زینے سے اتر آئیں۔ عورت نے آتے ہی طنزیہ انداز میں ہاتھ ہلاکر شوہر پر ناراضگی ظاہر کی۔ "کیسے ہو تم۰۰۰۰ تھکے ہوئے پاہونے کو آرام بھی نہیں کرنے دوگے؟ پاہونے جی' تم بستر پر لیٹو!" اس نے رام شرن کو مخاطب کیا۔

رام شرن بستر پر لیٹ گیا تو عورت اس کے پائنتی زمین پر بیٹھ کر اس کے پیر دبانے لگی۔

اس کا سر چکرا رہا تھا۔ بغیر عادت کے پیے تمباکو کے اثر سے یہ چکر زیادہ بھیانک ہوگیا تھا۔ اس نے پیر اوپر کھینچ لیے لیکن عورت پاؤں کے ساتھ کھینچ کر اس کے اوپر جھک گئی۔ "ہائے کیوں پاہونے جی" کیا پاہونے کے پاؤں نہیں دبائے جائیں گے؟"

رام شرن کا ذہن کچھ معتدل ہوا تو سنائی دیا— دیوار سے پیٹھ ٹکائے مرد ناریل گڑگڑاتے ہوئے بڑبڑا رہا تھا— "سب جانتے ہیں کہ دیس کے لوگ بدمعاش ہوتے ہیں ۰۰۰۰ گاؤں کے لوگ بہت ظالم ہیں ۰۰۰۰ کوئی پڑوسی جان جائے گا کیا کہے گا؟ دروازے آئے پاہونے کو نہ ٹکاؤ تو دیوتا روٹھے ۰۰۰

عورت کبھی مسکراکر اپنے شوہر کی طرف دیکھتی اور کہتی— "جاؤ اوپر جاکر لیٹونا۔" کبھی رام شرن کی طرف دیکھ کر مسکرا دیتی اور بہت صدق دلی کے ساتھ اس کے پاؤں، پنڈلیاں، رانیں، کمر اور پیٹھ دبا رہی تھی۔

رام شرن بے بس، آنکھیں موندے لیٹا تھا جیسے کوئی ڈاکٹر اس کے جسم پر بغیر کسی تکلیف کے آپریشن کر رہا ہو۔ وہ گاؤں کے باہر ہوہو کرتی ہوا اور بوندوں کے بیچ اخروٹ کے پیڑ کے نیچے کمبل میں سمٹ کر بیٹھ رہنے سے بھی زیادہ پریشان تھا۔

رام شرن کو محسوس ہوا کہ اب بڑبڑانے کی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔ اس نے ذرا پلکیں اٹھاکر دیکھا، مرد چلا گیا تھا لیکن عورت اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ "اب چنگے ہو پاہونے جی؟" اس نے پوچھا اور وہ زمین سے کھاٹ پر آگئی۔

رام شرن نے پھر پلکیں موند لیں۔ پلکیں موندے رہنے پر اسے ایک عجیب سی بو محسوس ہو رہی تھی۔ گھاس کی بو، گھی کی بو، پسینے کی بو، عورت کی بو۔ پلکیں موندے رہنے پر بھی اسے دکھائی دے رہا تھا۔ ماتھے پر رومال باندھے اس عورت کا گورا گورا، چہرہ، لمبی ناک سے لٹکا، پتلے ہونٹوں پر جھولتا ہوا پیتل یا سونے کا بلاق۔ جیسے ہونٹوں کو اوٹ دے کر بچانے کے لئے لٹکا دیا ہو اور ہاتھ بھر کا لمبا داؤ، مرد اس کے دو ٹکڑے کرکے کتوں کو کھلانے دینے کی دھمکی دیتا دکھائی دے جاتا تھا۔

رام شرن کی بند پلکوں کے اندر عورت کا مسکراتا چہرہ ناچ رہا تھا اور کان سن رہے تھے۔ "اب چنگے ہو پاہونے جی۔" اس کے جسم پر نیند لانے کے لئے پھرتے اس عورت کے ہاتھ اس کی نیند کو کوسوں دور بھگائے ہوئے تھے۔ تھکان، نیند اور خون کی بڑھتی گرمی سردرد بن رہی تھی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے جسم پر اتنا ہی زور پڑ رہا ہے جتنا کالج اور اسکول میں رسہ کشی کے مقابلے میں پڑتا تھا۔ وہ درد، خوف اور ہیجان بھی محسوس کر رہا تھا۔

رام شرن کو کسی نے ہلا کر جگایا۔ وہی جانا پہچانا لہجہ، وہی نرم آواز۔ "اٹھو پاہونے جی۔"

مرد کے سخت گلے نے اس بات کو پورا کیا۔ "دن چڑھنے کو ہو رہا ہے۔ پڑوسی بیلوں کو گھاس ڈالنے کے لئے اٹھنے والے ہوں گے۔ اس بدمعاش کو گاؤں سے نکال آؤں نہیں تو وہ داؤ سے اس کے دو ٹکڑے کر کے کھیت میں ڈال دیں گے کتوں کے سامنے۔۔۔"

عورت شہد اور مکھن چپڑی مکا کی ایک بڑی سی روٹی ہتھیلی پر لیے کھڑی تھی۔ "پاہونے جی! راستے میں پینے کے لئے پانی رکھ لو۔"

وہ مرد، رام شرن کے آگے آگے اندھیرے میں جنگل کی راہ بڑھتا جا رہا تھا۔ رام شرن ٹھوکر کھاتا ہوا اس کے پیچھے لڑکھڑاتا چلا جا رہا تھا۔ قریب کی ایک پگڈنڈی سے اس نے رام شرن کو سڑک پر پہنچا دیا اور بغل میں دبا داؤ دکھا کر روکھے انداز اور سخت لہجے میں دھمکایا.....

"چل جا۔ بدمعاش یہاں سے! خبردار جو کسی سے کہا کہ گھر ٹکایا تھا۔ میں بڑا ظالم آدمی ہوں۔۔۔ بوٹی بوٹی کاٹ ڈالوں گا!" اس نے ایک گھناؤنی گالی دے کر کہا، "آ گیا مہمان بن کر، عورت چوروں کے دیس کا بدمعاش۔"

مرد فوراً واپس ہو گیا۔

رام شرن دم لینے کے لئے سڑک پر بیٹھ گیا۔ وہ رات کی عجیب و غریب مہمان نوازی کے بارے میں سوچتا رہا۔

عزت کا بوجھ

سمجھ لیجئے، اس کا نام کیول چند تھا۔

کیول چند کو اپنے ہی شہر انبالہ میں ملیٹری انجینئرنگ سروس، کے دفتر میں نوکری مل گئی تھی۔ اسے ۱۹۴۴ء میں بھتہ ملا کر پچاسی روپے ماہانہ کی نوکری مل جانے سے اطمینان ہوا تھا۔ انبالہ میں اس کا اپنا چھوٹا سا مکان تھا۔ ۱۹۴۶ء میں جب سب چیزوں کے دام چوگنے ہوگئے تو ایک سو پانچ ماہ وار ملنے پر بھی ہاتھ خالی ہی رہ جاتے تھے۔' کچھ بنتا ہی نہیں تھا۔ سفید پوشی نباہنا بھی ممکن نہیں ہو رہا تھا۔

انبالہ کے ملیٹری انجینئرنگ سروس کے کچھ لوگوں نے تحریک چلائی کہ ان کا مہنگائی بھتہ بڑھنا چاہیے، انہیں کوارٹر ملنے چاہئیں، ان کے ساتھ باعزت سلوک ہونا چاہیے۔ کیول چند بھی اس تحریک میں شامل ہوا۔ اس تحریک کا نتیجہ یہ ہوا کہ آگے بڑھ کر بات کہنے والے لوگ برخاست ہوگئے۔ کیول چند کے گھر کی حالت خراب تھی۔ باپ کی موت ہو چکی تھی، بوڑھی ماں کو دمہ تھا۔ کچھ ہی مہینے پہلے اس کی شادی ہوئی اور بیوی آتے ہی بیمار رہنے لگی تھی۔ اس نے تحریک میں حصہ لینے کے لئے معافی مانگ لی۔ وہ نوکری سے برخاست تو نہیں ہوا لیکن اس کا تبادلہ لکھنؤ ہوگیا۔

کیول چند لکھنؤ میں رہنے کے لائق جگہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے شہر بھر کی سڑکوں، بازاروں، گلیوں، محلوں اور احاطوں سے واقف ہوگیا۔ شہر کے مختلف درجے کی بستیوں کی زندگی اس نے دیکھی سول لائنز کی کوٹھیوں، بنگلوں کے علاقے میں جگہ ڈھونڈنا بے کار تھا۔ وہ بڑے لوگوں کی جگہ تھی۔ وہ شہر کے تنگ اور بے رونق علاقوں میں، جہاں لوگ مکان پر مکان بنا کر آسمان میں ٹنگے پنجروں میں رہتے تھے، اپنے رہنے کی جگہ ڈھونڈ رہا تھا۔ کیول چند ایسی جگہ بھی رہنے کے لئے تیار نہ تھا، جہاں شہر بھر کا میل دھونے والے دھوبی مہتر یا بیکانیری موچی سڑک کے کنارے دھواں بھری کوٹھری میں

زندگی کے سب کام پورے کرتے رہتے ہیں۔ جہاں مکان کی دہلیز کے باہر نالی میں غلاظت سے فارغ ہوتے ہیں اور دہلیز کے اندر چولہے پر پیٹ بھرنے کے لئے اناج پکتا رہتا ہے اور وہیں چولہے میں اپلوں سے اٹھتے دھوئیں میں، کچے چمڑے اور ریڑھ کی بدبو میں انسان کی زندگی کی تخلیق اور اختتام کے عمل پورے ہوتے رہتے ہیں۔ ایسے لوگ شہر کا گندا آنچل چھوڑ کر اس لئے نہیں جاسکتے کہ شہر کے مالک خوشحال لوگوں کو اپنی خدمت کرانے کے لئے ان کی ضرورت رہتی ہے۔

کیول چند کو ان لوگوں کا ایسی غیر انسانی زندگی قبول کرنے پر غصہ آیا--- یہ لوگ ایسی زندگی کیوں قبول کرتے ہیں، کیوں ظالموں کی خدمت کرتے ہیں؟ جواب تھا۔ تم کیوں ایم۔ ای۔ ایس کی نوکری کرتے ہو! یہ لوگ کریں کیا؟ کھائیں کیا؟ ان کے لئے یہی دستور ہے۔ کیول چند کے لئے بھی دستور تھا کہ اسے دفتر میں بیٹھ کر ڈرافٹمینی کرنی ہوگی اور لکھنؤ شہر میں ہی رہنا ہوگا۔

مکان نہ ملنے کی پریشانی نے اس کے دل میں مکانوں کا حسب خواہش کرایہ وصول کرنے والوں کے لئے اور جب دوسروں کو سر چھپانے کی جگہ بھی نہیں مل رہی ہو، تب ہر کام کے لئے ایک ایک پورا کمرہ رکھنے والوں کے لئے اور اپنے مکانوں کے سامنے بڑے بڑے باغ لگا کر جگہ گھیرنے والوں کے لئے ایک تلخی بھردی۔ جہاں بھی رہنے کے لائق جگہ ملتی، کرایہ مانگا جاتا--- پچاس ساٹھ روپئے۔ وہ تھی کرائے کی لاٹھی، جس کے بل پر اسے خالی جگہ میں بھی گھسنے نہیں دیا جارہا تھا۔

پنڈت شورام کے بیٹے کا تبادلہ مغل سرائے میں ہوگیا تھا۔ وہاں کوارٹر مل جانے کی وجہ سے پنڈت جی کا بیٹا بیوی کو بھی لے گیا تھا۔ اس لئے اوپر ٹین کی چھت والی برساتی جو پہلے بیٹے اور بہو کے سونے کی جگہ تھی اب خالی ہوگئی تھی۔ پنڈت جی نے دو مہینے کا کرایہ پیشگی لے کر وہ برساتی کیول چند کو تیس روپیے پر دے دی۔

کیول چند اس برساتی میں اپنا بستر اور بکس رکھنے کے بعد ایک چارپائی خرید کر لوٹا ہی تھا کہ اسے گلی میں ایرے غیرے لوگوں کو بسالینے کی مخالفت کا شور سنائی دیا۔

پنڈت جی نے برساتی سے تقریباً آٹھ دس ہاتھ جگہ چھوڑ کر تین منزلہ مکان کی دیوار پکی اینٹوں کی کھڑی کی تھی۔ شاید مخالفت کی وجہ سے ہی اس دیوار میں کھڑکیاں

نہیں بنائی جا سکی تھیں۔ اس اونچے مکان کی دیوار میں کھڑکیاں بننے سے برابر کے مکانوں کی بے پردگی ہوتی تھی۔ ایسی ہی باتوں سے پڑوس میں تنازعہ پیدا ہو جاتا ہے۔

اس تین منزلہ مکان کی تیسری منزلہ کے چھجے سے ایک بھاری جسم والی بوڑھی عورت منہ اور آنکھیں پھیلا کر اور ہاتھ بڑھا بڑھا کر اونچی آواز میں پکار رہی تھی۔۔۔

"آگ لگے ایسی کمائی میں! آگ لگے ایسے لالچ میں! ان لوگوں کی اینٹ سے اینٹ بج جائے۔ محلے میں سانڈ لا کر بسا رہے ہیں۔ محلے کی بہو بیٹیوں کے پردے اور عزت کا کوئی خیال نہیں۔"

تنگ گلی کے دوسری طرف کے مکان کی کھڑکی سے بھی ایک سانولی، دبلی سی بوڑھی عورت بول اٹھی۔۔ "نہ جانیں، نہ بوجھیں، گلی میں لونڈے بھرے جا رہے ہیں۔ اپنی بہو کو تو کمائی کے لئے پردیس بھیج دیا، دوسروں کی آفت کر رہے ہیں۔ سیدھا کھانے والے کی ذات کو عزت کا کیا خیال۔ پیسے پر جان دیتے ہیں۔ آگ لگے ایسے لالچ میں!" اس احتجاج کے بعد عورت نے گلی میں برساتی کے سامنے کھلنے والی اپنی کھڑکیاں زور سے بند کر دیں۔ بائیں طرف کے مکان سے بھی احتجاج ہو رہا تھا۔

بھگوان کے اجلاس میں ہو رہی اس فریاد پر یک طرفہ ڈگری ہو جانے کے اندیشے سے پنڈتانی بھی اپنے دروازے پر آ کر کھڑی ہو گئیں۔ بے لباس سینے پر ایک ہاتھ سے دھوتی کا آنچل کھینچے، دوسری بانہہ پھیلا کر پنڈتانی دہائی دینے لگی۔۔ "اپنے مکانوں میں چار چار کرایے دار بھر رکھے ہیں۔ دوسروں کو دو پیسہ آتا دیکھ کر جن کے کلیجے میں آگ لگ گئی ہے، ان سے بھگوان سمجھے۔ ان ہی کرموں سے تو جوانی میں رانڈ ہوئی۔ دوسروں کا پیسہ کھا کر جو بھاگ گیا ہے، وہ کبھی زندہ نہ لوٹے۔۔۔"

پنڈتانی نے تین منزلہ مکان کی مالک کھترانی کی جوانی کی بدکاریوں کا بھی پرچار شروع کر دیا۔

سامنے گلی پار کے چھجے میں ایک بہو کچھ ادھیڑ بن کر رہی تھی۔ اس نے اٹھ کر پردے کے لئے جنگلے پر ایک چادر ڈال لی۔

بائیں طرف کے مکان سے ایک بابو ہاتھ میں چھتری لیے دفتر جانے کی پوشاک میں نکلے۔ پان کا بیڑا بھرے منہ سے انہوں نے جھگڑا کرتی عورتوں کو اطمینان دلایا۔۔

"پنڈت جی کو لوٹنے دو۔ سب پوچھ تاچھ ہو جائے گی۔ گرہستوں کے محلے میں ایرے غیرے لوگوں کا بسنا کیسے ہو سکتا ہے؟ اکیلے رہنے والوں کے لئے بازار میں بیٹھکیں ہیں' ہوٹل ہیں۔"

کیول چند کو خود دفتر جانے کی جلدی تھی۔ اس مخالفت سے اس کے ہاتھ پاؤں الجھ رہے تھے۔ وہ کچھ نہ بولا۔ کوٹھری میں تالا لگاکر سر جھکائے گلی سے جارہا تھا۔ کھترانی نے اس کی طرف اشارہ کرکے مخالفت میں آواز اونچی کردی۔

شام کے وقت کیول چند' مصیبت کو جتنی دیر ہوسکے ٹالنے کے خیال سے' دیر سے مکان پر واپس آیا۔ اپنی شرافت کا یقین دلانے کے لئے' وہ گلی میں آتے وقت آنکھیں نیچی کیے ہوئے تھا۔ اس گھر سے اس گھر میں آتی جاتی' شکستہ اور میلی دھوتیوں میں ملبوس اور نظر کی پہنچ سے دور عورتوں کو پردہ کر لینے کے لئے ہوشیار کرتے جانے کے لئے' وہ کھانستا بھی جارہا تھا۔

کھترانی اب بھی انتظار میں چھجے پر کھڑی تھی۔ کیول کو دیکھتے ہی اس نے صبح سے ملتوی جنگ کی للکار سے گلی میں گونج پیدا کردی۔

اس للکار سے پنڈتانی بھی باہر نکل آئی اور کھترانی کی بدکاریوں کا تذکرہ کرکے اس کی تاریخ سنانے لگی۔ کیول چند اردو اور کتابی ہندی جانتا تھا۔ لکھنؤ کی علاقائی زبان سمجھنے میں اسے الجھن ہورہی تھی' لیکن اس پہلی ہی شام کو اسے اپنے پڑوسیوں کا تعارف حاصل ہوتا جارہا تھا۔

اندھیرا ہوجانے پر اور سب مکانوں میں روشنی ہوجانے پر کیول نے بھی ایک موم بتی جلادی۔ عورتوں کی لڑائی کا شور کچھ دیر پہلے دب چکا تھا۔ نیچے گلی سے آواز آئی۔۔ "اے نئے بابو صاحب! ذرا نیچے تشریف لانے کی تکلیف گوارا کیجئے۔"

گلی میں مردوں کا ایک نمائندہ گروپ موجود تھا۔ کوئی سوال کیے بغیر ان لوگوں نے گرہستی والوں کے محلے میں اکیلے مرد کے آکر رہنے کی نامناسب حرکت پر اپنی اپنی رائے ظاہر کی۔ کیول چند پنڈت جی سے اپنے خاندان کو لانے کی بات کرچکا تھا' وہی اطمینان اس نے ان لوگوں کو بھی دلایا کہ تین چار دن کی چھٹی ملتے ہی وہ خاندان کو لے آئے گا۔ اس پر اس کی ذات پات' خاندان اور گھر کی پوچھ تاچھ ہوئی اور نمائندہ

گروپ، اسے سب کی عزت کا خیال کر کے جلدی ہی بیوی اور بچے کو لے آنے کی نصیحت دے کر چلا گیا۔

کیول نے چارپائی پر لیٹ کر چین کی سانس لی۔ خاندان کو لے آنے کا اطمینان تو اس نے دلادیا تھا لیکن دو چارپائیوں کے رقبے کے برابر جگہ میں پورے خاندان کو کیسے بیٹھائے اور چھوڑ آئے تو کیسے؟ چولھا کہاں بنائے گا؟ زینے پر سے پانی ڈھوتے ڈھوتے اس کی زندگی تباہ ہوجائے گی۔

مردوں کے مطمئن ہوجانے پر بھی خواتین کی طرف سے مخالفت کی تحریک پوری طرح نہیں دبی تھی۔ خاص طور پر تین منزلہ مکان کے اوپر والے چھجے سے۔ نتیجہ یہ کہ عموماً عورتوں میں جھگڑا ہوتا اور گلی کے تاریخی راجوں سے متعلق کیول کی معلومات میں اضافہ ہوجاتا۔ اسے معلوم ہوگیا کہ پنڈت کے مکان سے لگا تین منزلہ مکان بیوہ کھترانی کا ہے۔ اس میں دو کرایے دار ہیں۔ کھترانی دو بچوں کی پیدائش کے بعد ہی بیس اکیس برس کی عمر میں بیوہ ہوگئی تھی۔ اس کی لڑکی مرچکی تھی۔ لڑکا کم عمر میں ہی سٹہ کھیلنے لگا تھا۔ بیاہ ہوتے ہی کہیں غلے کے سٹے میں بہت بڑا گھاٹا کھا بیٹھا اور لینداروں کے ڈر سے بھاگ گیا تھا۔ کھترانی کے دو اور بھی مکان تھے۔ لینداروں کو اس نے انگوٹھا دکھا دیا تھا۔ چپ چاپ گہنے رکھ کر روپیہ سود پر دیتی تھی۔ اس کی بہو بہت خوبصورت ہے۔ وہ ساس سے دو قدم آگے ہے۔ ساس اسے کسی کے یہاں آنے جانے نہیں دیتی۔ خود شہر میں گشت کرتی ہے اور بہو کو گھر میں چھوڑ کر تالا لگاکر جاتی ہے۔

مخالفت کا پہلا ابال بیٹھ گیا۔ کیول چند کے آجانے سے پڑوس کے مکانوں میں موجود نسوانی حسن کے تحفظ سے متعلق تشویش کا جو کہرام اٹھ کھڑا ہوا تھا، اس نے کیول کے دل میں واقعی اشتیاق پیدا کردیا۔ اب گلی کے لوگ کیول کو برداشت کرنے لگے تھے۔ پڑوسی اسے اپنے کارڈ پر راشن اور چینی لا دینے کے لئے کہنے لگے۔ دوسری قسم کی مدد بھی لینے لگے۔ وہ کچھ تانک جھانک بھی کرنے لگا۔ سامنے کے مکان کی کھڑکیاں اب اتنی سختی سے بند نہیں رہتی تھیں۔ کھترانی کے مکان میں عورتیں چھجے پر بھیگی دھوتیاں سکھانے کے لئے پھیلانے آتیں تو کیول کی کھڑکی کی طرف بھی نظر ڈال

لیتیں- بیچ کی منزل کی رہنے والی بنگالن آنچل ادھر ادھر ہو جانے پر بھی بلا جھجک چھجے پر بیٹھی ترکاری چھیلتی رہتی- یوں دکھائی دے جانے والی عورتیں عموماً پیلی' سانولی اور مرجھائی ہوئی سی تھیں- البتہ سامنے کے مکان میں رہنے والی بہو کی آنکھیں بہت نشیلی تھیں اور اس کا چہرہ بھی خاصہ نمکین تھا- کیول کو ادھر ادھر دیکھنے کی خاص خواہش نہیں ہوتی تھی- کہیں نظر اٹھ جانے پر وہ بے نیازی سے مسکرا دیتا--- کیا اسی کے لئے اتنا شور تھا-

گلی کے لوگ کیول چند کو برداشت کرنے لگے تھے لیکن ادھر کھترانی کی مخالفت ختم نہیں ہو رہی تھی- وہ پڑوس کی اور اپنے کرایہ داروں کی بہوؤں کو 'پنجابی' کی تشویش انگیز موجودگی سے ہوشیار کرتی رہتی تھی- اس کی اپنی بہو اگر لمحہ بھر کو بھی چھجے میں ٹھہر جاتی تو کھترانی ہاتھ سے گری کانسے کی تھالی کی طرح اتنے زور سے جھلا اٹھتی کہ کیول چند کی نظر چھجے کی طرف اٹھے بغیر نہ رہتی- نظر ادھر اٹھتی تھی تو ٹک بھی جاتی تھی- بہو کی نظر سے اوجھل ہو جانے پر کیول کے دل سے ایک گہری سانس اٹھتی تھی' جیسے گوشت میں سے کانٹا کھینچ لیے جانے پر ایک درد سا ہوتا ہے-

کیول چند شاعر نہیں تھا- کھترانی کی بہو بچھی کو دیکھ کر بادلوں کے بیچ سے جھانکتے چاند' اوس سے دھلے چمپا کے پھول یا تالاب میں لہلہاتے کنول کی تمثیل یاد نہیں آئی- اسے ایسا معلوم ہوا کہ جوہری کی دکان میں ڈبیہ کھل جانے پر روئی میں لپٹے کسی موتی پر اس کی نظر پڑ گئی ہو- بچھی کا رنگ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کیلے کا پیڑ پھاڑ کر اندر سے سفید چکنا ڈنڈا نکال لیا ہو- اس کی بڑی بڑی کالی آنکھیں چہرے پر خوب چمکتی تھیں اور ماتھے پر لال بندیا ایسی معلوم ہوتی تھیں جیسے کسی نے ہاتھی دانت میں لال رنگ جڑ دیا ہو- وہ چھجے پر آتی تو اڑتی اڑتی ایک نظر کیول چند کی برساتی کی کھڑکی کے اندر بھی ڈال لیتی- کیول کو بیٹھا دیکھتی تو گھبرا کر بھاگتی نہیں تھی-

کیول چند کے اس گلی میں آجانے پر جو مخالفت ہوئی تھی' اس کے پیش نظر کسی نامناسب حرکت کرنے سے احتراز قدرتی تھا' اوپر سے کھترانی کے گھر! یہ شیرنی کی ماند میں جا کر اس کے بچے پر ہاتھ ڈالنا تھا لیکن اس کی آنکھ کھترائی کے چھجے کی طرف بے اختیار اٹھ جاتی اور بہو کو وہاں پا کر ٹکی رہتی- دو ہفتے ہی بیتے تھے کہ بچھی سے اس کی

آنکھ لڑگئی۔ بچھی نے دیکھا اور کھڑی رہی۔ تین چار دن بعد پھر آنکھ ملنے پر بچھی مسکرا دی۔ اس وقت کیول یہ نہیں سمجھ پایا کہ پھول برس گئے یا موتی بکھر گئے۔ وہ بے چین ہو کر اپنی چارپائی سے اچھل پڑا۔۔۔۔ نتیجے کی فکر نہ کرکے بچھی کی طرف دیکھنے لگا۔ قریب پہنچ سکنے کے لئے وہ کچھ بھی کر گذرنے کو تیار ہوگیا۔

بچھی عموماً بنائی کڑھائی کا کام لے کر چھجے میں کیول کی برساتی کی طرف آکر بیٹھتی۔ گز بھر اونچے لوہے کے ڈھلے ہوئے چھجے کی آڑ میں ہونے کے سبب وہ سامنے کے مکانوں کی کھڑکیوں سے دکھائی نہیں دیتی تھی۔ چھجے کے سوراخوں پر آنکھ لگائے وہ کیول کی طرف دیکھتی رہتی۔ سوراخوں کے قریب کیول کو صرف یہ پتہ ہوتا تھا کہ بچھی جنگلے کے ساتھ اس کے سامنے بیٹھی ہے۔ بچھی کبھی اوپر کی کھلی چھت پر جاکر دیوار پر سے کچھ نیچے پھینکنے کے بہانے جھانک کر، مسکراہٹ کی ایک جھلک کیول کو دکھا جاتی۔ وہ تڑپ کر رہ جاتا۔

کیول کا دل چاہتا کہ اپنی برساتی میں ہی بیٹھا رہے، دفتر نہ جائے۔ بچھی کو سامنے مسکراتے دیکھ کر اس کا دل، اس طرح بے قرار ہوجاتا تھا کہ سر پھوٹنے کی فکر نہ کرکے سامنے کے چھجے پر چڑھ جانے کے لئے بے قرار ہوجاتا۔ اس کی آنکھوں نے دیوار کی اینٹیں گن کر حساب لگا لیا تھا کہ اس کی چھت پر سے اوپر اٹھنے والی، کھترانی کے مکان کی دوسری منزل بارہ فٹ اونچی ہے اور تیسری منزل دس فٹ اونچی ہے۔ چھجے کی اونچائی دو فٹ ہوگی۔ چھ فٹ تو وہ چارپائی رکھ کر چڑھ جائے گا۔ باقی چھ فٹ کیا ہے!۔۔۔۔ دفتر میں ڈرافٹمینی کرتے وقت، کھترانی کے چھجے کی بناوٹ ہی آنکھوں کے سامنے ناچتی دکھائی دیتی۔

نومبر کا مہینہ جارہا تھا۔ اوپر ٹین کی چھت ہونے کی وجہ سے کیول کی برساتی رات میں خوب ٹھنڈی ہوجاتی تھی۔ پڑوس میں گلیوں میں شادیاں ہورہی تھیں۔ سردی سے نیند نہ آنے پر وہ عورتوں کے گانے سنتا رہتا اور کچھ سمجھنے پر مسکرا دیتا۔ وہ لکھنؤ آیا تھا تو گرمی کا موسم تھا۔ بوجھ سے بچنے کے لئے وہ لحاف ساتھ نہیں لایا تھا۔ دن میں تو اسے سردی معلوم نہیں ہوتی تھی لیکن رات میں سردی کی وجہ سے نیند ٹوٹ جاتی تھی۔ اس وقت سوچتا۔۔۔ چھجے پر سے چڑھ کر بچھی کے پاس پہنچ جائے۔ اتوار

کی چھٹی والے دن وہ دوپہر میں ٹین کی چھت سے آتی گرمی میں لیٹ کر لگاتار پچھی کے چھجے کی طرف دیکھتا رہتا۔ پچھی بھی لال اون اور سلائیاں لیے چھجے میں آکر بیٹھ جاتی اور تھوڑی تھوڑی دیر میں اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیتی تھی۔

کیول سوچ رہا تھا —— موٹی (غیر حاضری میں کھترانی کو گلی کے لوگ اسی نام سے پکارتے تھے) اس وقت چادر اوڑھ کر شہر گھومنے گئی ہوگی یا کسی کے یہاں شادی بیاہ میں گئی ہوگی۔ تبھی پچھی بے دھڑک ہو کر اتنی دیر سے بیٹھی ہے۔ زینے میں تالا لگا کر گئی ہوگی۔ وہ چھجے پر جاسکتا تھا لیکن دوپہر کا وقت تھا' پڑوس کے سب لوگ دیکھ سکتے تھے۔ پچھی سے پہلے بات ہو جائے تب تو... بات کیسے ہو؟

کیول نے پچھی کو دور سے ہی کئی بار دیکھا تھا۔ بات کرنے کا سوال ہی نہیں تھا لیکن پچھی کے پیار میں اس کا جسم اور دماغ تھکا جا رہا تھا۔ وہ اس پیار کے لئے خطرہ اٹھانے کو بھی تیار تھا۔ وہ پیار کیا تھا؟ عورت مرد کا پیار' جس کی وجہ صرف بشری فطرت ہوتی ہے۔

منگل کو دفتر سے لوٹتے وقت وہ کہیں کچھ دیر کے لئے رک گیا تھا۔ ہوٹل سے کھانا کھا کر غروب آفتاب کے وقت گلی میں لوٹ رہا تھا کہ اس نے کھترانی اور اس کی بہو کو چادریں اوڑھے' ہاتھوں میں پرساد کے دونے لیے گھر سے نکلتے دیکھا۔ پچھی سے اس کی نظریں ملی۔ اس نے مسکرائے بغیر نظر نیچی کر لی۔ دبلی پتلی ہاتھی دانت کی مورت پچھی کیول کو دور سے جیسی دکھائی دیتی تھی' قریب آنے پر اس سے بھی دس گنا خوبصورت لگی' جیسے پچھی کے جسم کی خوشبو سانس کے ذریعہ اس کے دل میں سما گئی ہو' اس کا دوران خون تیز ہو گیا۔

کیول چپ چاپ اپنی برساتی میں چلا گیا۔ سوچا ساس بہو امین آباد میں ہنومان جی کے مندر جا رہی ہیں۔ وہ لوٹ آیا اور تیز قدموں سے امین آباد کی طرف چل دیا۔ بازار میں کچھ ہی دور جا کر اس کی آنکھوں نے ان دونوں کو ڈھونڈ لیا۔ انہیں نگاہ میں رکھے رکھے وہ بازار کی دوسری طرف چلنے لگا۔

مندر کے باہر پرساد اور پھولوں کی دکانوں پر بڑی بھیڑ تھی۔ ساس نے بہو کو دھکوں سے بچنے کے لئے ایک طرف کھڑا کر دیا اور پھول لینے کے لئے بھیڑ میں گھس

گئی۔ بھو ماتھے پر چار انگلی بھر آنچل اوڑھے، مہندی سے رنگی چھپئی ہتھیلی پر پرساد کا دونا رکھے ایک طرف کھڑی رہی۔ اس کی بڑی آنکھیں بھیڑ کا جائزہ لے رہی تھیں۔

کیول ساس کو تاڑنے کے لئے آنکھیں بھیڑ کی طرف رکھے بچھی کے قریب آگیا۔

بھو نے ہلکے سے ہونٹ دبالیے۔

کیول آہستہ سے بولا—— "پیار کرتی ہو؟"

بچھی نے آنکھ جھپک کر تائید کی۔

"ملوگی نہیں؟"

بھو نے پھر آنکھ جھپکی۔

"کب؟"

"آج رات اماں گیتوں میں جائیں گی۔"

"آئیں؟"

"چھجے سے آجائیں؟"

بھو نے کہہ دیا—— "کرایے دار جلدی سوجاتے ہیں۔"

کیول ساس کے آنے سے پہلے ٹل گیا۔

واپس آکر کیول چند کشمکش میں پڑگیا۔ کھترانی کا زینہ اس نے دیکھا نہیں تھا اور چھجے سے چڑھنے میں گرنے کا ڈر تھا۔ لوٹتے وقت اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کھترانی کے زینے کا جائزہ لیا اور چارپائی پر بیٹھ کر چھجے کی بناوٹ اور دیوار کے ساتھ لگے پانی کے نل پر لگی کیلوں کا فاصلہ دیکھتا رہا۔ اس کی نظر برابر اسی طرف لگی تھی۔ بچھی چھجے پر دکھائی دی اور اس نے سر پر آنچل سنبھالنے کے بہانے ہاتھ دکھا کر ابھی ٹھہرنے کا اشارہ کردیا۔ کیول خود بھی دوسری منزل میں اندھیرا ہوجانے کے انتظار میں تھا۔ ان کمروں کے اندر سے چھجے پر روشنی آرہی تھی۔ سامنے کے مکانوں کی کھڑکیاں سردی کی وجہ سے دھندلی تھیں۔ کیول چند باہر اندھیری رات کے پالے میں بے چینی سے گھوم گھوم کر انتظار کر رہا تھا۔

گھنٹہ گھر سے نو کا گھنٹہ بجنے پر دوسری منزل کی بتی بجھ گئی۔ کیول نے پندرہ منٹ

اور انتظار کیا۔ اس دوران پچھی کئی بار چھجے پر چکر لگا چکی تھی۔

کیول سوا نو بجے چارپائی سے اٹھ کر باہر آیا۔ چارپائی کھترانی کے مکان کی دیوار سے لگا کر وہ چڑھنے ہی والا تھا کہ اوپر سے کچھ اس کے سر پر ٹپکا۔ کیول نے اوپر دیکھا۔ اندھیرے میں پچھی کے گورے ہاتھ نے ابھی اور ٹھہرنے کا اشارہ کردیا۔

کیول نے بغیر آہٹ کیے چارپائی اٹھالی' اور اندر آکر چھجے کی طرف دیکھتے ہوئے انتظار کرنے لگا۔ گھنٹہ گھر سے ساڑے نو کی ٹن' سنائی دی۔ اس وقت پچھی نے اشارہ کیا۔۔ آجاؤ!

کیول چند کی چارپائی دوسری منزل کی اونچائی میں آدھے سے کچھ نیچے پہنچی لیکن وہ دیوار کے سہارے چارپائی کی اوپر کی پٹی پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہوگیا۔ بانہیں اٹھاکر تیسری منزل کے جنگلے کے نیچے سوراخوں میں انگلیاں پھنسا لیں اور جسم کو بازوؤں کی طاقت سے اوپر اٹھایا۔ لوہے کے ایک کھمبے کی منڈیر پر پاؤں ٹکالیا۔ اتنا سہارا پاکر اس کا دوسرا ہاتھ جنگلے کے سرے پر پہنچ گیا۔ وہ اچک کر جنگلے کے اندر جاپہنچا۔ پچھی اسے بازو سے تھام کر فوراً اندر لے گئی۔

کیول کو پسینہ آگیا تھا اور اس کا کلیجہ دھک دھک کر رہا تھا۔ سانس دھنکی کی طرح چل رہی تھی لیکن اس سے بھی زیادہ شدید تھی اس کی چاہت۔ اس نے پچھی کو بانہوں میں اتنے زور سے سمیٹ لیا جیسے اسے اپنے ہی جسم میں سمالے گا۔ وہ اس کے ہونٹوں کو کھا جانا چاہتا تھا۔۔۔

اچانک زینے کے دروازے کی سانکل کھنکنا کر گرنے کی آہٹ ہوئی اور ساتھ ہی کواڑ کھل گیا۔ دروازہ کھلنے سے زینے کی بتی کی روشنی اندر پھیل گئی۔ ساس نے اندر قدم رکھا اور آنکھیں اور منہ پھیلائے' ہکی بکی کھڑی رہ گئی۔

ساس نے زور سے چلانے کے لئے سینے میں سانس بھری۔۔۔۔

کیول کی بانہوں میں کٹی پچھی شاید بے سدھ ہوگئی تھی۔ کیول نے اسے ویسے ہی فرش پر گرجانے دیا۔ اپنی حفاظت کے لئے وہ سامنے کھڑی' پکارنے کے لئے تیار ساس پر ٹوٹ پڑا۔ پکارنے کے لئے کھلے ساس کے منہ سے آواز نکلنے سے پہلے ہی کیول نے ساس کے بھرپور جسم کو بانہوں میں لے کر قریب پڑے پلنگ پر ڈال کر اوپر

سے دبا لیا۔۔۔۔

کیول نے ساس کا گلا نہیں دبایا لیکن حالت ایسی تھی کہ ساس چلا نہیں سکتی تھی۔ ساس نے دبی آواز میں مزاحمت کی۔ "نہیں، ہیں، کیا کرتے ہو!"

کیول کے لئے مزاحمت کو قبول کرنا جینے مرنے کا سوال تھا۔

بہو ہوش سنبھالتے ہی کمرے سے بھاگ گئی تھی۔

دس منٹ بعد جب ساس نے کیول کی بانہوں سے نجات حاصل کی تو کیول کے گال پر ٹھنکا دے کر مسکرا کر شکایت کی۔۔ "بڑے ویسے ہو تم!"

ساس نے پوچھا۔۔ "زینے میں تالا تھا، آئے کدھر سے؟"

کیول نے بتایا۔ ڈر سے ساس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس کے منہ سے نکلا۔۔ "ہائے دیا!"

ساس کیول کو زینے کے راستے سے نیچے پہنچا دینے کو تیار تھی لیکن کیول اپنی برساتی کے زینے میں اندر سے سانکل لگا کر آیا تھا۔ ساس نے اسے اپنی دھوتی دی کہ چھجے کے کھمبے میں باندھ کر آہستہ سے نیچے اتر جائے۔

اب کھترانی بہو کو چھجے پر دیکھ کر جھنجلاتی تو بہت آہستہ سے، اور اکثر خود چھجے میں آکر بیٹھ جاتی۔ کبھی وہ آتے جاتے کیول کو گلی سے پکار لیتی۔۔ "بھئے، تمہارے دفتر میں چینی راشن کا کارڈ ملتا ہوگا۔ بھئے، چینی کی بڑی کلت ہے۔ تم تو ہوٹل میں کھا لیتے ہوگے۔ گھر بار والوں کی مصیبت ہے۔" کبھی پکار لیتی، "بھئے، دفتر سے آرہے ہو؟ چائے تیار ہے۔ ایک گلاس پی لو، بڑا جاڑا پڑ رہا ہے۔" کبھی کیول کوئی چیز مانگنے یا پہنچانے خود بھی چلا جاتا۔ وہ ایسے وقت کی تلاش میں رہتا جب ساس نہ ہو۔ کیول گلی کے لئے فائدہ مند ثابت ہو رہا تھا۔ وہ اپنے خاندان کو انبالہ سے نہیں لا سکا لیکن اب اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہوتی تھی۔

۴۵-۱۹۴۴ میں کلکتہ پر جاپانیوں کے بم پڑنے کے خطرے میں بڑی بڑی کمپنیوں کے دفتر یوپی میں آگئے تھے۔ بنگالیوں نے آکر لکھنؤ، الہ آباد، بنارس، آگرہ میں جو بھی جیسی بھی جگہ ملی، لے لی۔ کرائے ڈیڑھ۔ دو گنا تب ہی سے ہو گئے تھے اور پھر بڑھتے

ہی گئے کھترانی نے بھی اپنا گھر بار اوپر کی منزل میں سمیٹ کر دوسری منزل مکرجی بابو کو تیس روپے ماہ وار پر اٹھادی تھی۔ ۴۵ء کے آخر اور جنوری ۴۶ء میں کلکتہ میں سکون ہوجانے پر بنگالی لوگ واپس جانے لگے۔ مکرجی بابو بھی واپس چلے گئے۔

کیول کو گلی میں روک کر کھترانی نے کہا۔۔۔ "بیٹے، اس ٹین کی چھت کے نیچے کیسے گذرتی ہوگی۔ اوپر سے گرمی آرہی ہے۔ چاہو تو مکرجی بابو کی جگہ آجاؤ۔ آرام سے تو رہ پاؤ گے۔"

کیول خوشی سے مکرجی کی جگہ چلا گیا۔

گلی میں پھر سے کہرام مچ گیا۔ پنڈتانی نے دروازے میں کھڑے ہوکر غریبوں کے پیٹ پر لات مارنے والوں کو بھیرو بابا کو سونپا۔ کھترانی نے ٹین کے پنجرے میں پھنسا کر لوگوں کو لوٹنے والوں کو گالیاں دیں۔۔ "اس نے خصم بسا لیا تھا، جارہا ہے تو اسے آگ لگ رہی ہے! تیرا خریدا ہوا غلام ہے کیا!"

کیول نے گلی کے لوگوں سے اصول کی بات کی۔۔ اتنی جگہ میں وہ بال بچوں کو کیسے لاتا؟ اب ڈھنگ کی جگہ ملی ہے تو جاکر ان لوگوں کو لے آئے گا۔

بنگالی لوگ تو ملیچھ ہوتے ہیں، گوشت اور مچھلی کھانے والے۔ کیول اروڑا تھا۔ اروڑا اور کھتری میں کیا فرق۔ ظاہر میں کیول چند کھترانی کا کرایے دار ہی تھا۔ لیکن اندرون خانہ اوپر کی دونوں منزلوں میں زیادہ فرق نہ رہا لیکن ساس بہو پر کڑی نظر رکھتی تھی۔ کبھی دھمکاتی کہ میکے بھیج دوں گی۔ پھر کہتی کہ اس کے گھر کے لوگ، بڑے ویسے ہیں، جو کچھ لے جائے گی سب وہیں رکھ لیں گے۔ کیول اور بہو کو کبھی کبھی اکیلے میں مسکرانے کا موقع ملتا۔ کیول کے لئے یہ بے مزہ محنت سہنے کا انعام تھا۔

برساتی میں رہنے کے دوران کیول چند گھر کے لئے کچھ بھی روپیہ نہیں بھیج سکا تھا۔ اس مہینے اس نے گھر سے آئے اذیت بھرے خط کے جواب میں اپنی آدھی تنخواہ بھیج دی۔ ہوٹل والے کو بھی کچھ نہ دے پایا۔ اگلے مہینے کرایہ دینے کی بجائے کھترانی سے دو سو اور ادھار لے کر قرضے اتارے، کچھ گھر بھیجا اور بھلا آدمی دکھائی دینے کے لئے ایک سوٹ سلوالیا۔

کیول کے پانچ مہینے موج میں کٹ گئے۔ کھترانی عموماً صبح شام اسے کھانے کے

لئے بھی بلا لیتی۔۔ "بھیّے' بازار کا کھانا کیا اچھا لگتا ہوگا' یہیں کھالو۔" کھترانی کو بھی فائدہ تھا کہ کیول کے راشن کارڈ پر چیزیں آدھے داموں میں مل جاتی تھیں۔ قرض کے لئے اس نے کیول کو پریشان نہیں کیا۔ البتہ کبھی کبھی یاد دلا دیتی' "بھیّے' اب کی تنخواہ پر ہمیں دے دینا۔ ہمیں ضرورت ہے گی۔ تم جانتے ہو' حساب بھائی بھائی اور باپ بیٹے میں بھی ٹھیک ہوتا ہے۔"

شام کے وقت کیول کو پریشانی ہوتی۔ وہ بچھی سے بات کرنا چاہتا اور ساس اپنے بھاری بھرکم جسم کی آڑ میں بچھی کو چھپاکر ڈانٹ دیتی۔۔ "تو جاکر لیٹتی کیوں نہیں۔ پرائے مرد کے منہ لگتی ہے' منہ جلی۔"

چھ مہینے بیت گئے۔ کھترانی کی شفقت کیول کو مصیبت معلوم ہونے لگی۔ سوچتا۔۔ کہیں دوسری جگہ کمرہ لے لے۔ اسے محسوس ہوتا تھا' وہ بہت کمزور ہوتا جارہا ہے لیکن کرتا کیا؟ یہ اس کی مردانگی کو للکار تھی۔ رات نو دس بج جانے پر بھی اگر کھترانی سونے کے لئے اوپر نہ چلی جاتی تو وہ گھبرانے لگتا اور باہر چھجے پر جاکر کھڑا ہوجاتا۔ اپنی پرانی برساتی کی طرف دیکھ کر سوچتا۔۔ اس سے تو وہی اچھی تھی۔

کیول کو چھجے پر بہت دیر کھڑے دیکھ کر کھترانی منہ میں پان بھرے آہستہ سے پوچھتی۔۔ "بھیّے' اب سوؤگے نہیں؟"

کیول کا دل چاہتا تھا کہ چھجے سے دھوتی لٹکا کر اتر جائے' جیسے ایک بار جان پر کھیل کر چڑھ آنے پر واپس گیا تھا۔

جان پر کھیلنا' اب جان کا جنجال ہوگیا تھا۔ بچھی بھی اب ایسی لگنے لگی تھی جیسے خوبصورت چمکیلا سانپ ہو۔ وہ اس سے بھی کتراتا رہتا۔

دفتر جاتے اور لوٹتے وقت وہ روزانہ سوچتا۔۔۔ اگر وہ اپنے بستر اور بکس کے لئے واپس نہ جائے تو کیا ہے؟ بستر اور بکس کی قیمت کھترانی کے قرضے سے زیادہ نہیں تھی۔

لیکن اب گلی میں اس کی حالت دوسری تھی۔ لوگ اسے شک اور مخالفت کی نظر سے نہیں بلکہ احترام اور اعتماد سے دیکھتے تھے۔ سلیقے سے پہنے اس کے سوٹ کی وجہ سے دفتروں کے بابو لوگ اس سے اپنے پن اور برابری کا سلوک کرتے تھے۔ یہ

سب چھوڑ کر وہ قرض کے ڈر سے بھاگنے کی ذلیل حرکت کرے؟ چور کی طرح گلی گلی چھپتا، مارا مارا پھرے؟...

اس کا جسم اور دل مایوس ہوتا جارہا تھا۔ کمر میں درد رہتا تھا لیکن وہ گلی میں چھائی ہوئی اپنی سفید پوشی کی عزت کے بوجھ کو نباہے جارہا تھا....

دھرم رکشا

پروفیسر برہم برت نے جس زمانے میں ایم ایس سی پاس کیا تھا' اس زمانے میں اس طرح کی کامیابی حاصل کرنے والوں کی تعداد بہت کم تھی۔ اگر وہ چاہتے تو گورنمنٹ کالج میں پروفیسر بن سکتے تھے یا کوئی دوسری اونچی نوکری مل سکتی تھی لیکن یہ بات انہوں نے سوچی بھی نہیں۔

برہم برت' وید کے علم کی تبلیغ کے ذریعہ دنیا کی بہبودی کا عزم لے کر وید پرچار سبھا' کے زندگی بھر کے لئے ممبر بن گئے۔ انہوں نے زندگی بھر پچھتر روپے ماہانہ تنخواہ پر ملک کو ویدوں کی تعلیم دینے کا مشکل عزم کرلیا تھا۔

برہم برت نے مغربی کیمیاوی سائنس (کیمسٹری) کا مطالعہ تو کیا تھا لیکن اس کی تعلیم کے مشکوک اثر سے وہ بچ رہے تھے۔ ان کو پورا یقین تھا کہ وہ سب عناصر' جو سچے علم سے جانے جاتے ہیں' ان سب کی بنیاد خدا ہے۔ تمام سچے علوم کی بنیاد اور ابتدائی معلومات کا ایک ذخیرہ وید ہے۔ مغربی علم طبیعات کی بنیاد پر دنیا کی ترقی کی امید انہیں ایک غیر یقینی مفروضے اور بے بنیاد خود اعتمادی کی طرح نظر آتی تھی' بالکل اس طرح جیسے کوئی چوہا سونٹھ کی ایک گانٹھ چرا کر سمجھے کہ اس نے پنساری کی دکان کھول لی ہے۔

برہم برت عموماً مشہور سائنس داں نیوٹن کی بات دہرایا کرتے تھے —— سمندر کے کنارے پر بہہ کر آئی' ایک خوبصورت چمک دار کوڑی کو ہی اٹھاکر ہم پھولے نہیں سماتے۔ ہم نہیں جانتے کہ خدا کی ازلی اور لازوال طاقتوں کے سمندر میں ایسے کتنے بیش قیمت جواہرات موجود ہیں۔ ان بیش قیمت جواہرات کو ہم اس کی مہربانی اور علم کے بغیر حاصل نہیں کرسکتے۔ پروفیسر برہم برت مغربی سائنس کے کھوکھلے پن اور اس کے مقابلے میں ویدک علم کی ٹھوس منطق' عملی روایات اور تسلسل کو ثابت کرنا چاہتے

تھے۔ ان کے خیال میں غیر ملکی غلامی' افلاس اور غریبی بھی ہندوستان کے ویدک تعلیم سے بے تعلق ہوجانے کے ہی نتائج تھے' ورنہ کسی زمانے میں یہ ملک برہمچریہ کی قوت سے وید گیان کا مالک تھا۔۔

(اس ملک میں پیدا ہونے والے لوگ دنیا کے بڑے معلم ہیں۔ دنیا بھر کے لوگ اس ملک میں پیدا ہوئے لوگوں سے دھرم اور کردار کی تعلیم پاتے ہیں۔)

برہم برت عموماً قدیم ہندوستان میں برہمچریہ کی طاقت سے حاصل ہونے والے گیان کے ثبوت میں اس شلوک کا حوالہ اپنی تقریر میں دے دیا کرتے تھے۔

پروفیسر برہم برت کی پیدائش کے وقت کی راشی کے خیال سے بچے کا نام نکالنے والا پروہت کچھ فطرت شناس رہا ہوگا۔ اس لئے بچے کا پہلا نام رکھا گیا تھا۔۔ رادھا رمن۔

رادھا رمن نے لاہور کے اینگلو ویدک' کالج میں پڑھتے وقت غیر ضبط نفس سے تباہی اور ضبط نفس سے طاقت کے راستے کو پہچانا۔ زندگی سے عیش وعشرت اور نفس پرستی کے سب نشان دور کردینے کے ساتھ ساتھ انہوں نے ماتا رادھا کے نام سے عیش وعشرت کا اشارہ کرنے والے غیر مہذب نام کو بھی ترک کردیا۔ اور برہم برت نام اختیار کرلیا۔ انہوں نے بورڈنگ کے اپنے کمرے کی دیوار پر موٹے الفاظ میں لکھ دیا تھا۔۔۔

(برہمچریہ ہی جیون ہے۔)

کالج کے دیگر طلباء کے برعکس برت کے سر پر تیل اور کنگھے سے سنواری ہوئی زلفیں نہیں رہتی تھیں۔ مشین سے برابر کٹے بالوں میں مضبوط گانٹھ سے کھڑی چوٹی ہی دکھائی دیتی تھی۔ بند گلے کا کوٹ' نہ تنگ نہ کھلے پائنچے کا پاجامہ اور دیسی جوتا۔ ان

کے اس بھیس میں ایم ایس سی تک تبدیلی نہیں آئی اور پروفیسر بن جانے پر بھی نہیں آئی۔ نوجوانوں کی سیرو تفریح کے خرچ سے پریشان ماں باپ' مثال کے طور پر' پروفیسر برہم برت کی سادگی کی تعریف کرتے تھے اور اسے قابل تقلید بتاتے تھے۔

برہم برت کے برہمچریہ کی اہمیت' نہ سمجھنے والے' بری صحبت میں پھنسے ماں باپ نے جہاں اور غلطیاں کی تھیں' وہاں انٹرینس کی پڑھائی کے دوران ہی لڑکے کی شادی بھی کردی تھی۔ برہمچریہ کی اہمیت سمجھنے والے برہم برت نے فیصلہ کرلیا کہ کالج کی چھٹیوں کے دوران جب وہ اپنے قصبے کے گھر میں جائیں تو ان کی نوجوان بیوی اپنے میکے چلی جایا کرے۔

خاموش فطرت نئی بہو اپنے شوہر کے اس نیک خیال کا مطلب اور اہمیت نہ سمجھ پانے پر بھی کچھ نہ کہہ سکی لیکن خود برہم برت کے ماں باپ اور بہو کے ماں باپ کو شہر کی ہوا سے بگڑتے لڑکے کا یہ ظلم قبول نہیں ہوا۔ پڑوس اور برادری کے لوگ بھی اس کے متعدد مطلب نکالنے لگے۔۔ لڑکے کو بہو پسند نہیں ہے یا شہر میں وہ دوسری شادی کرے گا' وغیرہ وغیرہ۔

برہم برت کو برے خیالات کی تائید کرنے والی اکثریت کے سامنے جھک جانا پڑا۔ پھر جیسا کہ شاستروں میں لکھا ہے' اس کا نتیجہ بھی نکلا۔ برہم برت ابھی بی ایس سی میں ہی تھے اور کالج کے رسالے میں برہمچریہ رکشا' پر مضمون لکھ رہے تھے' گھر سے آئے خط میں انہیں ایک خوبصورت بیٹی کے باپ بننے کی خبر ملی۔

اولاد کی پیدائش کی خبر برہم برت کا برت ٹوٹ جانے کا ثبوت بن گئی تھی۔ اس خبر سے انہیں بڑی ندامت ہوئی۔ قصور کی تلافی کے لئے انہوں نے بارہ سال تک بیوی کے قریب نہ جانے کا فیصلہ کرلیا۔ ایشور نے اپنا سندیش دنیا میں پھیلانے کے لئے انہیں جو طاقت دی تھی' وہ اسے برباد نہیں کرنا چاہتے تھے۔

لاہور' پنجاب میں مغربی تعلیم کا مرکز تھا۔ پروفیسر برہم برت کا یقین تھا کہ اس شہر کے عیش و عشرت اور سیرو تفریح کے ماحول میں برہمچریہ کے آدرش پر عمل ممکن نہیں تھا۔ انہوں نے ویاس ندی کے کنارے پر بسے ایک چھوٹے قصبے میں اینگلو ویدک ہائی اسکول' کی سربراہی قبول کرلی تھی۔ انہیں یقین تھا کہ شہروں سے دور نسبتاً سادہ

اور صحت بخش ماحول میں پروردہ لڑکوں کو صحیح ویدک تعلیم دے کر انہیں سادھو سنتوں سے حاصل شادہ ویدک گیان دین میں پھیلانے کے قابل بناسکیں گے۔ آریوں کے پاک مقصد۔۔۔ (یعنی پوری دنیا کو آریہ بناؤ) کی تکمیل زلفوں میں خوشبو دار تیل لگاکر اور سگریٹ پی کر پیلے پڑ جانے والے، فطرت سے بیزار شہر کے نوجوانوں سے نہیں ہوسکتی۔ اس مقصد میں مادر فطرت کی گود سے طاقت پانے والے، توانا، نفسانی خواہشات اور حرص وہوس کے خطرناک اثر سے بچے ہوئے دیہی نوجوان ہی کامیاب ہوسکتے ہیں۔

پروفیسر برہم برت نے قصبے سے دو میل دور، ندی کے کنارے بنے اینگلو ویدک اسکول، کے قریب ایک برہم چاری بورڈنگ، قائم کی تھی۔ اس بورڈنگ کے طلباء کو شہر اور بازار جانے کی اجازت نہیں تھی۔ بورڈنگ کے چاروں طرف اونچی دیوار بنوا کر اس پر کانچ کے ٹکڑے لگوا دیے گئے تھے۔ لڑکوں کو کھانا، کپڑا اور دیگر استعمال کی چیزیں سب کچھ برہمچریہ کے قواعد وضوابط کے مطابق ہی ملتی تھیں۔ برہم برت خود کڑی نظر رکھتے تھے کہ کسی بھی طرح کے شوق کے اثر کو وہاں جگہ نہ ملے۔

برہم برت ہر شام طلباء کو ہدایت دیتے تھے۔۔۔۔ "خدا نے یہ خوبصورت جسم اور صحت ہمیں اپنے فرمانوں اور قوانین کی تکمیل کرنے کے لئے دی ہے۔ برہمچریہ سے جسم کی طاقت اور عقل بڑھتی ہے۔ نفسانی خواہشات سے جسم اور عقل دونوں کا زوال ہوتا ہے۔ وہ پو پھٹتے ہی اٹھنے، رفع حاجت کے بعد غسل کرنے، ورزش وغیرہ کرنے کی ہدایات دیتے۔ وہ سمجھاتے تھے کہ برہمچریہ کے لئے ورزش کرنا اور ٹھنڈے پانی سے نہانا ضروری ہے۔ کوئی برا خیال آتے ہی گایتری منتر کا پاٹھ کرنا چاہیے۔ سگریٹ، کھٹائی، مرچ اور زیادہ مٹھائی برہمچریہ کے لئے نقصان دہ ہیں۔ ناشائستہ گیت اور تصویریں ضبط نفس میں رکاوٹ ڈالتی ہیں۔ ایسی خطا ہونے پر وہ طلباء کو بید سے پیٹ کر سزا دیتے اور ہدایت دیتے کہ ایسا کرنے سے برہمچریہ کا خاتمہ ہوجاتا ہے اور یہ خودکشی کے مترادف ہے۔

برہمچریہ کی عظمت اور نفس پرستی کی مذمت بار بار سننے سے نوجوانوں میں عموماً تجسس پیدا ہوتا کہ نفس پرستی کیا ہے، اس سے کیا ہوتا ہے؟ ان کے دل میں کھٹائی

مرچ کھانے کی اور بہت ٹھنڈے پانی سے نہانے سے بچنے کی خواہش ہوتی اور اس طرح برہمچریہ توڑنے کے خیال سے تسلی ہوتی۔ زیادہ جاننے والے لوگ لڑکوں کو فخر سے بتاتے۔۔ اصلی نفس پرستی لڑکیوں اور لڑکوں میں' عورت اور مردوں کے تعلقات کی بری باتوں میں ہوتی ہے۔

پہلے سے بری حرکتیں سیکھے ہوئے نوجوان لڑکوں نے بورڈنگ میں دو تین بار نفس پرستی کے برے کام کیے۔ پروفیسر صاحب نے باقی طلباء کو سبق دینے کے لئے قصور وار لڑکوں کو بید مار کر سزادی اور بورڈنگ سے نکال دیا۔ دوسرے طلبا ان خطاؤں کے بارے میں کئی دن تک فکر اور تجسس میں رہے۔

پروفیسر برہم برت سماج اور دنیا کی بہتری کے لئے جہالت' برے کاموں اور بری عادتوں سے لڑ رہے تھے۔ وہ خود سخت پرہیز سے برہمچریہ کی تعمیل کرتے تھے' اپنے طلباء سے برت کی تعمیل کراتے تھے اور دنیا کی بہتری کے لئے پرچار بھی کرتے تھے۔۔ "جو خوشی اور سکون' پرہیز اور برہمچریہ کے ذریعہ طاقت حاصل کرکے بھگوان کے کام کو پورا کرنے میں ہے' وہ بری عادتوں کے ذریعہ بھگوان کے دیے جسم کو برباد کرنے میں کہاں مل سکتا ہے۔ برے شوق کے ذریعہ ملی خوشی مرچ کے مزے کی طرح ہے۔ قدرت ہمیں اس سے دور رہنے کی ہدایت کرتی ہے۔ ہمیں مرچ سے تکلیف ہوتی ہے لیکن ہم محض لذت کی خاطر اسے کھانے کی عادت ڈال لیتے ہیں۔ اسی طرح ہمارے کسی بھی برے کام کے وقت بھگوان ہمارے دل میں شرم اور جھجک پیدا کردیتے ہیں۔ اس طرح ہمیں بھگوان کے ذریعہ خبردار کیا جاتا ہے۔ ہمیں ایشور کے انتباہ کو سمجھنا چاہیے۔ خوشی' طاقت اور سکون صرف ایشور کے حکم کی تعمیل سے حاصل ہوتے ہیں۔"

پروفیسر برہم برت کی تعلیم اور ذاتی کردار کی بھی سماج میں بڑی عزت تھی۔

پروفیسر برہم برت بارہ سال کے برہمچریہ برت پر مستحکم تھے لیکن جب ان کی بیٹی کی عمر چھ سال ہوگئی تو انہیں اس کی تعلیم کی فکر ہوئی۔ بیٹی کا نام انہوں نے رکھا تھا۔۔ گیان وتی۔ ان کے دل میں خوف تھا۔۔۔ بیٹی اور اس کی ماں کو اپنے ساتھ

رکھنے میں باقی چھ سال تک برہمچریہ کو برقرار رکھنا مشکل ہو سکتا تھا۔

عالم الغیب ایشور نے اپنے لازوال اور ناقابل فہم قانون سے اس مشکل مسئلے میں برہم برت کی مدد کی۔ گیان وتی کی ماں کے لئے اس زمین پر مقررہ کام اور وقت ختم ہوگیا تھا۔ وہ شوہر کے عظیم مقصد کے لئے راستہ صاف کرنے کے غرض سے بھگوان کی گود میں واپس چلی گئیں۔

برہم برت گیان وتی کو دادا، دادی کے لاڈ بھرے ماحول سے لے آئے۔ ماں اور دادی نے لڑکی کی چھوٹی چھوٹی کلائیوں پر سونے کے کنگن پہنا دیے تھے۔ اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں میں مہندی رچی ہوئی تھی اور میل سے بھرے بال گندھے ہوئے تھے۔

باپ نے گیان وتی کے جسم پر سے وہ سب پھوہڑپن پیار سے بہلاکر اور کچھ نصیحت کرکے دور کردیا۔ اس کے بال لڑکوں کی طرح کٹوائے۔ نمستے کہنا سکھایا اور گایتری منتر حفظ کرادیا۔ ایشور بھکتی کے کچھ گیت بھی سکھا دیے۔ وہ اسے بیٹا گیان کہہ کر پکارتے تھے۔ مہمانوں کے سامنے وہ صحیح تلفظ کے ساتھ گایتری منتر سناتی تھی۔

باپ سوال کرتے۔۔۔ ''تم کیا بنوگی؟''

بیٹی جواب دیتی۔۔۔ ''برہمچارنی۔''

کھانے کے بعد یا کسی وقت ڈکار یا ہچکی آنے پر لڑکی کے منہ سے نکلتا۔۔۔ ''اوم''

بیوی کی کمی کے سبب بیٹی کے لئے گھر پر مکمل انتظام نہ دیکھ کر پروفیسر برہم برت نے گیان وتی کو ''رشی وچن'' کے مطابق لڑکیوں کے گوروکل میں داخل کرادیا تھا۔ اس طرح بارہ سال کے لئے گیان وتی کے لئے اچھا انتظام ہوگیا۔ گروکل میں چھٹی ہونے پر بھی پروفیسر اپنی بیٹی کو آشرم سے باہر نہیں لاتے تھے تاکہ وہ برے ماحول سے بچی رہے۔

گیان وتی گوروکل میں بارہ سال کی تعلیم پوری کرچکی تھی۔ اس نے سنسکرات اور ویدک ادب کا علم خاطر خواہ حاصل کرلیا تھا۔ وہ مہابھاشیۓ' اور نیروکت' کی تشریح

کر سکتی تھی۔ اس کا جسم گوروکل کی مشقت بھری زندگی سے دبلا اور بے کشش معلوم ہوتا تھا لیکن وہ صحت مند تھی۔ بے اعتنائی سے جوانی کا بوجھ اٹھائے بیراگن سی دکھائی دیتی تھی۔ خود کو اور دنیا کو پہچاننے کی کوشش میں چکاچوندھ سی محسوس کر رہی تھی۔

گیان وتی کو گوروکل سے واپس آئے دو ہی مہینے گذرتے تھے۔ بورڈنگ کے قریب ہی اس کے باپ کے لئے بھی مکان بنوایا گیا تھا۔ مکان میں تین کمرے تھے۔ ایک کمرے میں کتابوں کی الماریاں اور اسکول انتظامیہ کا دفتر تھا۔ ایک کمرے میں باپ کے سونے کے لئے لکڑی کا تخت تھا۔ گیان وتی کے آجانے پر فوراً تخت تیار نہ ہوپانے کی وجہ سے دوسرے کمرے میں ایک چارپائی ڈال دی گئی تھی۔ پروفیسر کا نوکر موتی رام باورچی خانے میں یا برآمدے میں ہی سوجاتا تھا۔ موتی رام لڑکپن سے پروفیسر صاحب کے یہاں رہنے کی وجہ سے ہندی سیکھ گیا تھا۔ وہ رامائن' مہابھارت اور دوسری کتابیں پڑھ چکا تھا۔ اس کے علاوہ ایک گائے تھی' کملا۔۔۔ کملا کا خالص دودھ کافی مقدار میں ہوتا تھا تو مالک اور نوکر دونوں پیتے تھے۔ کم رہ جانے پر صرف پروفیسر صاحب ہی پیتے تھے۔

جس وقت گیان وتی کملا کے دودھ میں حصہ دار بننے کے لئے خاندان میں شامل ہوئی' کملا تقریباً سال بھر دودھ دے چکی تھی۔ اس کا بچہ کیتو غیر ضروری ہونے اور زیادہ پریشان کرنے کی وجہ سے بھیج دیا گیا تھا۔ کملا دودھ کم ہی دے رہی تھی۔ پروفیسر صاحب نے گیان وتی کے مشقت وریاضت کی وجہ سے لاغر ہوئے جسم کا خیال کر کے نوکر موتی رام کو باہر سے ایک سیر دودھ روزانہ اور لانے کی ہدایت دے دی تھی۔

گیان وتی کو دودھ پینے سے بھی زیادہ سکون کملا کی دیکھ بھال سے ملتا تھا۔ کملا اس گھر میں ہمیشہ سے مردوں کو ہی دیکھتی آتی تھی۔ گھر میں آئی نوجوان گیان وتی کو اپنی جنس پاکر مسرور اور چست ہوجاتی تھی۔ گائے اپنی بڑی بڑی رسیلی آنکھیں گیان وتی کی طرف اٹھاکر ' پیار سے میٹھی آواز میں پکار لیتی۔ گیان وتی کو کملا کے چکنے روئیں دار جسم پر ہاتھ پھیرنے اور سہلانے میں سکون ملتا تھا۔ وہ اپنی بانہیں گائے کے گلے میں ڈال دیتی۔ جاندار جلد کا ایسا لمس اس نے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ اس نے موتی رام سے گائے دوہنا سیکھ لیا۔ موتی رام اگرچہ نوکر تھا لیکن جوان مرد تھا' لڑکیوں

سے، جن کے ساتھ گیان وتی ہمیشہ سے رہتی آئی تھی، بالکل الگ تھا۔
ضابطے کے مطابق برہمچریہ آشرم کی مقررہ مدت پوری کرلینے پر گیان وتی کو کھٹائی اور مرچ کھانے کا اختیار حاصل ہوگیا تھا۔ ان چیزوں کا اسے شوق بھی تھا۔ پروفیسر صاحب کا کھانا ایسی ہیجان انگریز چیزوں سے خالی رہتا تھا۔ موتی رام ان کے لئے الگ سے کھانا پکاتا تھا۔ گیان وتی کا ذوق دیکھ کر اس نے بخل سے کام نہیں لیا۔ کسی کو مطمئن کردینے میں خود کو بھی تو سکون ملتا تھا۔
موتی رام نے ہندی پڑھنا اور لکھنا بھی سیکھ لیا تھا۔ وہ کبھی کبھی آریہ سماج مندر میں رہنے والے پنڈت جی سے یا اسکول کے ماسٹروں سے ایک آدھ کتاب اپنا وقت کاٹنے اور پڑھنے کا لطف حاصل کرنے کے لئے مانگ لیتا تھا۔ ان میں سوامی دیانند کا جیون چرتر' اور ہنومان جی کا جیون چرتر' کے علاوہ چندر کانتا سنتتی' اور دوسرے سماجی اور جاسوسی ناول ہوتے تھے۔ گھر میں اکیلی گیان وتی کے لئے وقت گذارنے کا ذریعہ ان کتابوں کو پڑھنے کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ ان کتابوں سے گیان وتی کو ایسا ہی سکون ملتا تھا، جیسے مسلسل پرہیز کا کھانا کھانے کے بعد ڈاکٹر کے منع کیے ہوئے چٹ پٹے کھانے سے ہوتا ہے۔ باپ کی کتابوں میں سے وہ ویدوں اور اپنشدوں کی تشریح اور وید پرچار کی سالانہ رپورٹوں کو ہمیشہ ہی پسند نہیں کرسکتی تھی۔
پروفیسر صاحب نے جس وقت چھ سالہ گیان وتی کو تعلیم کے لئے گوروکل بھیجا تھا، وہ نمستے اور گایتری منتر سنانے والے کھلونے کی طرح تھی۔ گوروکل سے اٹھارہ برس کی ہوکر لوٹی گیان وتی، ان کی بیٹی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نوجوان لڑکی بھی تھی۔ بالکل ویسی ہی نوجوان لڑکی جیسی اٹھارہ سال پہلے برہم برت کے کالج میں پڑھنے کے دوران ان کے گھر میں گیان وتی کی ماں تھی، جس کے سامنے مغلوب ہونے کی وجہ سے انہیں بارہ برس کے لئے برہمچریہ کا برت اختیار کرنا پڑا تھا۔
گیان وتی کو دیکھ کر پروفیسر صاحب کے دل میں اس کی ماں کے یاد تازہ ہوجاتی تھی۔ بیٹی شکل وصورت میں تقریباً اپنی ماں کی ہی طرح تھی لیکن برتاؤ میں بہت الگ! ماں بااخلاق، عافیت پسند اور بزدل سی گاؤں کی بہو تھی۔ بیٹی تعلیم سے آراستہ اور تیز طرار تھی۔ عورت کی قربت کی عادت نہ رکھنے والے پروفیسر صاحب، گیان وتی سے

جھجک محسوس کرتے تھے اور اس کی طرف سے نظر بچاتے رہتے تھے۔

پروفیسر صاحب کے برہمچریہ برت کا تقاضا تھا۔۔۔۔ حتی الامکان عورتوں کے تعلق میں نہ آنا اور ایسا موقع آنے پر انہیں ماں یا بہن کہہ کر مخاطب کرنا۔ خود ان کی عمر ابھی اڑتیس برس کی ہی تھی۔ گیان وتی کو وہ ماں یا بہن کہہ کر مخاطب نہیں کر سکتے تھے اور بیٹی کہنے سے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ بزرگ ہونے کا ڈھونگ کر رہے ہوں۔ بااصول زندگی کی بدولت ان کے سر کے بال ابھی کالے ہی تھے۔

پوری طرح جوان بیٹی کی گوروکل سے واپس پر پروفیسر کے دوستوں نے اس کے شادی کے قابل ہوجانے کی طرف دھیان دلایا تھا۔ پروفیسر صاحب خود بیٹی کے لئے لائق شوہر کی تلاش میں تھے۔ انہوں نے گوروکل کے تعلیم یافتہ گریجویٹ لڑکوں کے بارے میں سوچا اور کچھ لائق ماسٹروں کے باروں میں بھی غور کیا۔ گرہستی کے ماحول سے ناواقف جوان بیٹی سے اس کی شادی کے بارے میں بات کرنے کی ان میں ہمت پیدا نہیں ہوئی۔

پروفیسر صاحب نے گیان وتی کے برہمچریہ برت کی تعمیل کرتے ہوئے وید گیان کے پرچار کا کام کرتے رہنے کی بات بھی سوچی۔ ایسے وقت میں یہ خیال بھی آیا کہ گیان وتی کی جگہ اگر ان کا کوئی بیٹا ہوتا ان کی زندگی کا مسئلہ کتنا آسان ہوتا۔ ایسا خیال دل میں آنے پر پروفیسر صاحب نے قدرت کے فیصلے اور پورن برہم کے ضابطے پر شک کرنے پر اپنے آپ پر لعنت بھیجی۔ پرمیشور نے مرد اور عورت کو ایک ہی طرح سے اپنے گیان کی روشنی پھیلانے کے لئے پیدا کیا ہے۔ مرد اور عورت دونوں ہی خالق کائنات کی معرفت کا سبق دے سکتے ہیں۔ اشوک کے بیٹے مہندر اور بیٹی مہندری دھرم پرچار کے لئے کام کرتے تھے۔

بار بار عورت کا دھیان آنے سے پروفیسر صاحب کو خود اپنے اوپر غصہ آیا۔ انہوں نے یہ دلیل دے کر اپنے دل کو سمجھایا۔۔۔ برے خیالات کا دامن ہی مردانگی ہے۔ عورت کا تصور نفسانی خواہش ہے۔ گیان کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ جنسی خواہش سے بے اعتنائی خوف کی وجہ بھی ہو سکتی ہے۔

نوجوان بیٹی گھر میں اکیلی رہتی تھی، یہ سوچ کر انہیں ایک بوڑھی بوا یاد آئیں

جن کو وہ کافی مدت سے بھولے ہوئے تھے۔ ان کو اپنے گھر بلا کر رکھنے کے بارے میں سوچا۔ اپنے گھر پر نوجوان طلباء اور ماسٹروں کا آنا جانا زیادہ نہ ہو' اس لئے وہ اپنا زیادہ تر وقت اسکول کے دفتر میں ہی گذارنے لگے۔

لاہور میں اتوار کے دن دوپہر کو وید پر چار سبھا' کی میٹنگ تھی۔ پروفیسر صاحب کا وہاں جانا ضروری تھا۔ وہ صبح کی گاڑی سے لاہور چلے گئے۔

دوپہر کا وقت تھا۔ موتی رام سودا لینے بازار گیا ہوا تھا۔ گیان وتی اپنی چارپائی پر لیٹی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ مکان کے پچھواڑے سے گائے کملا کے زور سے رمبھانے کی آواز آئی۔ گیان وتی کتاب کے مطالعہ میں محو تھی۔ گائے کی آواز بار بار سن کر گیان وتی کو گائے پر ترس آیا اور موتی رام پر غصہ۔۔۔ بہت بے رحم ہے' اس نے گائے کو بھوسا نہیں دیا ہو گا۔

وہ کتاب چھوڑ کر اٹھی اور ایک ٹوکری بھوسا لے کر اس نے گائے کی ناد میں ڈال دیا۔ کملا نے بھوسے کی طرف نہیں دیکھا۔ وہ اور بھی بے قراری سے رمبھانے لگی۔

گیان وتی تشویش سے کملا کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے کچھ اندازہ لگایا اور ایک بالٹی پانی لا کر گائے کے سامنے رکھ دیا۔ وہ کملا کو پچکارنے لگی۔

کملا نے پانی کی طرف بھی دھیان نہیں دیا اور زور زور سے سرہلا کر بولنے لگی۔ وہ بےچینی کی حالت میں کھونٹے کے چکر کاٹ رہی تھی۔ اور رسی توڑ دینا چاہتی تھی۔ گیان وتی اس کی تکلیف سے فکر مند ہو کر اسے پچکار رہی تھی اور پوچھ رہی تھی۔۔

"کملا کیا ہے' کیا ہوا؟۔۔۔ کیا چاہتی ہے؟"

موتی رام لوٹ آیا۔ گیان وتی نے رنجیدہ آواز میں اسے کملا کی حالت بتائی۔ گائے اب بھی بے چینی کی حالت میں رسی تڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ موتی رام نے گائے کو دیکھا اور بے پرواہی سے بولا۔۔۔ "گیتا باہر جائے گی۔ بی بی جی ایک روپیہ دے دو!"

"کہاں؟" گیان وتی نے فکر سے پوچھا' "مویشی اسپتال؟"

"سانڈ کے پاس جائے گی۔" موتی رام گیان وتی کی ناواقفیت پر ہنس دیا۔
"ہائے کیوں؟" گیان وتی نے حیرت سے گہری سانس لی۔
"سانڈ کے پاس جاتی ہے نہ گیتا۔"
"کیا بات ہے؟" گیان وتی نے اصرار کیا۔
یہ پریشانی گورو کل میں کبھی اس کے سامنے نہیں آئی تھی۔ کسی کتاب میں اس موضوع پر کچھ نہیں پڑھا تھا۔
"آپ روپیہ دیجئے۔"
پروفیسر صاحب موتی رام سے پیسے پیسے کا حساب لیتے تھے۔ گیان وتی نے بھی پوچھا کہ ایک روپے کا کیا ہوگا۔
"سانڈ والا لیتا ہے۔"
"کس لئے؟"
"گیتا نئی ہوگی، ٹھیک ہو جائے گی۔"
"کیسے نئی ہوتی ہے؟" پھر گیان وتی نے اصرار کیا۔
"واپس آکر بتاؤں گا۔"
گیان وتی نے باپ کی الماری سے نکال کر پانچ روپے کا نوٹ اسے دے دیا۔ موتی رام گیتا کو رسی سے تھام کر باہر لے گیا۔
گیان وتی فکر مند ہو کر کبھی کمروں کے چکر کاٹتی، کبھی چارپائی پر لیٹ جاتی۔ گائے کی تکلیف کے خیال سے اس کا دل بھاری ہو رہا تھا۔
سورج غروب ہونے کے وقت موتی رام گائے کو لے کر لوٹ آیا۔ کملا بالکل پرسکون تھی۔
کملا کو دیکھتے ہی گیان وتی نے پوچھا—— "کیا بات تھی، بتاؤ!"
موتی رام مسکرایا—— "نہیں جانتیں، گیتا سانڈ کے پاس جاتی ہے۔"
"ہائے" فکر سے آنکھیں پھاڑ کر گہری سانس لے کر گیان وتی نے پوچھا، "سانڈ نے بیچاری کملا کو مارا تو نہیں؟ کیا ہوا سچ بتاؤ؟"
موتی رام ایسی بات ٹال کر باورچی خانے کی طرف جانا چاہتا تھا لیکن گیان وتی

ضد کر رہی تھی۔ اس ضد کی وجہ سے موتی رام جذباتی ہوگیا۔ اس کی آنکھیں گلابی ہوگئیں اور زبان لڑکھڑانے لگی۔ اس نے کہہ دیا۔۔ "ارے، جیسے مرد عورت کرتے ہیں۔"

گیان وتی کے تجسس کی حد نہیں رہی۔ "کیسے، کیا کرتے ہیں؟" ایک بار پھر اس نے پوچھا۔

موتی رام بے حیائی پر آگیا۔ گیان وتی سمجھی تو اچانک روئیں روئیں سے پسینہ چھوٹ گیا۔ اس نے آنچل دانتوں میں دبا کر دھمکایا۔۔ "ہٹ، گنیا تو بڑی نیک چلن اور پاک ہوتی ہے۔ یہ تو بڑی بری بات ہے۔"

موتی رام یوں پیدا ہوئے ہیجان سے اپنے آپے میں نہیں رہا تھا۔ اس نے گیان وتی کی کہنی پکڑ کر کہا۔۔۔ "آؤ تمہیں بتائیں۔"

گیان وتی نے یوں چھونے پر احتجاج کیا لیکن ناراضگی ظاہر نہیں کرپائی۔ وہ احتجاج ایسا تھا کہ موتی رام کو اپنی طاقت کا نشہ زیادہ محسوس ہونے لگا۔

گیان وتی نے پکڑے جانے پر موتی رام کے قریب آکر لڑکھڑائی آواز میں کہا۔۔ "نہیں، یہ تو برا کام ہے۔"

موتی رام نے اصرار کیا۔۔۔ "ایک بار دیکھو تو! برا کیا ہے؟ یہ تو شری رام چندر جی، سیتاجی اور شری کرشن جی بھی کرتے تھے۔"

گیان وتی نے باپ کا خوف دلایا۔ موتی رام نے جواب دیا۔۔۔ "وہ تو لاہور گئے ہیں۔ کل آئیں گے۔"

گیان وتی نے دیکھا، موتی رام نہیں مانے گا اور وہ منع بھی نہیں کرپارہی تھی۔ سرچکرا جانے سے اس کا احتجاج ٹھنڈا پڑگیا تھا۔ باپ کے خوف کا دل نے جواب دیا۔۔۔ اس کی برہمچریہ کی عمر ختم ہوچکی ہے۔ رشی منیوں کے زمانے میں بھی ایسا ہوتا تھا کہ جب نوجوان لڑکی ایک مرد کو اپنا مالک مان لیتی تھی۔۔۔

موتی رام کے جذباتی ہیجان کے سامنے ہار مانتے ہوئے، گیان وتی کو اپنے حاصل کردہ گیان کا دھیان آگیا۔ اس نے موتی رام کے برقرار ہاتھوں کو اپنے ست ہاتھوں

میں روک کر سمجھایا۔۔ ”جلدی سے شادی کا منتر پڑھ لو“....

وہ دونوں رسوئی اور کھانے پینے کی بات بھول گئے۔

وہ دونوں رات کو مکان کا دروازہ بند کرنا بھی بھول گئے۔

پروفیسر صاحب علی الصبح گاڑی سے لاہور چلے گئے تھے۔ انہوں نے دوپہر سے چار بجے تک سبھا کے کام میں حصہ لیا۔ گھر پر اکیلی جوان بیٹی کی فکر نے انہیں گھر لوٹنے کے لئے مجبور کردیا۔ وہ شام کی گاڑی سے واپس آنے لگے۔

وہ رات کو نو بجے اپنے قصبہ کے اسٹیشن پر گاڑی سے اترے اور اپنا موٹا بید ہاتھ میں لیے اور کاغذوں کا بستہ بغل میں دبائے کھیتوں کے بیچ کی پگڈنڈی سے اپنے مکان کی طرف چل دیے۔

رات ہوگئی تھی لیکن پھاگن کے چاند کی روشن چاندنی چاروں طرف دن کی روشنی کی مانند پھیلی ہوئی تھی۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے گیہوں کی سنہری بالیں اور ندی کنارے پر پھیلے کھیت لہرا رہے تھے۔ ندی کنارے سے ٹٹہری تیکھی آواز میں پکار کر چاندنی رات کے سنسان' بے کیف اور خاموش حسن کی طرف متوجہ کررہی تھی۔ تین میل کا راستہ تھا۔

برہم برت گھر میں بیٹھی جوان بیٹی کے مستقبل کے بارے میں سوچتے آرہے تھے۔۔۔ اگر وہ وید پرچار کا کام اسی عمر سے شروع کردے؟ لیکن جس وقت وہ سبھا کے منچ سے گیان اور برہمچریہ کی ہدایت دے گی' عیش پسند لوگ اسے سر سے لے کر پیر تک دیکھیں گے' اس کے ابھرے ہوئے سینے کو دیکھیں گے... اگر وہ صرف عورتوں میں وید پرچار کرے تب بھی وہ جوان مردوں کی قربت میں آئے گی۔ عیش و عشرت اور جنسی خواہشات کے تعلق میں نہ آنے کی وجہ سے اب تک اس کا برہمچریہ محفوظ ہے لیکن دنیا تو عیش و عشرت اور بری عادتوں سے بھری ہے۔ اس سے بچنے کے لئے انسان میں خود طاقت ہونی چاہئے۔ یہ طاقت صرف پرہیز کی مسلسل مشق سے آتی ہیں۔ میں نے یہ طاقت کتنی مشق سے حاصل کی ہے۔ زندگی میں قدم قدم پر امتحان کے مواقع آئے ہیں...

برہمچریہ برت کتنا مشکل ہے۔۔۔ یہ سوچتے ہوئے انہیں اپنے اکیس برس کی عمر میں پھسل جانے کے بات یاد آگئی۔ اسی کا نتیجہ یہ لڑکی تھی۔ اس کے بعد کتنی شدت سے انہوں نے خواہشات کو دبایا ہے۔ یہ کیا سب لوگوں کے لئے ممکن ہے؟

پروفیسر کو اپنی غلطی کا خیال آنے پر یاد آیا۔۔۔ گیان وتی کی ماں لاجو تب ایسی ہی تھی جیسی اب گیان وتی ہے۔ اس کے اندر زبردست جنسی کشش تھی۔ لاجو کے چکنے، محنت سے گوندھے ہوئے بالوں سے آنے والی دھنیے کے تیل کی خوشبو، وہ اب بھی محسوس کر رہے تھے۔ کنوار کی ایسی ہی چاندنی رات میں مکان کی چھت پر۔۔۔۔۔ گیان وتی کا قد لاجو سے اونچا ہے۔ وہ جھک کر چلتی تھی، یہ سیدھی چلتی ہے۔ اس کا سینہ اس کے مقابلے۔۔۔۔

پروفیسر کو ایک جھاڑی سے ٹھوکر لگی اور وہ گرتے گرتے بچے۔ اسی وقت ٹٹہری نے اپنی تیکھی آواز میں گویا انہیں متنبہ کیا۔ پروفیسر کو جیسے ایک دم ہوش آگیا۔۔۔ ان کے خون کی رفتار تیز ہوگئی تھی اور جسم میں ہیجان پیدا ہوگیا تھا۔ انہوں نے پرانا یام سے سانس روک کر جسم کے ہیجان کو ٹھنڈا کیا۔ گایتری منتر پڑھا اور اپنے آپ کو پھٹکارا۔۔۔ وہ تمہاری بیٹی ہے۔ دنیا کی سب جوان عورتیں تمہاری بیٹیاں، بہنیں اور مائیں ہیں۔ سوچنے لگے، برہمچریہ پر عمل کتنا مشکل ہے۔ برہمچریہ کے بیش قیمت زیور کو انسان سے لوٹ لینے کے لئے کتنے گمراہ کن خیالات انسان کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ گیان وتی کیا ایسے جسم کو لے کر۔۔۔ پروفیسر نے پھر اپنے آپ کو آگاہ کیا۔۔۔ عورت کے جسم کا خیال دل میں نہیں آنا چاہیے۔ دل کو سکون پہنچانے کے لئے وہ مسلسل گایتری منتر پڑھتے رہے۔

مکان کا دروازہ اتنی رات میں کھلا دیکھ کر پروفیسر کو نوکر اور لڑکی کی بے پرواہی پر غصہ آیا۔ روشنی بھی نہیں ہو رہی تھی۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔۔۔ کیا گھر میں نہیں ہیں؟ ایسی حالات میں کوئی بھی چور اندر گھس سکتا تھا۔

پروفیسر بغیر پکارے اندر چلے گئے۔ اپنے کمرے سے گیان وتی کے کمرے کے دروازے پر جاکر اسے آواز دینا ہی چاہتے تھے کہ سامنے چارپائی پر نوکر کے ساتھ لڑکی کو دیکھ کر ان کے ہاتھ کا ڈنڈا اٹھ گیا۔ آہٹ پاکر موتی رام اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ ڈنڈا

اس کے کندھے پر پڑا۔

چوٹ کھاکر موتی رام آنگن کے دروازے کی طرف بھاگ گیا۔ پروفیسر نے دوسرا ڈنڈا گیان وتی کو مارا۔ گیان وتی نے چوٹ سے بچنے کے لئے بانہیں اٹھالیں۔ منہ سے کچھ نہیں کہہ سکی۔

پروفیسر نے ڈنڈا الگ پھینک دیا۔ الٹے سیدھے کپڑوں میں چارپائی پر پڑی گیان وتی کو تھپڑوں اور گھونسوں سے پیٹنے کے لئے اس پر جھک پڑے۔ ان کے ہاتھ گیان وتی کے جسم پر ادھر ادھر پڑ رہے تھے۔ گیان وتی کے جسم کا لمس ان کے ہاتھوں میں سنسنی پیدا کررہا تھا۔ کچھ ہی دیر پہلے چاندنی میں پگڈنڈی پر چلنے کے دوران گیان وتی کے اسی سینے کا مقابلہ لاجو کے سینے سے کرنے کا خیال ان کے دماغ میں جاگ اٹھا تھا۔ ان کے غصے سے دھند لائے دماغ میں اٹھارہ برس پہلے کی تصویر سامنے آگئی۔ ان کے ہاتھ گیان وتی کے جسم کو پیٹنے کی بجائے اسے دبانے' نوچنے اور پکڑنے لگے۔

گیان وتی نے باپ کی مار چپ چاپ سہہ لی تھی لیکن اس نے باپ کے بے باک ہاتھوں کو روکنے کی کوشش کی۔ احتجاج میں بولی—— "پتاجی آپ کیا کر رہے ہیں؟"

پروفیسر ہوش کھوچکے تھے۔ انہوں نے گیان وتی کی آواز بند کرنے کے لئے' اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے طاقت سے بس میں کرنا چاہا لیکن گیان وتی بھی تلملا کر ان کی پکڑ سے چھوٹ گئی اور پھنکار کر بولی—— "پتاجی' آپ مجھ سے بدکاری کرنا چاہتے ہیں۔ ایسا پاپ نہیں کرنے دوں گی۔"

پروفیسر نے دانت پیس کر گیان وتی کو پھر پکڑنے کی کوشش کرتے ہوئے ڈانٹا—— "پاپن' تو نوکر کے ساتھ بدکاری نہیں کر رہی تھی؟"

گیان وتی نے پروفیسر کے دونوں ہاتھوں کو دور رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے اونچی آواز میں جواب دیا—— "نہیں' میں نے برہمچریہ سے نکل کر جوان مرد کو اپنا ور مانا ہے۔ میں نے گربھادان منتر کا پاٹھ کرلیا تھا۔"

پروفیسر کو جیسے لقوہ مار گیا۔ وہ ایک لمحہ تک ہکا بکا گیان وتی کی طرف دیکھتے رہے۔ پھر لڑائی میں ہارے ہوئے سانڈ کی طرح چپ چاپ تیز قدموں سے مکان کے

باہر چلے گئے۔

چمکدار چاندنی پھیلاتا ہوا چاند مغرب کی طرف ڈھلنے لگا۔ پروفیسر تین گھنٹے سے تیز قدموں سے گھر کے چکر کاٹ رہے تھے۔ ندامت سے ان کا دل چاہتا تھا کہ اینٹ یا پتھر مار کر سر پھوڑ لیں۔ عمر بھر کے برت اور تیاگ کو وہ ایک لمحہ میں کیسے کھو بیٹھے؟ ایسی حقیر اور ذلیل زندگی سے کیا فائدہ؟ وہ سماج کو اور دنیا کو منہ دکھانے کے لائق نہیں ہیں۔ خودکشی کے علاوہ ان کے لئے کوئی چارہ نہیں ہے۔

پروفیسر اپنی روح کی نجات کے لئے موت کے وقت اپنے دل کو پرسکون اور صاف رکھنے کی غرض سے اوم اور گایتری منتر کا پاٹھ کرتے جا رہے تھے۔ وہ دعا کر رہے تھے کہ اگلے جنم میں وہ پوری طرح برہمچاری بن سکیں۔

پروفیسر کے پل پر پہنچتے ہی شتری نے پھر تیکھی آواز میں بولنا شروع کر دیا۔ پروفیسر کی گھبراہٹ ختم ہو چکی تھی، سوچا ـــ بھگوان، اب یہ کس بات کا حکم دے رہے ہیں۔ اچانک انہیں رشی وچن یاد آیا۔

(خودکشی کرنے والے تو سورج کی روشنی سے نکل کر تاریک نرک لوک میں جاتے ہیں۔)

پروفیسر نے فیصلہ کیا ـــ پاپ سے پاپ نہیں دھل سکتا۔ پاپ کا خاتمہ پرائشچت اور تپسیا سے ہی ہو سکتا ہے۔

ندی کے پل پر ہوا بہت ٹھنڈی تھی۔ پروفیسر بیٹھ کر سوچنے لگے۔ بھرم کی ایک لہر میں راستے سے بھٹک جانے پر زندگی کے مقصد کو، پرماتما کے بتائے کام کو کیوں چھوڑ دوں؟ عورت سے قربت فرض کی دشمن ہے۔ یہ حالات کا قصور تھا۔ میں کل ہی مکمل سنیاس اختیار کر لوں ... یا زندگی میں گرہستی کی ضرورت کو پورا کرتے ہوئے اپنا کام کروں؟ ... نہیں یہ میرے وقار کے خلاف ہوگا۔ میں سنیاس اختیار کروں گا۔

وہ پل سے واپس اپنے مکان میں آگئے۔

مکان پر واپس آکر ٹھنڈے پانی سے نہائے۔ سوئی ہوئی گیان وتی کو بھی جگا کر

اسے بھی ایسا ہی کرنے کے لئے کہا۔ پھر انہوں نے ہون کیا اور یگیہ کی مقدس آگ کے سامنے بیٹھی گیان وتی کو نصیحت کی۔۔ "کل تم نے جذبات کی رو میں بہہ کر پاپ کیا۔ لڑکی کی شادی ماں باپ کی اجازت سے ہونے پر ہی اسے گرہستی کا حق ہوتا ہے۔ اسی قصور کی سزا میں نے تمہیں دی تھی۔ آج میں سنیاس اختیار کروں گا۔ آشرموں کی تعمیل سب کو ضابطے کے مطابق کرنی چاہیے۔ میں لائق مرد سے تمہاری شادی کا انتظام کروں گا۔ گناہ کو یاد کرنے سے دل گناہ گار ہوتا ہے۔ تم ایشور کو یاد کر کے عہد کرو کہ تم اس پاپ کا ذکر کبھی بھول کر بھی نہیں کروگی ورنہ اس کا پاپ کے پھل سے تمہاری زندگی داغ دار اور تکلیف دہ ہو جائے گی۔ متوازن اور مناسب زندگی ہی دھرم کا مقصد ہے۔ دھرم کی حفاظت کے لئے یہی ضروری ہے۔"

سب کی عزت

"شٹ اپ رون، بے وقوف کہیں کی!" اُترا نے بہت زور سے ڈانٹا۔

رون فرش تک لٹکتے اپنے کانوں سے اترا کے کالے سینڈلوں میں بندھے گورے گورے پیروں کو سہلاتی ہوئی، اس کی سفید ساڑی کے کنارے کے نیچے چھپ گئی۔

اترا نے خوشی سے چمکتی اپنی آنکھیں ویاس کی آنکھوں سے ملا کر رون کی گستاخی کے لئے معذرت کی۔ "یہ پاگل تمہیں دیکھ کر نہ جانے کیوں باولی ہو جاتی ہے؟"

ویاس نے ہاتھ میں رول کی طرح لپیٹا ہوا رسالہ صوفے کے قریب منقش گول میز پر رکھ دیا۔ صوفے پر بیٹھتے ہوئے وہ آنکھ دبا کر بولا۔ "یہ میرے بارے میں تمہارے گھر والوں کے جذبات کو خوب سمجھتی ہے، جانتی ہے میں چوری سے آیا ہوں۔ کتا چور کی بو سونگھ لیتا ہے۔"

اترا نے آنکھوں سے محبت بھری شکایت کرتے ہوئے ویاس کو ڈانٹا۔ "واہ، چوری سے کیوں آئے ہو۔ سو بار خوشامد کروا کے آئے ہو۔"

صوفے کے ساتھ آڑی رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ کر اترا بولی۔ "اصل میں اس بے وقوف کی عادت ہے کہ ہر پیدل آنے والے پر بھونکتی ہے۔ کوئی موٹر پر آئے تو اچھل کر اس کی گود میں جا بیٹھے گی۔ ڈبل روٹی، دودھ اور پھل والے سائیکل پر آتے ہیں۔ ان پر دور سے غرا کر رہ جاتی ہے۔ پوسٹ مین یا دوسرے پیدل آنے والوں کو دیکھ کر اتنا بھونکے گی جیسے اسی کا گلا کاٹنے آتے ہوں۔"

"یہی تو کہہ رہا ہوں۔" ویاس بولا "یہ مدارج کا فرق سمجھتی ہے۔ رون سمجھتی ہے کہ ارسٹوکریٹ لوگوں کے یہاں معمولی لوگوں کا کیا کام؟ ان کے آنے سے ماحول خراب ہو جاتا ہے۔"

"کیا اوٹ پٹانگ بک رہے ہو؟" اترا پیار سے جھنجلائی، "ہمیں نہیں اچھی

لگتیں ایسی باتیں۔ تمہاری لیاقت اور ذہانت کا یہ لوگ کیا مقابلہ کریں گے۔ تمہاری قسم، "لوک سانسکرتک سمیلن" پر تمہارے پرسوں کے تبصرے کا ذکر سب جگہ کیا جا رہا ہے۔ کیا مخمل میں لپیٹ لپیٹ کر جوتے مارے ہیں، مزہ آگیا! گاگیرا کہہ رہا تھا، طنز نگاری میں تمہارا کوئی ثانی نہیں ہے۔"

ویاس نے اترا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔۔۔ "سچ بتاؤں؟ تبصرے لکھے اسی لئے تھے کہ تمہیں پسند آئیں۔"

"جھوٹے کہیں کے!" مسرت آمیز لہجے میں اترا نے احتجاج کیا اور آنکھیں جھکالیں، "ہماری تمہیں کیا پرواہ ہے۔ جناب آپ کو تو دنیا مانتی ہے۔ آپ تو ویاس منی ہیں۔ ویسے ہی شہرت بڑھتی جا رہی ہے۔ اچھا ہاتھ دیکھیں تمہارا؟"

ویاس نے دایاں ہاتھ آگے بڑھادیا۔ اترا نے ویاس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر دھیان سے دیکھا۔۔۔ "بابا رے، دیکھئے، شہرت کی لکیر کتنی لمبی اور صاف ہے۔" اور پھر ویاس کے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں دبائے رہی۔

ویاس نے پوچھا۔۔ "تمہارے بھائیوں نے بھی تبصرہ پڑھا؟"

"انہیں ایسی باتوں سے کیا مطلب؟" اترا نے بیزاری سے ہونٹ دبا کر جواب دیا، "وہ لوگ تو جائداوں کی خرید و فروخت اور سرکاری ٹھیکوں کے نوٹس دیکھتے ہیں یا پھر ملٹری کلب، ٹرف کلب، کے نوٹس یا ایسی پارٹیوں کی خبریں دیکھتے ہیں جہاں سرکاری افسروں سے ملاقات کی امید ہو۔"

"انہیں معلوم ہے کہ میں کون ہوں؟" کچھ فکر مندی سے ویاس نے پوچھا۔

اترا نے اپنے ہاتھوں میں دبے ویاس کے ہاتھ کو سہلاتے ہوئے جواب دیا، کچھ معلوم تو ہے، لیکن آپ کو ٹھیک سے نہیں پہچانتے۔"

"کیا معلوم ہے؟" ویاس بے صبری سے اترا کی طرف جھک گیا۔

"تمہارے ساتھ مجھے ان لوگوں نے کئی بار دیکھا ہے۔ تم یہاں بھی کئی بار آئے ہو۔ مجھ سے پوچھا تھا، میں نے بتادیا تھا۔ بہت مشہور اخبار نویس ہیں۔ نام بھی بتایا تھا۔"

"تو پھر؟" ویاس اترا کی طرف کچھ اور جھک گیا۔

"بڑے بھائی نے منہ بنا کر کہا۔۔۔ اخبار و خبار کے دفتر میں نوکر ہوگا۔ مجھے برا لگا۔ میں نے بات ہی نہیں کی۔"

پست حوصلے کے ساتھ ویاس کی پیٹھ صوفے سے لگ گئی۔ اس نے چاروں طرف سرسری نظر ڈالی۔۔۔ "یہاں تم نے مجھے بے کار ہی بلایا۔ میں تمہارے ڈرائنگ روم کے لئے موزوں نہیں ہوں۔" اس نے اپنی ٹھوڑی پر ہاتھ پھیرا' "جلدی میں شیو بھی نہیں کر سکا اور یہ میری مسلی ہوئی بش شرٹ اور بغیر کریز کا پینٹ۔"

اترا نے محبت سے اس کی طرف دیکھا۔۔۔ "لال گدڑی میں بھی نہیں چھپتے۔"

"تم ارورا' میں ہی آجاتیں۔ وہاں اس وقت بھیڑ بھی نہیں ہوتی۔ وہ کسی کے باپ کی جگہ نہیں ہے۔ جو پیسے دے' جا کر بیٹھ سکتا ہے۔"

اترا نے معذرت کے انداز میں کہا۔۔۔ "ہمیں ریستوران میں بیٹھنا اچھا نہیں لگتا۔ کوئی نہ کوئی جان پہچان کا آدمی مل ہی جاتا ہے' تب شرم محسوس ہوتی ہے۔ کل میں نے کچھ لکھا ہے' تمہیں دکھانا چاہتی تھی۔"

"لیکن یہاں میرے دل میں دھکڑ پکڑ رہتی ہے۔" ویاس نے اپنی بے چینی ظاہر کی۔

اترا نے تسلی کے لہجے میں کہا۔۔۔ "ڈر کس بات کا؟ پتاجی پرسوں سولن چلے گئے ہیں۔ دونوں بھائی چھ بجے سے پہلے اپنا دفتر نہیں چھوڑ سکتے۔ آج تو رتن بھی نہیں ہے۔" پھر کچھ چونک کر اترا بولی' "اچھا' میں چائے تو لے آؤں۔"

اترا کرسی سے اٹھنے لگی۔

ویاس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر روک لیا۔۔۔ "رتن کہاں گیا؟ اس کمبخت کی آنکھوں میں بھی بڑی چوکسی بھری رہتی ہے۔"

"جب میں نے تمہیں فون کیا تھا' اس سے کچھ دیر بعد آکر بولا' "صاحب نے دوپہر کو دفتر میں بلایا ہے' کسی صاحب کے یہاں سے کچھ سامان لے کر آنا ہے۔ میں نے سوچا' تو بھی جا۔ بھگوان کرے تجھے روز سامان لانا ہو۔"

اترا کا چہرہ کھل اٹھا۔۔۔ "چائے بنالوں۔ ٹرے لگا کر رکھی ہوئی ہے۔"

ویاس نے اترا کو اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔۔۔ "بھگوان نے وقت دیا ہے'

ایک بار تو قریب آجاؤ۔"

ازرا ویاس کے قریب آگئی اور شرما کر اس نے اپنا منہ ویاس کے کندھے پر رکھ کر چھپالیا۔

ویاس نے ازرا کے بالوں کو سہلاتے ہوئے بے قراری سے کہا۔۔۔ "سنو تو!"

"کیا ہے؟" ازرا نے پیار سے پوچھا اور اپنا چہرہ ویاس کے کندھے پر بدستور رکھے رہی۔

"دیکھو نہ!" ازرا کا منہ اپنی طرف موڑنے کی کوشش کرتے ہوئے ویاس نے اصرار کیا۔

ازرا کا چہرہ شرم و حیا سے گلابی ہو گیا تھا۔ وہ بولی۔۔۔ "کیا ہے، کہو نہ!"

ویاس نے ازرا کی گردن پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنی طرف کھینچنا چاہا۔

ازرا نے ویاس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اس کی گرفت سے نکلنے کے لئے سر پیچھے ہٹالیا۔۔۔ "نہیں ابھی نہیں۔"

"تو پھر کب؟" ویاس کی آواز کانپ رہی تھی۔

"جب مجھے اپنا بنالو گے۔" ازرا نے مسرت بھرے لہجے میں جواب دیا۔

"تم میری بنو گی؟" ویسے ہی انداز میں ویاس نے بھی پوچھا۔

"ضرور۔ قبول کرو تب نہ!" ازرا نے پھر ویاس کے کندھے پر سر رکھ دیا۔

"تمہارے بھائی اور پتاجی مانیں گے؟" ویاس نے ہاتھ ازرا کی پیٹھ پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

"ان کی بات رہنے دو۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"کیوں، اپنی شادی مجھے کرنی ہے۔ انہیں جہاں کرنی ہوگی، میں رکاوٹ نہیں ڈالوں گی۔"

آخر وہ لوگ کہتے کیا ہیں؟"

"انہیں چھوڑو۔ میں کہتی ہوں، ان کی بات رہنے دو۔ شادی تو میری ہوگی۔"

"کچھ بات تو ہوتی ہوگی۔" ویاس نے ضد کی۔

"کہہ تو رہی ہوں' اس کی پرواہ تم نہ کرو۔" ازرا نے سر اٹھا کر دیوار کی طرف دیکھتے ہوئے ایک عزم کے ساتھ کہا۔

"نہیں تم بتاؤ تو؟" ویاس نے ازرا کا منہ اپنی طرف کرکے اصرار کیا۔

"کچھ بھی نہیں۔' ازرا نے سر ہلا دیا۔

"نہیں بتاؤ' تمہیں میرے سر کی قسم۔۔۔ حالات کا اندازہ تو ہو۔" ویاس سنجیدہ لہجے میں بولا۔

"کیا بتاؤں' ان لوگوں کی اپنی سمجھ ہے۔" ازرا نے سر جھکا لیا۔

"انہوں نے کیا کہا' یہ تو بتاؤ۔"

"یہی کہ۔۔۔ مجھے اپنی اور خاندان کی سماجی حیثیت کا دھیان رکھنا چاہیے۔"

"ٹھیک ہے' میرے متعلق کیا کہا' یہ بتاؤ۔۔۔ کیسے بات ہوئی؟" ازرا کے چہرے پر نظر گڑائے ویاس بولا۔

"ایک دن کہنے لگے' یہاں آپ کا آنا ٹھیک نہیں ہے اور باہر بھی میرا آپ کے ساتھ ملنا جلنا وہ لوگ پسند نہیں کرتے۔ لیکن میں کب ان کی پرواہ کرتی ہوں۔"

"تو پھر تم نے مجھے یہاں کیوں بلایا؟" ویاس سنجیدہ ہو گیا۔

"کیوں؟" ازرا بیباکی سے اور پراعتماد لہجے میں بولی' "ان کے اپنے خیالات ہیں' تو میرے بھی کچھ خیالات ہیں۔ یہ گھر میرا بھی تو ہے۔ ان لوگوں کے مہمان آتے ہیں تو میرے بھی آ سکتے ہیں۔ وہ لوگ مجھ پر جبر کر رہے ہیں۔ مجھے موقع ملے گا تو میں اپنی خواہش پوری نہیں کروں گی!۔۔۔ بجلی کی کیتلی تو پھنک گئی ہوگی۔"

ازرا اچھل کر بیٹھ گئی۔ "ذرا سی بات پر سب لوگ شور مچادیں گے' ابھی آئی سوئچ آف کر آؤں۔"

ازرا بیٹھک کے پچھلے دروازے سے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

ویاس نے کچھ سوچتے ہوئے آنکھیں آدھی موند کر دانتوں تلے انگوٹھا دبایا ہی تھا کہ اسے بیٹھک کے برآمدے سے کچھ آہٹ سنائی دی۔ کھڑکی سے دیکھا کہ ازرا کے بڑے بھائی بلونت کھنہ اندر جھانک کر الگ ہٹ گئے ہیں۔

ویاس گھبراہٹ میں صوفے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

بلونت نے رتن کو اشارے سے بلا کر اس کے کان میں کچھ کہا۔

رتن ویاس کو نظر انداز کر کے بیٹھک میں سے بھاگتا ہوا اسی دروازے میں چلا گیا جہاں اترا کیتلی کا سوئچ آف کرنے گئی تھی۔

دوسرے ہی لمحے چھوٹا بھائی یشونت لمبے لمبے قدم رکھتا ہوا بیٹھک میں آیا اور ویاس کو نظر انداز کر کے بیٹھک سے دوسرے کمرے میں کھلنے والے دروازوں کو چٹخنیاں لگا کر بند کرنے لگا۔

ویاس کسی اندیشے سے باری باری دونوں بھائیوں کی طرف دیکھ رہا تھا کہ وہ لوگ کیا کرنا چاہتے ہیں!

یشونت دروازوں میں چٹخنی لگانے کے بعد دھمکی والے انداز میں آستینیں چڑھاتا ہوا ویاس کی طرف آیا۔ بلونت بھی ویاس کو گھورتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔

بلونت نے آہستہ سے، لیکن سخت لہجے میں پوچھا۔۔۔ "تم کون ہو؟"

یشونت نے آستینوں کو اور اوپر سمیٹ کر دھمکایا۔۔۔ "کس سے پوچھ کر بنگلے میں آیا؟ بغیر پوچھے کیسے آیا؟"

ویاس نے بے عزتی اور دھمکی کی اس غیر متوقع صورت حال میں ہمت قائم رکھی۔۔ "میں بغیر پوچھے نہیں آیا ہوں۔ آپ لوگوں کی بہن مس اترا نے فون پر اصرار کر کے مجھے یہاں بلایا ہے۔ آپ لوگ مجھے جانتے پہچانتے ہیں۔ میں اس مکان میں پہلے بھی کئی بار آیا ہوں۔ آپ سے تعارف بھی ہو چکا ہے۔ شاید آپ بھول رہے ہیں۔"

بلونت نے پیر پٹخ کر دھمکایا۔۔ "ہم تم کو نہیں جانتا۔ تم چور ہے۔ ہم نے تم کو یہاں چوری کرتے پکڑا ہے۔"

ویاس سمجھ گیا، وہ جال میں پھنس گیا ہے۔

یشونت اپنی چڑھائی ہوئی آستینوں سے، طاقت کا مظاہرہ کرنے کے لئے مضبوط بازو دکھاتا ہوا اور بھی قریب آگیا۔

ویاس نے خوف کو چھپاتے ہوئے خودداری برقرار رکھنے کے لئے کہا۔۔۔ "یہ بھلے آدمیوں کا برتاؤ نہیں ہے۔ میں بغیر بلائے نہیں آیا ہوں۔ آپ کی بہن کی دعوت

پر آیا ہوں۔ آپ کو شکایت ہے تو میں جا رہا ہوں۔"

بلونت پھر غصے سے پھنکارا۔۔۔ "تم نہیں جا سکتا۔ تم چور ہے۔ تمہیں پولیس لے جائے گی۔" بلونت پارٹیشن کے پیچھے رکھی ہوئی ٹیلی فون کی میز کی طرف بڑھا۔

ویاس نے بھی خطرہ محسوس کر کے غصہ ظاہر کیا۔۔۔ "آپ اس طرح دھوکا دے کر میری بے عزتی کر رہے ہیں۔ میں یہاں نہیں ٹھہروں گا۔ آپ مجھے نہیں روک سکتے۔"

یشونت کے بہت دیر سے اتاولے ہاتھوں کے گھونسے ویاس کے دائیں اور بائیں جبڑوں پر پڑے۔ وہ غصے میں زور سے غرایا۔۔۔ "سوائن! غنڈہ! سور!"

ویاس نے چہرے کو چوٹ سے بچانے کے لئے دونوں بازو اوپر کر لیے۔ اسے اپنی جسمانی طاقت کا نہیں بلکہ اپنی زبان اور قلم کی طاقت کا بھی بھروسا تھا۔ اپنے دانت اور یشونت کے گھونسے کے بیچ کچل جانے سے اس کے ہونٹ سے خون ٹپکنے لگا۔ جیب میں رومال نہ ہونے پر ویاس اپنی بش شرٹ کی آستین سے خون پونچھنے لگا اور لڑکھڑانے لگا۔

بلونت نے یشونت کی طرف دیکھا۔۔ "دیکھنا' چور بھاگ نہ سکے۔ دروازہ بند کردو۔ میں پولیس کو فون کرتا ہوں۔"

یشونت نے ویاس کو دھکے دے کر صوفے پر گرا کر دھمکایا۔۔ "خبردار' اٹھا تو سر توڑ دوں گا۔ سور••• بدمعاش!" اور اس نے بیٹھک کے برآمدے میں کھلنے والے دروازے میں بھی چٹخنی لگادی۔

اسی وقت بیٹھک کے پیچھے کا دروازہ' جس سے اترا بجلی کی کیتلی بند کرنے گئی تھی' بھڑبھڑا اٹھا۔

بلونت کی نظر اس طرف گئی اور اس کے منہ سے بے بسی میں نکل گیا۔۔۔ "نان سینس!" اس نے یشونت کی طرف بڑھ کر آہستہ سے کہا' "اسے دور رکھو۔ کہہ دو' یہاں دوسرے کئی آدمی ہیں' پولیس کا معاملہ ہے' ذرا ٹھہرے۔"

یشونت نے چٹخنی گرا کر دروازے کو ذرا سا کھولا۔

ویاس کو اترا کی آواز سنائی دی۔۔۔ "مجھے آنے دیجئے۔ آپ•••'

یشونت فوراً دروازے کی دوسری طرف ہوگیا۔ کواڑ بند ہوگیا۔

ویاس مصیبت میں سہارے کے لئے اونچی آواز میں چیخا۔۔۔ "اترا جی' آپ آیئے! دیکھئے یہاں۔۔۔"

بلونت دانت پیس کر اس پر جھپٹ پڑا۔

ویاس خاموش ہوگیا۔ اسے دروازے کے پیچھے کہیں بہت زور سے دروازہ بند کرنے کی آواز سنائی دی۔ ویاس بے بسی میں بلونت کی طرف دیکھ کر ہونٹ کا خون پونچھتا رہ گیا۔

بلونت اضطراب میں چہل قدمی کرتا ہوا دوسرے کمرے سے یشونت کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔ یشونت پھر دروازہ کھول کر بیٹھک میں آگیا اور دروازے میں چٹخنی لگا دی۔

یشونت نے بھائی کی طرف دیکھا۔۔۔ "انتظام کر دیا ہے۔"

ویاس نے اپنا زخمی ہونٹ آستین سے دبا کر پھر ہمت کی۔۔۔ "کھنہ صاحب' آپ بہت زیادتی کر رہے ہیں!"

کھنہ نے اسے لال آنکھوں سے گھور کر ڈانٹ دیا۔۔۔ "شٹ اپ' یو سوائن!" اور یشونت کی طرف دیکھا' "تم اس پر نظر رکھو۔ میں پولیس کو پھر فون کر رہا ہوں۔"

وہ منقش پارٹیشن کی دوسری طرف چلا گیا۔

بلونت نے فون کا رسیور اٹھا کر ایک نمبر گھمایا۔ اچانک اس کے منہ سے نکلا۔۔۔ "اوہ!۔۔۔" اس نے رسیور واپس رکھ کر اپنا بیگ میز پر سے اٹھا کر کھولا۔ بیگ میں سے دو لمبے لمبے کانٹے سے نکال کر میز پر رکھ دیے۔ خود بخود اس کے منہ سے نکلا' "ہوں۔۔۔"

بلونت نمبر ڈائل کر کے سننے لگا۔۔۔ "ہلو' ہلو' میکالے روڈ پولیس اسٹیشن! مسٹر نارائن ہیں"

بلونت ذرا ہکلانے لگا۔۔۔ "نو' پرسنل نہیں۔ میں رپورٹ دے رہا ہوں۔"

"۔۔۔۔۔۔۔"

"یس' ویل' میرے مکان پر ایک چور موجود ہے۔"

"........"

"جی نہیں۔ میں اور میرا بھائی ابھی اپنے دفتر سے لوٹے ہیں۔ ہم اسے اپنے ڈرائینگ روم... آفس ٹیبل کے پاس دیکھا۔"

"........"

"یس، .... ہمیں دیکھتے ہی اس نے بھاگنے کی کوشش کی۔"

"........"

"ہم لوگوں نے اسے پکڑ لیا ہے۔"

"........"

"نو، آئی کانٹ۔"

"ہتھیار دکھائی تو نہیں دیا۔"

"........"

"یس، میرا نام بلونت کھنہ ہے۔ میکالے روڈ۔ یس سات نمبر۔"

"........"

"ڈرائینگ روم میں ہماری دراز کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔"

"........"

"نہیں بھاگتے وقت اس کے ہاتھ سے گر پڑا۔"

"........"

"اوہ، گڈ، تھینک یو ویری مچ! .... گڈ آفٹرنون، نارائن!"

"........"

"ہاں بھائی بہت جلدی۔"

"........"

"اوہ یس، خطرہ تو ہے ہی۔"

بلونت نے رسیور فون پر رکھ کر چھوٹے بھائی کی طرف دیکھا۔۔۔ "نارائن خود آ رہا ہے۔"

بلونت نے رسیور فون پر رکھا تو ویاس بولا۔۔۔ "آپ رپورٹ دے چکے ہیں۔

مجھے بھی پولیس سے بات کر لینے دیجئے۔"

یشونت پھر گھونسا تان کر اس کی طرف بڑھا۔۔۔ "چپ! یو غنڈہ، سور، بدمعاش! تیری ہمت کیسے ہوئی اس مکان میں قدم رکھنے کی۔ راسکل ۔۔۔۔"

بلونت دونوں ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں ڈال کر سر جھکائے کچھ سوچتا ہوا بیٹھک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک گیا، پھر اسی طرح لوٹ کر اس نے یشونت کو اشارے سے دروازے کے قریب لے جاکر آہستہ سے سمجھایا۔ "تم پولیس کو بیان دینا، ہم لوگ برآمدے میں آئے تو اسے دیکھا۔ بیٹھک کے کواڑ کھلے تھے ۔۔۔ اسے پارٹیشن کے پیچھے بھاگتے دیکھا۔ تم نے آگے بڑھ کر اسے روکا ۔۔۔۔ اچھا جلدی سے اس کی بش شرٹ کندھے سے پھاڑ دو، کوئک!"

یشونت فوراً ویاس کی طرف گیا اور اس کے سینے پر بش شرٹ کا کونا پکڑ کر بہت زور سے کھینچ کر پھاڑ دیا اور بلونت کے قریب آگیا۔۔۔ "بس!"

بلونت کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے سمجھانے لگا۔۔۔ "یہ بھاگ رہا تھا، تم نے اسے روکنے کے لئے دو تین گھونسے اس کے چہرے پر مارے ۔۔۔۔"

ایک جیپ کی رکنے کی آواز آنے پر بلونت بولا۔۔۔ "ویل، پولیس آگئی۔" اس نے کھڑکی سے جھانکا۔ "ویری گڈ، نارائن خود آیا ہے۔ تم دروازہ کھولو۔"

یشونت نے بیٹھک کے کواڑ کھول دیے۔ ایک پولیس انسپکٹر چار مسلح سپاہیوں کے ساتھ بیٹھک کے دروازے پر آگیا۔

"ہم لوگ اندر آسکتے ہیں؟" انسپکٹر نے تحکمانہ لہجے میں پوچھا اور بلونت کی طرف شناسا مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا۔

"تشریف لائیے۔ ہم لوگ آپ ہی کے انتظار میں تھے۔" بلونت نے مسکرا کر استقبال کیا اور آگے بڑھ کر انسپکٹر سے ہاتھ ملایا۔

انسپکٹر دو سپاہیوں کے ساتھ اندر آگیا۔ دونوں سپاہی ویاس کو دیکھ کر اس کے دائیں بائیں کھڑے ہوگئے۔ دو مسلح سپاہی بیٹھک کے دروازے کے دونوں طرف برآمدے میں کھڑے رہے۔

"میکالے روڈ، نمبر سات یہی بنگلہ ہے؟" انسپکٹر نے غیر جانبدارانہ انداز میں سوال

کیا، جیسے وہ بلونت سے متعارف نہ ہو، "آپ مسٹر کھنہ ہیں۔ آپ نے فون پر اپنے گھر میں چور ہونے کی رپورٹ کی ہے؟ میرا نام نارائن پرساد سنہا ہے۔ میں ایریا آفیسر ہوں۔"

"معاف کیجئے گا، آپ کو تکلیف دینا ضروری تھا۔" بلونت نے بھی صورت حال کے مطابق سنجیدہ ہو کر ویاس کی طرف اشارہ کیا، "وہ آدمی ہے۔ ہم لوگوں نے اسے پکڑ کر بیٹھا رکھا تھا، اب آپ سنبھالیے۔ یہ میرا چھوٹا بھائی یشونت کھنہ ہے۔"

یشونت نے بھی آگے بڑھ کر انسپکٹر سے ہاتھ ملایا۔

ویاس بول پڑا — "یہ سب دھوکا ہے۔ مجھے گھر پر دعوت دے کر دھوکا دیا گیا ہے، مجھ پر حملہ کیا اور میری بے عزتی کی گئی ہے۔"

انسپکٹر نے حیرت ظاہر کرنے کے لئے آنکھیں پھیلا کر ویاس کی طرف دیکھا — "آپ کی بات بھی سنی جائے گی۔" اور پھر بلونت کو مخاطب کیا، "آپ فرمایئے!"

بلونت انسپکٹر کو کرسی پر بیٹھا کر خود دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ جیب سے سنہرا سگریٹ کیس نکال کر اس نے انسپکٹر کو سگریٹ پیش کیا — "سگریٹ لیجئے!" اور ایک سگریٹ اپنے ہونٹوں میں دبایا۔ لائٹر سے پہلے انسپکٹر کا اور پھر اپنا سگریٹ سلگایا۔

بلونت نے سگریٹ کیس اور لائٹر میز پر رکھ کر کھنکار کر بولنے کے لئے گلا صاف کیا، پھر کلائی کی گھڑی دیکھ کر بولا — "لگ بھگ بیس منٹ ہوئے، ہم لوگ — میں اور میرا بھائی یشونت کھنہ اپنے دفتر سے لوٹے تھے۔ ہم نے دیکھا کہ بیٹھک کا دروازہ ٹھیک سے بند نہیں ہے۔ ہمیں کچھ شک ہوا...."

بلونت نے ایک بار پھر کھانس کر گلا صاف کیا۔ "میں نے برآمدے میں آکر دروازہ کھول کر اندر جھانکا تو مجھے پارٹیشن کے پیچھے میز کے پاس یہ آدمی دکھائی دیا۔ ہماری آہٹ پاتے ہی یہ آدمی ہماری طرف جھپٹا — تو — میرا مطلب ہے اس دروازے سے باہر نکلنے کے لئے دوڑا... باہر نکل کر بھاگنے کے لئے۔ یشونت نے فوراً راستہ روک کر اسے پکڑ لیا۔ اس آدمی نے بھاگنے کی کوشش کی تو ہاتھا پائی میں اس کے منہ پر بھی چوٹ آئی ہے، یو کین سی۔ میرا بھائی یشونت باکسر ہے، ہی از اے اسپورٹس مین، کسرتی جوان ہے..."

بیٹھک کے بند دروازوں کے پیچھے کہیں سے کواڑوں کو پیٹنے کی زور زور سے آواز سنائی دی۔

بلونت کے ماتھے پر لکیریں پڑگئیں۔ ذرا جھجکا' پھر فکر ظاہر نہ کرنے کے لئے کھانس کر بولنے لگا۔۔ "تو پھر ہم لوگوں نے اسے پکڑ کر بیٹھا لیا اور دروازہ بند کردیا۔ میں نے میز پر آکر دیکھا تو میز کی دراز کے نیچے تالا توڑنے کے کانٹے پڑے ہوئے تھے۔"

"تالا توڑنے کے کانٹے!" انسپکٹر نارائن نے پوچھا' "میں دیکھ سکتا ہوں؟"

بلونت نے میز کی طرف جاکر میز پر رکھے لوہے کے کانٹے اٹھاکر انسپکٹر کے ہاتھ میں دے دیے۔

بند دروازوں کے پیٹے جانے کی آواز پھر سنائی دی۔

بلونت نے چونک کر اور فکر مند ہوکر انسپکٹر کی طرف دیکھا اور اپنے آپ کو سنبھال لیا۔

انسپکٹر نے کانٹوں کو دھیان سے دیکھ کر آہستہ سے کہا۔۔۔ "اچھا' یہ ہتھیار! ہاں آپ کہتے جایئے' میں سن رہا ہوں۔"

بلونت کچھ کھانس کر بولنے لگا۔۔ "اس آدمی نے بیٹھک کا دروازہ بھی انہی کانٹوں سے کھولا ہوگا۔"

انسپکٹر۔۔۔ "یہ آپ کا اندازہ ہے۔"

بلونت ۔۔۔ "آف کورس' جی ہاں' میرا خیال ہے... پھر ہم نے فوراً میکالے روڈ پولیس اسٹیشن پر فون کردیا۔"

انسپکٹر نے بلونت کی طرف دیکھا۔۔ "اور کچھ' آپ کو اور کچھ کہنا ہے؟"

بلونت نے اپنی سگریٹ ایش ٹرے میں دبا کر جواب دیا۔۔ "یس' پھر ہم نے پولیس اسٹیشن کو فون کردیا۔ اٹ واز آور ڈیوٹی۔"

ویاس گردن سیدھی کرکے بولا۔۔ "اب میں کچھ کہہ سکتا ہوں!"

انسپکٹر نے اسے ہاتھ سے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔۔۔ "ذرا صبر کیجئے۔" اور بلونت سے سوال کیا' "اس مکان میں اور کون کون رہتا ہے؟"

بلونت نے کچھ سوچنے کے لئے وقت حاصل کرنے کی غرض سے نیا سگریٹ انسپکٹر کو پیش کیا ور خود بھی دوسری سگریٹ ہونٹوں میں دبا کر جواب دیا--- "ہمارے ماں باپ بھی یہاں رہتے ہیں لیکن وہ لوگ جولائی سے سولن چلے گئے ہیں- یہ میرا چھوٹا بھائی یشونت کمنہ ہے- ہماری چھوٹی بہن ہے- بہن دوپہر بعد عموماً گھر پر نہیں رہتی- وہ راشٹریہ سانسکرتک پریشد' کی آنریری جوائنٹ سیکریٹری ہے-"

انسپکٹر نے سر کھجاتے ہوئے پوچھا--- "آپ کے یہاں کتنے نوکر ہیں؟"

بلونت نے لمبا کش کھینچ کر جواب دیا--- "نوکر دو ہیں- ایک فادر کے ساتھ سولن چلا گیا ہے' دوسرا نوکر یہاں ہے- اس کی بوڑھی ماں بھی یہاں رہتی ہے- چوکا' برتن' جھاڑو بہارو کردیتی ہے- رسوئی کے پیچھے برآمدے میں پڑی رہتی ہے- ایک مالی ہے-"

بند دروازے کی طرف آواز اور کتے کے بھونکنے کی آواز اس بار انسپکٹر نے بھی سنی اور پوچھا--- "کیا دوسری طرف اور لوگ بھی رہتے ہیں؟"

انسپکٹر کے سوال سے بلونت اور یشونت کے چہروں پر فکر مندی کے آثار نظر آئے- بلونت نے ہکلا کر جواب دیا--- "آف... آف کورس' دوسرے کرایے دار بھی ہیں-"

یشونت نے ذرا سوچ کر جواب دیا--- "رون ہوگی- رون ہماری بچ ڈاگ ہے-"

انسپکٹر نے کہا- "آپ کے یہاں کتیا ہے- کتیا آنے جانے والے لوگوں پر بھونکتی نہیں؟"

اتفاق سے اسی وقت رون پچھواڑے سے آکر برآمدے میں کھڑے سپاہیوں پر زور زور سے بھونکنے لگی- یشونت کے بلالینے پر کتیا اندر آکر ویاس کی طرف دیکھ کر بھونکنے لگی-

یشونت نے اسے پچکار کر چپ کرادیا-

انسپکٹر کتیا کو دیکھ کر مسکرایا--- "کتیا اچھی ہے- پیور بریڈ معلوم ہوتی ہے-"

"آف کورس پیور بریڈ' شی از پیڈگری!" بلونت نے خوش ہوکر بتایا' "کرنل لونی والا کے کتے کی بہن ہے' سیم لٹر- کرنل کے کتے کو اس سال ڈاگ شو میں پرائز ملا

ہے۔ آپ کو بھی کتوں کا شوق ہے۔ اس کا جوڑا ڈھونڈ رہا ہوں۔ کرنل سے بات کروں گا۔"

انسپکٹر نے تردد کے تحت بات بدلی۔ "نو' نہیں' میں نے پوچھا تھا' یہ کتیا آنے والوں پر بھونکتی نہیں ہے؟"

بلونت نے جواب دیا۔۔ "یہ واچ ڈاگ نہیں ہے۔ بس شوق کی چیز سمجھئے' سوئیٹ تھنگ۔ چوکیداری کے لئے تو ایلیشیئن ٹھیک رہتا ہے۔"

بلونت بھائی کی طرف گھوم گیا۔۔۔ "تم جانتے ہو' مسز سندریا کی ایلیشیئن نے تین بچے دیے ہیں نہ؟"

ویاس پھر بولا۔۔ "اب میں بول سکتا ہوں؟"

انسپکٹر نے اس کی طرف گھور کر دیکھا اور نرم لہجے میں جواب دیا۔۔ "شوق سے فرمایئے!"

ویاس۔۔۔ "پہلی بات تو آپ یہ نوٹ کیجئے کہ مجھے مسٹر کھنہ کی بہن مس اترا نے بلایا تھا۔ میں ان سے ملنے کے لئے یہاں آیا تھا۔"

انسپکٹر نارائن کے ماتھے پر تیوریاں پڑ گئیں۔ اس نے بلونت کی طرف ایک نظر ڈال کر ویاس سے پوچھا۔۔ "کس کام سے آپ کو بلایا تھا؟ آپ کہاں کام کرتے ہیں' لانڈری میں یا بجلی کمپنی میں...."

ویاس نے گردن اونچی کرکے جواب دیا۔۔۔ "مس اترا نے مجھے کام کے لئے نہیں ملاقات کے لئے بلایا تھا۔"

انسپکٹر کی آواز میں سختی آگئی۔۔ "ذرا سوچ کر بات کرو۔ تم نے یہاں ٹریس پاس یعنی مکان میں بغیر اجازت گھسنے کا جرم کیا ہے اور تم ایک عزت دار خاندان کی لڑکی پر لانچھن لگا رہے ہو۔ جانتے ہو' کسی کی ہتک عزت بھی جرم ہے۔"

ویاس اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔۔۔ "آپ کے بات کرنے کا اگر ایسا ڈھنگ ہے تو میں کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ آپ مجھے فون کرنے دیجئے' میں پولیس سپرنٹنڈنٹ سے بات کروں گا۔"

انسپکٹر ذرا سوچ کر مسکرایا۔۔ "آپ سپرنٹنڈنٹ پولیس سے بات کریں گے؟"

ویاس نے بے خوف ہو کر جواب دیا—— "یس' میں سپرنٹنڈنٹ سے بات کروں گا۔ یور ایٹی ٹیوڈ از پارشیئل۔ آپ سراسر طرفداری کر رہے ہیں۔ میں کسی اور پولیس آفیسر کے بھیجے جانے کی اپیل کروں گا۔"

انسپکٹر چونکا' سنبھل کر بولا—— "میں نے کیا پارشیئلٹی کی ہے؟ مسٹر کھنہ کی رپورٹ تھی۔ پہلے ان کی بات سنی ہے۔ اب آپ کی بات سن رہا ہوں۔"

ویاس اور زیادہ سختی سے بولا—— "اچھا سنئے' یہ لوگ۔" اس نے بلونت کھنہ اور یشونت کھنہ کی طرف اشارہ کیا' "مجھ پر چوری کا الزام لگا رہے ہیں۔ آپ مجھے حراست میں لیں گے۔ مجھے ضمانت دینی ہوگی۔ میں اپنے ضامن بلانے کے لئے فون کرتا ہوں اور میں ایک وکیل کو بھی حالات کا جائزہ لینے کے لئے یہاں بلانا چاہتا ہوں۔"

انسپکٹر کا چہرہ اور بھی سنجیدہ ہوگیا۔ دوبار جھجک کر بولا—— "اپنا کچھ تعارف کرانے کی عنایت کیجئے۔"

ویاس نے بش شرٹ کی جیب سے اپنا کارڈ نکال کر انسپکٹر کی طرف بڑھا دیا—— "میرا نام کے۔ ایل ویاس ہے۔ کارڈ پر میرا پتہ ہے۔ فون نمبر 77099 ہے۔ آپ انڈین ہیرالڈ' کے دفتر میں فون کر کے دریافت کرسکتے ہیں' میں وہاں جوائنٹ ایڈیٹر ہوں۔ آپ ایڈیٹر مسٹر ناتھن سے کہئے' میں چوری کے الزام میں پکڑا گیا ہوں اور میں انہیں ضمانت دینے کے لئے نمبر ے میکالے روڈ پر بلا رہا ہوں...."

بند دروازے کو پیٹنے کی آواز ایک بار پھر بہت زور سے سنائی دی۔

ویاس اشتعال میں کھڑا ہوگیا—— "یہ بھڑبھڑاہٹ آپ نہیں سن رہے ہیں؟ ان لوگوں نے مس اترا کو کمرے میں بند کردیا ہے۔ انہیں سامنے کیوں نہیں آنے دیا جاتا؟ شی از آف میجر ایج' بالغ ہیں۔ وہ میری گواہ ہیں۔ آپنے کئی بار بھڑبھڑاہٹ سنی ہے۔ آپ اس پر ایکشن کیوں نہیں لے رہے ہیں؟ میں اس کی اطلاع پولیس اسٹیشن پر دینا چاہتا ہوں۔ آپ مجھے سپرنٹنڈنٹ مسٹر ماتھر سے بات کرنے دیجئے۔'

انسپکٹر نارائن نے گہری سانس لے کر بلونت کی طرف دیکھا—— "یہ کیا الجھن ہے!" وہ ویاس کی طرف گھوم کر بولا' "مسٹر ویاس' آپ تشریف تو رکھئے۔"

دروازہ پیٹنے کی آواز پھر سنائی دی۔

ویاس نے پُراعتماد انداز میں اپیل کی۔۔۔۔ "آپ پہلے مس کھنہ کو قید سے چھڑائیے اور انہیں یہاں بلائیے، الجھنیں خود بخود سلجھ جائیں گی۔"

بلونت بول اٹھا۔۔۔۔ "مس کھنہ گھر میں نہیں ہیں۔ پریشد میں گئی ہیں۔"

ویاس نے ایک قدم آگے بڑھ کر درخواست کی۔۔۔۔ "انسپکٹر صاحب، مس کھنہ مکان میں ہیں۔ چند منٹ پہلے مجھ سے بات کر رہی تھیں۔ میں آپ سے مکان کی تلاشی لینے کی گذارش کر رہا ہوں۔ یہ درخواست میں پریس کے نمائندے کی حیثیت سے کر رہا ہوں۔ میں اس تلاشی میں گواہ رہوں گا۔ آپ چاہیں تو اور گواہ بھی بلا سکتے ہیں۔ اگر آپ میری رپورٹ پر ایکشن نہیں لیں گے تو اس کی ذمہ داری آپ پر ہوگی۔"

انسپکٹر نارائن پریشانی میں کھڑا ہوگیا۔ بہت نرمی اور عزت سے ویاس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر اس نے کہا۔۔۔۔ "ویاس صاحب، غصہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ تشریف رکھیئے۔ آپ کی بات پر معقول دھیان دیا جائے گا۔

انسپکٹر نے ویاس کو صوفے پر بیٹھا دیا اور بلونت کی طرف گوم کر بولا۔۔۔ "مسٹر کھنہ، ذرا ٹھہرئیے!"

انسپکٹر نارائن کھنہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پارٹیشن کی طرف دو قدم ہی بڑھا تھا کہ ویاس نے پھر اصرار کیا۔۔۔۔ "انسپکٹر صاحب، آپ تحقیقات کرنے آئے ہیں یا سازش کرنے! آپ پہلے مس کھنہ کو بلوائیے!"

انسپکٹر نارائن نے ویاس کی مخالفت کو نظر انداز کرکے کھنہ کے کان میں اپنی بات کہہ دی اور ویاس کو مخاطب کیا۔۔۔۔ "ویاس صاحب، مجھے حیرت ہے، آپ جیسے عزت دار آدمی کے ساتھ یہ غلط فہمی کیسے ہوگئی؟ آپ اس جھگڑے کو چھوڑیئے۔ آپ فرمایئے، کہاں تشریف لے جانا چاہتے ہیں، آپ کو پہنچا دیا جائے۔"

ویاس نے اونچی آواز میں مخالفت کی۔۔۔ "نہیں صاحب، میرے ساتھ دھوکا کیا گیا ہے۔ مجھ پر حملہ گیا گیا ہے، میری بے عزتی کی گئی ہے۔ میری گذارش ہے، آپ مس کھنہ کو بلوائیں اور چوری کی رپورٹ کی تحقیقات کریں۔ میں ان سے پوچھنا چاہتا ہوں، انھوں نے مجھے کیوں بلوایا ہے۔ ان پر بھی جبر ہو رہا ہے۔ جب تک وہ نہیں

آئیں گی' میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ آپ میرے چہرے پر چوٹ اور ان لوگوں کے (اس نے کھنہ بھائیوں کی طرف اشارہ کیا) برتاؤ کے گواہ ہوں گے۔"

انسپکٹر نے ویاس کو اپنائیت کے انداز میں سمجھایا۔۔ "ویاس صاحب آپ بہن بھائیوں کے جھگڑے میں کیوں پڑ رہے ہیں؟ آپ چلئے۔ آپ کی چوٹ کا ڈاکٹر سے ڈریسنگ کرالینا صحیح ہوگا۔"

دروازہ پیٹنے کی آواز پھر زور سے آئی اور دبی چیخ بھی سنائی دی۔

ویاس غصے سے للکارا۔۔۔۔ "آپ جرم کو دیکھ کر اسے نظر انداز کر رہے ہیں۔ بھائی اپنی بہن کو قتل کردے تو آپ اسے بھائی بہن کا جھگڑا کہہ کر نظر انداز نہیں کرسکتے۔ آپ کو معلوم کرنا چاہیے کہ مس کھنہ کو کیوں بند کیا گیا ہے! مجھے مس کھنہ نے فون کر کے بلایا ہے تو میں ان سے ضرور پوچھوں گا کہ انہوں نے مجھے کیوں بلایا ہے!"

"اچھا' آپ تشریف رکھئے۔" انسپکٹر نے اور بھی نرمی سے گذارش کی اور بلونت اور یشونت کو پارٹیشن کی طرف لے جاکر بات کرنے لگا۔

یشونت گردن جھکائے مجبور ہو کر پیچھے کے دروازے کی چٹخنی کھول کر اندر گیا۔ دروازہ کھلنے پر' دروازہ کھلنے کی آواز اور چیخ زیادہ صاف سنائی دی۔

ویاس نے پھر انسپکٹر کو مخاطب کیا۔۔۔۔ "آپ دیکھ رہے ہیں' کتنا ظلم ہو رہا ہے۔"

یشونت نے اپنے پیچھے دروازہ بند کرلیا۔

انسپکٹر' ویاس کے قریب صوفے پر بیٹھ گیا اور پوچھنے لگا۔۔۔۔ "ویاس صاحب' یہ سب کیا اور کیسے ہوگیا' مجھے آپ سے پوری ہمدردی ہے۔ آپ اس جھگڑے میں کیسے پھنس گئے آپ غور کیجئے اس معاملے میں۔۔۔۔"

بند دروازے کے پیچھے سے یشونت کی آواز سنائی دی۔۔۔۔ "ذرا سنو! پلیز۔۔۔"

"نو آئی ڈونٹ کیئر۔ کچھ پرواہ نہیں۔۔۔" اترا کے غصے سے چلا کر جواب دینے کی آواز آئی۔

دروازہ کھل گیا۔ اترا غصے اور رونے کی وجہ سے لال ہوئے چہرے کو آنچل سے

پونچھتی ہوئی بدحواسی کے عالم میں کمرے میں داخل ہوئی۔ آتے ہی بولی۔۔۔ "میں نے بلایا ہے' انھیں میں نے بلایا ہے۔ آپ لوگ کیا کر رہے ہیں۔۔۔"

ویاس اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس نے انسپکٹر کو مخاطب کیا۔۔۔ "سن لیجئے۔ آپ گواہ ہیں۔"

انسپکٹر نے صوفے سے اٹھ کر اترا کو تسلی دی۔۔۔ "مس کھنہ' آپ پرسکون ہو جائیے۔ آپ کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں ہوگی۔"

اترا ویاس کے زخمی ہونٹ اور آستین پر لگے خون کی طرف اشارہ کر کے غصے سے چلائی۔۔۔ "ظلم کیسے نہیں ہو رہا۔ انھیں مارا گیا ہے۔ انھیں میں نے بلایا ہے۔" وہ یشونت اور بلونت کی طرف گھوم کر بولی۔۔۔ "آپ کو مارنا ہے تو مجھے ماریئے۔"

انسپکٹر نے شکایت آمیز نظر سے بلونت کی طرف دیکھا۔

بلونت کے چہرے پر بے بسی طاری تھی۔ اس نے ہونٹ دانتوں سے دبا لیے۔

نارائن نے حالات کو سنبھالنے کے لئے اترا کی طرف بڑھ کر کہا۔۔۔ "دیکھو بٹن' جو ہوا بہت برا ہوا۔ اب میں یہاں موجود ہوں' یقین رکھو۔ آپ منہ دھو کر آیئے۔ باقی باتیں آپ کے سامنے ہی ہوں گی۔ آپ اپنے مہمان کو بھی اطمینان دلا سکتی ہیں۔"

نارائن نے یشونت کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر حکم دیا۔۔۔ "مسٹر کھنہ' آپ بٹن کو لے جا کر ان کا منہ دھلوا لائیں۔"

اترا تڑخ کر بولی۔۔۔ "آپ میری فکر نہ کیجئے۔ مجھے منہ دھونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آپ لوگوں کو جو بات کرنی ہے' میرے سامنے کیجئے۔" اس نے آنچل سے منہ پونچھ لیا اور سامنے آئے بالوں کو ماتھے کے پیچھے کی طرف ہٹا کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

"ٹھیک ہے' ٹھیک ہے" انسپکٹر نے مان لیا' "دیٹ از آل رائٹ۔ میں تو صرف آپ کی آسانی کے خیال سے کہہ رہا تھا۔ آف کورس' بہت افسوس ناک واقعہ ہو گیا ہے' بڑی غلط فہمی ہو گئی ہے۔ اسے ختم ہونا چاہئے۔ ویاس صاحب آپ تشریف رکھیے۔"

نارائن نے ویاس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے صوفے پر بیٹھا دیا اور خود بھی ایک کرسی پر بیٹھ کر بولا--- "ہاں دیکھئے' غلط فہمی میں کیا سے کیا ہوگیا۔ رمیلی' بہت افسوس ناک بات ہے۔ ویاس صاحب جیسے عزت دار اور نیک آدمی کے ساتھ شدید ناانصافی ہوئی ہے۔ غلط فہمی چاہے جیسے بھی ہو' میرے خیال میں مسٹر بلونت اور مسٹر یشونت کو ویاس صاحب کے سامنے یقیناً افسوس ظاہر کرنا چاہیے۔' میں زور دے کر کہوں گا کہ معافی مانگنی چاہئے۔"

ویاس نے نارائن کی ہمدردی کو نامنظور کرتے ہوئے کہا--- "انسپکٹر صاحب' میرا خیال ہے کہ آپ اپنے فرض کی حد سے باہر جارہے ہیں۔ آپ کو چوری کی واردات کی رپورٹ ملی ہے۔ آپ تحقیقات کیجئے۔ فیصلہ عدالت میں ہوگا۔"

بلونت نے اپنی کرسی پر آگے کی طرف جھک کر کہنا چاہا--- "بٹ... بٹ..."

نارائن نے اسے ٹوک دیا--- "پولیس آفیسر کے ناتے نہ سہی' ایک شہری کے ناتے بھی تو میں بات کرسکتا ہوں۔ پولیس کا کام جھگڑے کو روکنا ہی نہیں' بلکہ سمجھوتے میں مدد کرنا بھی ہے۔ میں کسی بھی حقیقت سے انکار نہیں کررہا ہوں۔ میری گستاخی معاف کیجئے' میں آپ سب کو دوست سمجھتے ہوئے بات کرنا چاہتا ہوں۔ عدالت میں جانا میرے خیال میں شاید آپ جیسے لوگوں کی عزت کو نظر میں رکھتے ہوئے مناسب نہیں ہوگا۔"

ویاس نے اشتعال بھرے انداز میں کہا--- "میری عزت پر آنچ آنے میں کسر ہی کیا رہ گئی ہے؟"

اترا نے حمایت کی--- "ہاں' اس میں کیا شک ہے۔ ان کی بہت بے عزتی ہوئی ہے۔"

میں بھی یہی کہہ رہا ہوں' بے شک بہت برا ہوا ہے۔' نارائن نے اترا کو مخاطب کیا' "بہن آپ مجھے معاف کریں گی۔ اس واقعے کی ذمہ داری' جانے یا انجانے میں آپ کے بھائیوں پر ہے۔ ہمیں معاملے کو سلجھانے کی کوشش کرنی چاہیے اور مسٹر بلونت اور مسٹر یشونت کو ویاس صاحب سے عاجزانہ معافی مانگنی چاہئے' ورنہ معاملہ سلجھنے کے بجائے اور الجھ جائے گا۔"

ویاس نے دھمکی دی--- "معاملہ سلجھنے یا الجھنے سے آپ کو کیا مطلب؟ معاملہ تو عدالت میں سلجھے گا اور خطوط کے ذریعے پورا سماج اس پر اظہار خیال کرے گا۔"

"پورا سماج؟" انسپکٹر نے بھنویں چڑھا کر سب لوگوں کی طرف دیکھا اور تشویش کا اظہار کیا-- "کیا کہہ رہے ہیں آپ' ذرا سوچئے' کھنہ خاندان میں ویاس صاحب جیسے لوگوں کو کون نہیں جانتا؟ غور کیجئے' عدالت میں خاص بات ہوگی بہن اترا کی گواہی اور گواہی پر جرح۔"

"آف کورس۔ مجھے یقین ہے' اترا جی عدالت کے سامنے سچ ہی کہیں گی۔" ویاس بولا۔

"ضرور' میں سچ کہوں گی۔" اترا نے عزم کے ساتھ تائید کی۔

"سچ ہو یا جھوٹ!" انسپکٹر نے آنکھوں سے شبہ کا اظہار کیا۔ "مسز' سچ یا جھوٹ جو کچھ بھی ہو' عدالت میں جانا اور وکیلوں کی جرح کا جواب دینا دشوار گذار معاملہ ہوتا ہے۔ جانتے ہیں آپ لوگ کہ وکیل جرح میں کیسے سوال کرسکتے ہیں! کسی کو بھی کتنا ذلیل کرسکتے ہیں! اس افسوس ناک واقعے کی بنیاد' میرا خیال ہے اپنے خاندان کی عزت بچانے کے لئے مسٹر کھنہ کی بے قراری تھی۔ امید ہے اترا بہن بھی میری بات سے متفق ہوں گی۔"

اترا نے مخالفت کی--- "اس میں خاندان کی عزت کا کیا سوال تھا؟ اپنے خاندان کی عزت کے لئے کیا کسی کی جان لیں گے؟ خواہ مخواہ کسی کا منھ کالا کردیں گے!"

انسپکٹر نے تائید کی--- "بہن' آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہیے تھا۔ میری تو رائے ہے کہ یہ آپ کے بھائیوں کی غلطی ہے۔ سمجھ اور برتاؤ دونوں میں غلطی ہوئی ہے۔ یہ خاندان کی عزت کی حفاظت کا حیرت انگیز جذبہ تھا۔ اب میں غلطی کے مارجن اور عزت کی حفاظت کے جذبے کی بات کررہا ہوں۔ بہن کو عدالت میں جانا پڑا تو ان کی اور آپ کی عزت کی کیا حفاظت ہوگی؟"

ویاس جھنجھلایا--- "اگر مجھ پر چوری کا الزام کامیابی سے لگایا جاسکتا تو کیا مس اترا کی گواہی عدالت میں نہ ہوتی؟ بہن کو عدالت میں لے جانے کا انتظام تو ان کے

بھائیوں نے خود ہی کیا ہے۔"

انسپکٹر۔۔۔ "آف کورس، دراصل بھول تو مسٹر بلونت اور مسٹر یشونت نے کی ہے۔ میں کہہ چکا ہوں کہ اس شرم ناک واقعے کے لئے دونوں بھائیوں کو افسوس ظاہر کرکے معافی مانگنی ہی چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ کھنہ بھائی اپنے خاندان کی عزت کے خیال سے عدالت میں جانا نہیں چاہیں گے اور ویاس جی کی پوزیشن جان لینے پر ان کا عدالت میں جانا بھی مناسب نہیں سمجھیں گے۔"

ویاس کا زخمی ہونٹ پھڑ پھڑا اٹھا۔۔۔ "جی ہاں، خاندان کی عزت بچانے کا یہ ڈھنگ بہت اچھا ہے کہ پولیس کی مدد سے مجھے چور بنا کر جیل بھجوانے کی سازش کی جائے۔"

بلونت نے گھبراہٹ کی وجہ سے ہکلاتے ہوئے کہا۔۔۔ "آ۔آ۔آئی نیور تھ۔ تھ۔ تھاٹ سوفار۔ ہمارا ایسا ارادہ نہیں تھا۔ صرف...."

ویاس کا غصہ بڑھ گیا۔۔۔ "جی ہاں، آپ شاید کسی ڈرامے کی ریہرسل کر رہے تھے۔ اب پانسا پلٹ گیا ہے تو آپ کا مطلب بھی پلٹ گیا۔ اب عدالت میں جانے میں آپ کی ناک کٹنے لگی۔ آپ عدالت کیوں جائیں گے؟ لیکن میں تو جاؤں گا۔ میرے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ میری ہتک عزت ہوئی ہے۔ اب میں ہی عدالت جاؤں گا اور انسپکٹر صاحب گواہ ہوں گے۔"

نارائن۔۔۔ "ویل ویل، ایز فیکٹس گو، آئی مین... میرا مطلب ہے کہ سچائی سے میں انکار نہیں کر سکتا۔"

بلونت نے آہستہ سے کہا۔۔۔ "لیکن یہ سب...."

نارائن نے اسے سننے کے لئے اشارہ کیا۔۔۔ "لیکن اس وقت معاملہ تو مسٹر ویاس کے آنر کے ونڈیکیشن کا ہے اور یہ سب بات بس اترا کی گواہی پر منحصر ہے، یہ دھیان میں رکھئے۔"

اترا نے سر جھکا کر کہا۔۔۔ "میں سچ کہوں گی، میں نے انہیں بلایا تھا۔"

"ڈیئر یو آر۔ سن لیا آپ نے؟" ویاس نے آگاہ کیا۔

نارائن بولا۔۔۔ "میرا مطلب ہے کہ غلط فہمی سے ہوئے واقعات کی بنا پر

عدالت میں بحث' اس پر وکیلوں کی جرح اور پھر اخباروں میں اس کی اشاعت کس کے لئے باعث عزت ہوگی؟ کہئے مسٹر کھنہ' بمن اترا آپ ہی بتایئے؟"

دونوں سر جھکائے خاموش رہے۔

ویاس نے کہا۔۔۔ "میں یہ شوق سے نہیں کررہا ہوں۔ مجھے مجبور کردیا گیا ہے۔"

نارائن نے کہا' "آئی ایڈمٹ' میں آپ سے متفق ہوں اور میں مسٹر بلونت اور مسٹر یشونت سے صاف صاف کہہ دینا چاہتا ہوں کہ دونوں بھائیوں کو اس واقعے کے لئے ا نکنڈیشنل معافی مانگنی چاہیے۔ اگر بمن اترا میری گستاخی معاف کریں تو میں ان سے گذارش کروں گا کہ وہ اپنے بھائیوں کو ویاس جی سے معافی مانگنے کے لئے مجبور کریں۔"

اترا نے سر جھکا کر ساڑی کا کنارہ دانتوں میں دبا کر کہا۔۔۔ "یقیناً مانگنی چاہیے۔"

ویاس کو غصہ آگیا۔ وہ تیکھے انداز میں بولا۔۔۔ "معافی مانگ لینے کا کیا مطلب ہے؟ دیٹ از اونلی سنوبری۔ معافی تو کسی سے کہنی چھل جانے پر بھی مانگی جاسکتی ہے!"

پھر ویاس نے اپنے زخمی ہونٹ کی طرف اشارہ کرکے پوچھا۔۔۔ "یہ کیا صرف کہنی چھل جانا ہے؟ کسی کو گھر پر بلوا کر چور بنا دینے سے قصور کا مارجن سوری' کہہ دینے سے کم ہوجائے گا؟"

نارائن کی شکل بہت سنجیدہ ہوگئی' بڑے دھیان سے ویاس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولا۔۔ "ٹھیک ہے۔ بتایئے آپ کے خلاف ہوئی ناانصافی کی تلافی کس طرح ہونی چاہئے؟ آپ اپنی شرط پیش کیجئے۔ آئی تھنک یو آر رائٹ۔"

ویاس نے بے جھجک ہوکر جواب دیا۔۔۔ "میں کہوں گا' مجھ پر لگائے گئے داغ کی پوری تلافی ہونی چاہئے۔"

اترا' جو اپنی ساڑی کے کونے کو انگلی سے بٹتے ہوئے اس پر نظر جمائے ہوئے تھی' بولی۔۔۔ "ضرور ہونی چاہئے۔"

یشونت کے منہ سے نکل گیا۔۔ "آپ کیا چاہتے ہیں؟"

نارائن نے اسے ٹوک کر اترا کو مخاطب کیا۔۔ "یہ ٹھیک ہے کہ ویاس جی کے

بے عزتی کی مناسب تلافی ہونی چاہیے لیکن کیسے؟ آپ ذرا سکون سے سوچئے' وی ہیو تو تھنک اباؤٹ اٹ کالمی۔"

ویاس نے سرہلا کر نارائن کی تجویز سننے سے انکار ظاہر کیا۔۔ "فیصلہ عدالت میں ہی ہوگا۔"

"عدالت میں؟' نارائن نے پوچھا' آپ بہن اترا کو عدالت میں گھسیٹئے گا؟'

ویاس غصے سے ابل پڑا۔۔۔ "انسپکٹر صاحب' یہ کیا اتنی چھوٹی بات ہے؟ میری عزت کی کوئی قیمت نہیں؟ میرے پاس بنگلے نہ ہوں' موٹریں نہ ہوں لیکن میری بھی خودداری ہے؟ میں سر دے سکتا ہوں' بے عزتی اور توہین نہیں نگل سکتا!"

اس بار انسپکٹر بھی اونچی آواز میں بولا۔۔۔ "آپ بدلہ چاہتے ہیں؟ کھنہ صاحب کی بہن کو عدالت میں کھڑا کرکے ہی آپ کی عزت کی حفاظت ہوگی؟"

ویاس غصے میں صوفے سے اٹھ کر بہت اشتعال سے بولا۔۔۔ "انسپکٹر صاحب' آپ طرفداری کر رہے ہیں' آپ کے لئے مناسب نہیں۔"

"میں کیا طرفداری کر رہا ہوں' ویاس صاحب؟ میں تو آپ سے پوچھ رہا ہوں کہ کیا آپ کی بے عزتی کی تلافی صرف عدالت میں ہوسکتی ہے؟" نارائن نے پوچھا۔

"سرٹینلی' اونلی ان کورٹ!' ویاس نے دھمکی کے انداز میں جواب دیا۔

"آپ بھی کورٹ میں ہی جانا مناسب سمجھتی ہیں؟" انسپکٹر نے دھیمی آواز میں اترا سے سوال کیا۔

"عدالت کے سامنے صاف اور سچی بات کہنے میں مجھے کیا ڈر ہے" اترا نے بے خوف ہوکر کہا۔

"ہوں!" نارائن نے اپنی پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر لمحے بھر کے لئے سرجھکا کر کچھ سوچا اور اترا سے سوال کیا۔۔۔ "آپ عدالت میں صاف سچی بات کو ثابت بھی کرسکیں گی؟"

"سچ کو ثابت کرنے کا کیا مطلب؟" اترا نے حیرت سے پوچھا۔

"مطلب یہ ہے' اگر وکیلوں نے آپ کی بات پر اعتبار نہ کرکے جرح کی تو آپ جواب دے سکیں گی؟" نارائن نے پوچھا۔

"کیوں نہیں، میں سچ بولنے سے نہیں ڈرتی۔" اترا پھر بے خوف ہو کر بولی۔

"آپ ڈرتی نہیں ہیں۔" نارائن بہت پیار سے بولا، "پھر بھی میں آپ کو حالات سمجھا دینا چاہتا ہوں۔ آپ کبھی عدالت میں گئی ہیں؟ آپ نے کبھی جرح سنی ہے؟"

"عدالت میں نہیں گئی، تو کیا ہوا، آئی ایم ناٹ آفریڈ!" اترا نے پختہ انداز میں کہا۔

"آف کورس، یو آرناٹ افریڈ۔" نارائن نے قبول کیا، "میں آپ کو اپنی بہن مان کر حالات سمجھا دینا چاہتا ہوں، ڈو یو مائنڈ؟

"نو، آئی ڈونٹ مائنڈ۔"

"ویل، وکیل سوال کر سکتا ہے کہ آپ نے کیا مسٹر ویاس کو اپنے گھر میں اپنے بھائیوں کی اجازت یا دانست سے بلایا تھا۔ آپ کو ماننا پڑے گا کہ آپ نے ان بھائیوں کی اجازت یا معلومات کے بغیر بلایا تھا۔ ٹھیک ہے نہ؟"

"یس۔"

"دیکھیے بہن برا نہ مانیے گا، میں آپ کو صرف حالات سمجھا رہا ہوں۔ وکیل جرح کر سکتا ہے کہ کیا آپ نے مسٹر ویاس کو اس طرح بھائیوں سے چھپا کر، ایک بار ہی بلایا تھا یا اکثر بلاتی رہتی ہیں؟ یا آپ مسٹر ویاس سے، اس طرح کتنی بار اور کتنے مقامات پر کس خفیہ مقصد سے مل چکی ہیں؟ یا جرح کرے گا، کیا آپ صرف مسٹر ویاس سے ہی اس طرح ملتی ہیں یا کئی نوجوانوں سے بھی اس طرح ملتی رہی ہیں؟ وہ پوچھ سکتا ہے کہ یہ آپ کا صرف شوق ہے یا مسٹر ویاس سے آپ کا کوئی خاص مقصد ہے؟ اس طرح کے چال چلن والی لڑکیوں کو عموماً کیسا سمجھا جاتا ہے؟ عدالت میں جو بھی سوال کیے جائیں گے، آپ کو ان کے جواب دینے ہی ہوں گے، یہ آپ کو جان لینا چاہیے۔"

اترا گردن جھکائے خاموش کھڑی رہ گئی۔

"انسپکٹر صاحب، آپ گواہ کو انٹی میڈیٹ (خوف زدہ) کر رہے ہیں۔" ویاس نے بہت غصے سے مخالفت کی۔

انسپکٹر نارائن دھمکانے والی آنکھوں سے، لیکن نرمی سے بولا۔۔ "ویاس صاحب،

میں گواہ کو انٹی میڈیٹ نہیں کر رہا ہوں۔ میں آپ کو اور بہن ازا کو اصل حالات بتا رہا ہوں۔ میرا خیال ہے آپ کے دل میں ازا بہن کے لئے عزت کا جذبہ ہے۔ آپ عدالت میں یہی قبول کریں گے تا کہ مس کھنہ نے بھائیوں سے چھپ کر آپ کو گھر پر بلایا تھا۔"

ویاس بہت غصے میں بولا۔۔۔ "انسپکٹر صاحب' آپ مجھ پر غیر مناسب دباؤ ڈال رہے ہیں۔ آئی مسٹ گو ٹو دی کورٹ!"

ازا کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ وہ اچانک اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور ویاس کی طرف منھ کر کے بولی۔۔۔ "اچھا' آپ کو جو کرنا ہے' آپ بھی کر لیجئے۔"

ازا نے بھائیوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔۔۔ "ان کے لئے خاندان کی عزت کے مقابلے میں میری کوئی قیمت نہیں۔ آپ کی شخصیت کی عزت کے سامنے بھی میرا کوئی وجود نہیں۔ سب کی عزت ہے' لڑکی کی عزت کچھ نہیں۔"

ازا کی آواز اور اونچی ہو گئی۔ " میں عدالت میں نہیں جاؤں گی' نہیں جاؤں گی۔"

ازا بیٹھک سے جانے کے لئے گھوم گئی۔

"چاہے سائنائڈ کھا کر ہی سو جانا پڑے۔۔۔"

سادھو اور چور

دوست کو دہلی پہنچنے کی اطلاع بذریعہ تار دے دی تھی لیکن بمبئی میل اسٹیشن پر ڈیڑھ گھنٹہ دیر سے پہنچی۔ سوچا، دوست کے یہاں چائے ناشتہ ہوچکا ہوگا، اسے دوبارہ ناشتہ تیار کرنا پڑے گا۔ سامان ویٹنگ روم بیرے کو سونپ دیا۔ ناشتہ اسٹیشن کے ہوٹل میں کرلیا۔ ویٹنگ روم میں واپس آکر بزرگ بڑے میاں سے ایک قلی کو بلا لینے کی گذارش کی۔

چلتے وقت سگریٹ سلگا لینے کی خواہش ہوئی۔ کیس میں سگریٹ ختم ہوچکے تھے۔ سوٹ کیس کھول کر نیا پیکٹ نکال رہا تھا کہ ویٹنگ روم کا دروازہ کھلا۔ ایک خوش پوش نوجوان اندر آیا۔ وہ سرمئی رنگ کی ہلکی اونی پینٹ اور کوٹ پہنے تھا۔ ہاتھ میں اخبار رول کی طرح لپٹا ہوا تھا۔

یاد آیا ــــ سفر کے دوران بھی وہ نوجوان کچھ اسٹیشنوں پر دکھائی دیا تھا۔ جب ٹرین لمبے سفر کے بعد کسی اسٹیشن پر رکتی تھی تو وہ بیٹھے رہنے سے اوب جانے کی وجہ سے چہل قدمی کے لئے پلیٹ فارم پر اتر جاتا تھا۔ وہ نوجوان اخبار پڑھتا ہوا یا ویسے ہی چہل قدمی کرتا ہوا میرے پاس سے گذر جاتا تھا۔ ہمیں ایک دوسرے سے مطلب نہیں تھا اس لئے آنکھیں مل جانے پر بھی شرافت سے نظریں بچا لیتے۔ جس وقت میں ہوٹل میں ناشتہ کر رہا تھا، بمبئی میل پنجاب کی طرف روانہ ہوچکی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا، شاید اسے یہاں گاڑی بدلنی ہے۔ ویٹنگ روم میں بیٹھ کر انتظار کرے گا۔

نوجوان ویٹنگ روم میں آتے وقت میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔ آنکھیں مل گئیں۔ اس نے قریب آکر کچھ تامل کے ساتھ انگریزی میں مجھے مخاطب کیا۔ ''اگر آپ ایک منٹ بیٹھیں تو میں آپ سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں!''

نوجوان کی آواز اور لہجے میں جھجک اور بے یقینی سے محسوس ہوئی۔ اچانک خیال

آیا.... وہی بات ہوگی، گاڑی سے اتر کر پھاٹک پر گیا۔ ٹکٹ دینے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ حفاظت کے لئے ٹکٹ بٹوے میں رکھ لیا تھا.... بٹوا ہی غائب۔ شرم کے مارے کچھ کہہ نہیں سکتا۔ ۔ ۔ میرا پتہ لکھ لیجئے۔ ایک مہذب انسان ہونے کے ناتے جو مدد آپ کریں گے، اس سے سبکدوش ہونا اپنا اخلاقی فرض سمجھوں گا۔ ۔ ۔ وغیرہ وغیرہ۔ انسانیت اور رحم کی آڑ میں لوٹنے والے مہذب لوگوں کی پوری تصویر اچانک ذہن میں ابھر آئی۔ ایسے آدمی مہذب لوگوں کا یہ فرض سمجھتے ہیں کہ مہذب طبقے کے لوگوں کی عزت کی حفاظت کی خاطر ہم لوگوں کو ان کی فریب کاری کا شکار بننا چاہئے۔

دل میں اٹھی بیزاری کو دبا کر مہذب لوگوں کی وضع کو نبھانے کے لئے سگریٹ کا تازہ کھولا گیا ٹین اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔۔۔ "پیتے ہیں! لیجئے!

نوجوان نے آہستہ آواز سے شکریہ ادا کرکے سگریٹ لے لیا۔ کرسی بالکل میرے قریب کھینچ لی اور میرے سگریٹ سلگا لینے کے انتظار میں ہاتھ میں پکڑے ہوئے اخبار کو رول کی طرح لپیٹتے ہوئے اس نے معافی مانگی۔۔ "آپ بیٹھئے، مجھے ایک ہی بات پوچھنی ہے۔"

نوجوان کے برتاؤ سے کچھ حیرت ہوئی۔ ایک سگریٹ اپنے ہونٹوں میں دبالی۔ ماچس جلا کر پہلے نوجوان کی طرف بڑھا کر پوچھا۔۔ "حکم کیجئے!" اس نے سگریٹ سلگالی اور مجھ سے بیٹھنے کی دوبارہ گذارش کی۔ اب کچھ شبہ ہوا، شاید خفیہ پولیس کا آدمی ہے لیکن مجھ سے کیا مطلب!

بیٹھ کر میں نے پھر پوچھا۔۔ "کہئے؟"

نوجوان مجھ سے نظریں ملا کر انگریزی میں بولا۔۔ "میری بات سے پریشان نہ ہوں۔ یقین کیجئے، مجھ سے آپ کو کسی بھی طرح کا نقصان یا تکلیف نہیں ہوگی۔" اور پھر جھجک کر بولا۔۔ "یہ بتایئے، آپ کے پاس ہزار ہزار کے چالیس نوٹ ہیں؟"

میرے جسم میں برق سی دوڑ گئی۔ پہلا اندیشہ یہی ہوا کہ اب پستول دکھائے گا۔ پستول دکھائی نہیں دیا۔ دل میں دوسرا اندیشہ پیدا ہوا۔ ۔ ۔ ٹٹول کر دیکھ لو کہ نوٹ محفوظ ہیں یا نہیں لیکن حفاظت کے خیال سے ایسا نہیں کیا۔

ویٹنگ روم میں ہم دونوں ہی تھے۔ مجھے اکیلا دیکھ کر ہی وہ آیا تھا۔ بزرگ بیرا

مہذب لوگوں کے طور طریقوں سے واقف تھا۔ دو مہذب لوگوں کو آپس میں بات کرتے دیکھا تو آڑ میں چلا گیا تھا۔ اپنی گھبراہٹ چھپانے کے لئے سگریٹ کے دھوئیں سے آنکھیں چرچرانے کا بہانہ کرکے، پلکیں سکوڑ کر میں نے سوال کا جواب دیا۔

"کیا؟.... میں سمجھا نہیں،.... کیسے نوٹ؟"

نوجوان نے سنجیدگی سے سمجھایا۔۔ "اگر آپ کے پاس چالیس ہزار روپیہ ہے اور آپ ڈر کی وجہ سے انکار کردیں گے تو ایک آدمی کی جان فضول ہی چلی جائے گی!"

نوجوان کی بات سے تسلی کے بجائے گھبراہٹ ہونے لگی۔ جواب دیا۔۔ "کس کی جان؟۔۔۔ کیسا چالیس ہزار؟ تمہارا مطلب کیا ہے؟"

میری گھبراہٹ نوجوان سے چھپی نہ رہ سکی۔ نوجوان نے اپنی کرسی میری طرف کھینچ لی اور سگریٹ کا کش لے کر بولا۔ "آپ گھبرایئے نہیں، سچ بات کہہ دیجئے۔ اگر آپ کے پاس روپیہ ہے تو بھی اب آپ کو کوئی خطرہ نہیں۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اس معاملے میں دھوکا تو نہیں دیا گیا؟ بمبئی سے آتے وقت آپ کو مماؤ میں تین سو روپے میں بیچا گیا تھا۔ اس کے بعد میں نے آپ کو اٹارسی اسٹیشن پر دو سو روپے میں خریدا ہے۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ہم لوگوں کو دھوکا تو نہیں دیا گیا؟" نوجوان سگریٹ سے کش لیتا ہوا جواب کے انتظار میں میری طرف دیکھتا رہا۔

اس کے ہاتھ میں پستول یا چھرا نہ دیکھ کر اور اس دوران کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے اپنی رقم محفوظ پاکر میں نے کچھ غصے سے جواب دیا۔۔۔ "میرے پاس کوئی روپیہ نہیں ہے۔ تم بڑے عجیب آدمی ہو!.... مجھے بیچنے اور خریدنے کا مطلب؟... تم ڈکیتی اور قتل کرتے ہو اور دھوکے کی شکایت بھی کرتے ہو! تم جیسے آدمی کو تو پولیس کے حوالے کردینا چاہئے!"

نوجوان نے سگریٹ کو پہلی انگلی کی طرح دھمکی کے انداز میں اٹھا کر مجھے ٹوک دیا۔۔ "پولیس سے میری شکایت کرنے سے کوئی فائدہ نہیں!... اس کا انتظام ہم لوگ پہلے سے رکھتے ہیں آپ کو ہی بے کار پریشانی ہوگی۔ آپ کی جیب تو کٹی نہیں! شکایت کس بات کی کیجئے گا؟ دھوکا تو میرے ساتھ ہوا تھا لیکن میں اپنے ساتھ دھوکا ہونے پر پولیس کے سامنے گڑگڑاؤں گا نہیں۔ ایسے دھوکے اور بے انصافی کی سزا دینا پولیس

کے اختیار اور اہلیت میں بھی نہیں۔ پولیس ہمارے انتظام کو قبول نہیں کرتی۔ ایسے قصور کی سزا ہم لوگ خود دیں گے لیکن آپ اب کوئی خوف نہ ہونے پر بھی اپنے پاس روپیہ ہونے سے انکار کردیں گے تو انجام کار بے انصافی ہوجائے گی۔"

ایسے باہمت اور صاف گو شخص سے بھروسا اور تسلی پاکر بھی میں اپنے پاس اتنی بڑی رقم ہونا قبول نہ کرسکا۔ الٹے اس سے پوچھا۔۔ "یہ سب کیا چکر ہے؟••• میں کچھ سمجھ نہیں پارہا ہوں۔ میرے پاس روپیہ ہونے سے تمہیں کیا مطلب؟••• میرے پاس روپیہ نہ ہونے سے کسی کی جان کیوں جائے گی؟"

نوجوان مجھے یقین دلانے کے لئے ہاتھ اٹھا کر بولا۔۔ "آپ نے کل ایک بجے بینک سے ہزار ہزار کے چالیس نوٹ لیے تھے•••• آپ بینک سے سیدھے اسٹیشن آئے تھے•••• نوٹ لے کر آپ نے اندر کی جیبوں میں رکھے تھے۔ ٹکٹ آپ نے خود نہیں خریدا۔ آپ کے نوکر یا منشی نے خرید کر دیا تھا۔ اتنا ٹھیک ہے؟" اپنے بارے میں اتنی تفصیل سے سب ہی باتیں سن کر گھبراہٹ اور بڑھ گئی لیکن حیرت ظاہر کرکے دہائی دی۔۔ "جانے تم کس کی بات کر رہے ہو؟••• کس کا روپیہ؟•••• مجھے بے کار کیوں گھسیٹ رہے ہو!"

میرے جواب سے نوجوان کی پریشانی اور فکر میں اضافہ ہوگیا۔ اس نے مجھے سمجھانا چاہا۔۔۔ "جس آدمی نے بینک سے آپ کا پیچھا کیا تھا' وہ منماڑ اسٹیشن تک آپ کے ساتھ آیا تھا۔ وہاں اس کے علاقے کی حد ختم ہوگئی۔ اس کا کہنا ہے کہ بمبئی سے گاڑی چھوٹنے تک روپیہ آپ کے کوٹ کے اندر جیب میں ضرور تھا۔ اس کے بعد آپ نے چاہے جہاں رکھ لیا ہو۔ منماڑ میں اس نے آپ کو تین سو روپے میں دوسرے آدمی کے ہاتھ بیچ دیا۔ یہ دوسرا آدمی اٹارسی تک آپ کے روپیہ رکھنے کی جگہ کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتا رہا۔ اٹارسی تک ناکام رہ کر اس نے مجھ سے بات کی اور سو روپے کا نقصان اٹھا کر اس نے آپ کو دو سو روپے میں میرے ہاتھ بیچ دیا۔ میں ہر طرح کی کوشش کرکے ہار گیا ہوں لیکن یہ معلوم نہیں کرپایا کہ آپ کے پاس روپیہ ہے تو آپ نے کہاں رکھا ہے؟ آپ کے کوٹ کی جیب میں صرف ایک نوٹ سو روپے کا اور دس دس کے دو نوٹ ہیں۔ آپ کے کوٹ اور پینٹ میں چور جیبیں نہیں ہیں۔

آپ مارواڑیوں کی طرح قمیص کے نیچے جیب دار بنڈی بھی نہیں پہنتے ہیں۔ آپ کی کمر میں ناگڑی بھی نہیں ہے۔ آپ نے روپیہ جوتے میں نہیں رکھا ہے ورنہ رات میں سوتے وقت آپ جوتا اتار کر نیچے نہ رکھ دیتے۔ روپیہ آپ نے سوٹ کیس یا بستر میں رکھ دیا ہوتا تو آپ مطمئن ہو کر ٹہلنے کے لئے اسٹیشنوں پر نہ اترتے یا ناشتہ کرنے کے لئے سامان کو لاپرواہی سے نہ چھوڑ جاتے! میں یہ بھی نہیں پوچھنا چاہتا کہ روپیہ آپ نے کہاں رکھا ہے؟ یہ میں خود جاننے کی کوشش کروں گا۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ہم لوگوں کو دھوکا تو نہیں دیا گیا۔ اپنی ناکامی کے لئے میں دو سو روپے کا نقصان اٹھالوں گا۔ اگر دو سو میں چالیس ہزار پانے کا داؤ لگایا جا سکتا ہے تو ایسے داؤ میں دو سو روپے کا نقصان کا غم بھی نہیں ہونا چاہئے لیکن داؤ داؤ ہے اور دھوکا دھوکا ہے! ہم لوگوں میں اگر دھوکا ہونے لگے تو ایک دن بھی کام نہیں چل سکتا۔ پہلے سے آپ کا پیچھا کرنے والے آدمی کو آپ کا دام چکائے بغیر میرا آپ کی طرف آنکھ اٹھانا بھی نامناسب ہوتا۔ بات یہ ہے کہ بمبئی سے آپ کا پیچھا کرنے والے آدمی پر کچھ دن پہلے بھی دھوکا دینے کا شبہ ہوا تھا۔ اگر اس نے اس بار بھی سچ دھوکا دیا ہے تو اسے سزا ضرور ملنی چاہئے۔ اس وقت میں گروہ کا لیڈر ہوں۔ دھوکا دینے والے کو سزا دینا میرا فرض ہے۔ فیصلہ آپ کے سچ بولنے پر منحصر ہے۔" جواب کے انتظار میں وہ میری طرف گھورتا رہا۔

مجھے جھجکتا دیکھ کر اس نے گذارش کی۔ "یقین کیجئے، اب آپ کو نقصان کا ڈر نہیں ہے، لیکن بے قصور کا خون ہونا بھی مناسب نہیں اور قصوروار کو سزا نہ ملنے سے یہ انتظام برقرار نہیں رہ سکتا۔"

ایک عزت دار جج کا جیسا قول ایک مجرم کے منہ سے سن کر مجھے غصہ آگیا۔ "تم خود جرم میں ڈوبے ہو!" میں نے جواب دیا۔۔۔ "تم سے بڑا مجرم کون ہے! تم دوسرے کو جرم کی سزا دو گے! اگر تم میری جیب کاٹ لیتے تو کیا یہ بے قصور کا خون نہ ہوتا؟۔۔۔ میں نے تمہارا کیا قصور کیا؟۔۔۔ بولو!" میں نے غصے سے اسے للکارا۔

"یہ آپ دوسری بات کر رہے ہیں۔" سکون سے اس نے جواب دیا۔ اس کی سگریٹ جل چکی تھی۔ سگریٹ اس نے فرش پر ڈال کر اپنے سینڈل سے دبادی۔ جیب

سے کیپسٹن سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔ پیکٹ میری طرف بڑھایا اور ایک سگریٹ ہونٹوں میں دبا کر، بھنویں سکوڑ کر وہ بولا۔۔ "یہ آپ بہت گہری بات کہہ رہے ہیں۔ اگر اس طرح سوچیں تو سب ہی باتیں جرم مانی جائیں گی۔ آدمی زندہ ہی نہیں رہ سکے گا۔ جرم تو اپنے اپنے سماج میں تسلیم شدہ ضابطے اور قانون کے مطابق ہی سمجھا جاتا ہے۔ برا نہ مانئے! اچھا آپ بتایئے' یہ چالیس ہزار کیا آپ نے ایمانداری سے کمایا ہے؟ یہ آپ کی محنت کی کمائی ہے یا آپ کی عقل مندی کی؟ بولیے!"

جانے کیوں' اس کی کڑوی بات کا جواب دینے کی خواہش سمجھئے یا اس کے اعتماد بھرے انداز سے بات کرنے کے ڈھنگ کی وجہ' میں نے جواب دیا۔۔ "یہ میرا روپیہ نہیں ہے۔ میں تو فرم کا نوکر ہوں۔ روپیہ فرم کا ہے۔ میں تو اپنے کام کے لئے تنخواہ پاتا ہوں!"

"اوہ یہ بات ہے!" سگریٹ کی راکھ جھاڑ کر کش کھینچتے ہوئے وہ بولتا گیا۔ "آپ کی فرم سے بھی تو سوال کیا جاسکتا ہے کہ فرم نے یہ روپیہ کس ایمانداری سے کمایا ہے؟ زیادہ محنت کرنے سے زیادہ روپیہ ملتا ہے' ایسی بات بھی نہیں۔ آپ اتنا روپیہ لے کر دلی اس لئے آئے ہوں گے کہ اس روپے سے فرم کے لئے اور زیادہ روپیہ' دو چار لاکھ روپے کمانے کا جگاڑ ہو جائے۔ شاید آپ کوئی ٹھیکہ لینا چاہتے ہیں یا کوئی سودا خرید کر گودام میں بند کردینا چاہتے ہوں گے۔ ان سب کاموں کو آپ ایمانداری کی محنت کہیں گے یا عقل مندی کی؟ سنئے' آپ کی فرم کے مالک تو اس سودے میں کچھ محنت کریں گے نہیں؟"

"کیوں نہیں کریں گے؟" نوجوان کی ناسمجھی پر میں نے ٹوکا۔۔۔ "تم جانتے کیا ہو۔۔۔ چالیس ہزار کیا ہوتا ہے!۔۔۔ یہ تو صرف ٹھیکہ لینے کے لئے نذرانہ یا رشوت ہے۔ اس کے بعد تو فرم کو اس کام میں دس پندرہ لاکھ کی رقم لگانی پڑے گی۔ گھاٹا بھی ہوسکتا ہے۔ کیا اس میں رسک نہیں؟ کیسی ناسمجھی کی باتیں کرتے ہو! یہ سب سوچنے اور کرنے میں دماغ کا تیل پسینہ بن کر ماتھے پر نکل آتا ہے۔۔۔

"یہی تو میں کہتا ہوں۔" نوجوان نے ہونٹوں سے دھوئیں کی لمبی لکیر چھوڑتے ہوئے قبول کیا۔۔ "میں نے دو سو روپے کا رسک لیا یا نہیں۔۔۔ کہئے! میں نے گھاٹا

اٹھایا یا نہیں؟ اگر میں آپ کی جیب سے نوٹ نکالتے وقت پکڑ لیا جاتا؟.... اس حالت میں مجھے پولیس کو طے شدہ ماہ وار سے پانچ سو یا ہزار اور زیادہ دینا پڑتا یا نہیں؟ جیل بھی کاٹنی پڑجاتی۔ ہم لوگ بھی عقل اور محنت کم خرچ نہیں کرتے۔ آپ بازار کا اندازہ لگاتے ہیں ہم آسامی کا اندازہ لگاتے ہیں۔ ہم اپنے اندازے کے لئے انگلیوں اور قدموں کی پھرتی پر انحصار کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر آپ ٹکٹ لینے کے لئے بھیڑ میں دبے ہوں۔ روئی کا پھایا آپ کے دائیں کان کے پیچھے چھلا دیا جائے۔ آپ کا داہنا ہاتھ کھجلانے کے لئے اٹھے گا اور آپ کے کوٹ کا پلا اٹھ جائے گا۔ اسی دوران آپ کی اندر کی جیب سے نوٹ کھینچ لیئے ہوں گے۔ کہیے' آپ اتنی صفائی سے کام کرسکتے ہیں؟ آپ کے طریقے دوسرے ہیں۔ آپ کی فرم اندازہ لگالیتی ہے کہ کس چیز کی کمی سے لوگوں کو پریشانی ہونے والی ہے فرم وہی چیز زیادہ مقدار میں جمع کرکے' لوگوں کی پریشانی بڑھا کر ان کی جیبوں سے خوب روپیہ کھینچ لیتی ہے یا آپ کی فرم بازار میں دس لاکھ کی مونگ پھلی بیچنے کے لئے سٹہ کرکے جنس کا بھاؤ گرادے گی۔ گرے ہوئے بھاؤ پر واقعی بیس لاکھ کی مونگ پھلی خرید لے گی۔ بھاؤ بڑھے گا لیکن مال روکے رہیں گے۔ لوگوں کو اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے مناسب سے زیادہ دام دینے کے لئے مجبور کریں گے۔ یہ بھی لوٹ کا طریقہ ہے۔ آپ کا وسیلہ ہے' آپ کا سرمایہ۔ کچھ لوگ چھری مار کر آسامی کو مجبور کرکے روپیہ چھین لیتے ہیں۔ آپ آدمی کو اپنے سرمایے سے مجبور کرتے ہیں۔ ہم لوگ چھری مار کر یا سیندھ لگا کر روپیہ لینا جہالت اور جنگلی پن سمجھتے ہیں اور اپنے طریقے کو عقل اور چالاکی اور سائنسی ڈھنگ سمجھتے ہیں' آپ اپنے طریقے کو صحیح سمجھتے ہیں۔"

"سنیئے!" ایک اور لمبا کش کھینچ کر وہ بولنے لگا۔ "میں دو سال پہلے یعنی ۱۹۴۳ میں' کلکتہ میں چاول کا کاروبار کرنے والی ایک فرم میں نوکر تھا۔ فرم نے چاول خرید کر مہنگائی کرنے کے طریقے سے چھ مہینے میں تین کروڑ روپیہ کمالیا۔ فرم تو چاول پیدا نہیں کرتی۔ لوگوں سے سستا چاول خرید کر انہیں مہنگے داموں بیچنے کے کھیل میں فرم نے تین کروڑ روپیہ کمالیا۔ اسے آپ ایمانداری کہیں گے یا چالاکی؟ اور سنیئے۔ اس کام میں میری طرح اور لوگ بھی شامل تھے فرم ہماری معرفت لاکھوں بنا رہی

تھی- مجھے مل رہے تھے صرف سوا سو اور بھتہ- کمپنی ہم سے دوسروں کی جیبیں کٹوا رہی تھی اور بدلے میں بھی جیبیں کاٹ رہی تھی- سماج کے مکمل کاروبار کا اصل حربہ ہے' سستا خرید کر مہنگے سے مہنگا بیچ دینا- کم مزدوری دے کر مال بنوانا اور مال کو زیادہ سے زیادہ داموں پر بیچنا- لیکن اس دھوکے کو نبھاتے رہنے کے لئے دھوکے کے اصولوں پر ایمانداری کے ساتھ عمل ضروری ہے- ایسے کاروبار میں بھی جب آپ سے چاول کے دام لے کر کنکر کی بوریاں سپلائی کی جائیں تو آپ دھوکے کے لئے سزا دینا چاہیں گے- یا نہیں! یہی بات آپ ہمارے بارے میں بھی سمجھ لیجئے- ہر سماج میں دوسروں کی جیب سے روپیہ نکالنے کے لئے کچھ منظور شدہ ڈھنگ ہوتے ہیں- ان ہی کے مطابق چلنا ہوتا ہے- ایسے اصول نہ ماننے سے دوسروں کو لوٹنے کا نظام بھی ٹھیک طرح سے نہیں چل سکتا-"

نوجوان کے سینہ زوری سے چوری کی حمایت کرنے کے ڈھنگ میں خود اعتمادی کا انداز جھلک رہا تھا- میں نے اس پر چوٹ کرنی چاہی-- "دھوکے اور چوری سے دوسرے کا پیسہ چھین لینے کے لئے بھی فخر کیا جاسکتا ہے' یہ آج پہلی بار دیکھ رہا ہوں-"

وہ اس بات سے جھینپا نہیں اور بولا-- "آپ چوری کی بات کرتے ہیں! دوسرے کا پیسہ لے لینا چوری ہے؟ برا نہ مانئے' پیسہ تو اصل میں محنت کرنے والے اور کسان یا مزدور ہی پیدا کر سکتے ہیں- باقی سب کاروبار اس پیسے کو اس کے پیدا کرنے والوں کے ہاتھوں سے زیادہ سے زیادہ مقدار میں ہتھیانے کی چال ہیں- البتہ دھوکا دھڑی کے کچھ طریقوں کو سماج قبول کرتا ہے اور کچھ کو جرم قرار دیتا ہے- جو لوگ سماج کے ذریعہ منظور شدہ گذارا کرنے کے طریقوں میں جگہ نہیں حاصل کرپاتے' وہ چیل کوؤں کی طرح چھینا جھپٹی سے گذر کرتے ہیں-" آدھے سے زیادہ جل چکی سگریٹ کو فرش پر پھینک کر سینڈل سے کچلتے ہوئے اس نے مسکرا کر کہا-- "میں آپ کا شکر گذار ہوں- آپ نے مجھے بے حد نفرت انگیز اور مشکل کام سے بچالیا-"

نوجوان کی صاف گوئی اور برتاؤ کا دل پر کچھ ایسا اثر پڑا کہ ہمدردی ظاہر کیے بغیر نہ رہ سکا اسے سمجھانا چاہا- "تم اتنے پڑھے لکھے اور سمجھدار نوجوان ہو' اس طرح کے

نفرت انگیز کاموں میں پھنس کر تمہیں ندامت محسوس نہیں ہوتی؟"

نوجوان کے مشاق ہاتھ پیکٹ سے نئی سگریٹ نکالنے لگے اور اس نے بہت حیرت سے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کیا۔ "کس بات کے لئے ندامت؟ کیوں؟... میں کیا کر رہا ہوں؟"

"تمہیں غیر سماجی کام کرنے کے لئے شرم محسوس نہیں ہوتی؟ تم اپنے کام کے بارے میں بھلے آدمیوں میں صفائی سے بات کرسکتے ہو؟" میں نے اس کی آنکھیں کھولنے کی امید میں اس سے ہمدردی ظاہر کی۔

وہ مسکراہٹ چھپانے کے لئے ہونٹ دبا کر لمحے بھر کے لئے چپ رہا' پھر بولا۔ "آپ بھلا آدمی کسے سمجھتے ہیں؟ بھلا آدمی وہ ہے جس کی عزت ہو۔ عزت روپیہ خرچ کرنے سے ہوتی ہے۔ میں برائی کیا کرتا ہو؟ ہاں جیب کاٹنا آپ برا سمجھتے ہیں! ہم لوگ لاکھوں میں سے کسی ایک کی جیب کاٹتے ہیں۔ بار بار شاید آپ کسی کی جیب نہیں کاٹتے۔ جیب کاٹنے کا مطلب ہے' دوسرے کی کمائی چھین لینا۔ بتائیے۔ ہزاروں آدمیوں کی محنت یا کمائی کا پیسہ زندگی بھر ان سے چھینتے رہنا بھلے آدمی کا کام ہے۔ ہم لوگ بھی آپس میں ملتے ہیں تو بڑے فخر سے اپنی کامیابی کی بات کرتے ہیں لیکن آپ لوگوں کے سامنے کیسے کرسکتے ہیں؟ آپ ہی بتائیے' کیا جرمنی' انگلینڈ یا روس فوجی تیاری کے راز دوسروں کو بتاسکتے ہیں؟ کیا آپ اپنی کمپنی کے طریقے اور راز دوسری کمپنیوں کو بتا سکتے ہیں؟ آخر پچھلی جنگ میں بڑے بڑے سپہ سالار کیا کر رہے تھے؟ وہ جتنا قتل عام کرسکتے تھے' دوسرے ملک کی جتنی زیادہ دولت برباد کرسکتے تھے' اتنی ہی ان کی تعریف ہوتی تھی۔ کاروبار میں مقابلے کے بھی یہی معنی ہیں۔ آخر جنگ ہوتی کیوں ہے؟ اس لئے نہ کہ دنیا کے دوسرے ملکوں کو لوٹنے کا زیادہ حق کسے ہو؟ ہم لوگ بھی وہی کرتے ہیں جو ہمارے سماج کی معاشی زندگی کی نگرانی کرنے والے لوگ کر رہے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ دوسرے کی دولت چھین لینے کے کچھ طریقوں کو سماج نے منظوری دے دی ہے۔ اور کچھ کو جرم قرار دیا ہے۔ یہ صرف مان لینے کی بات ہے۔ دیکھئے نہ' ایک وقت بابر فوج لے کر اس ملک کی دولت چھین لینا اپنا حق سمجھتا تھا۔ آج امریکہ' انگلینڈ کاروبار میں وہی بات کر رہے ہیں۔ دوسرے کی دولت چھین لینے کے جس داؤ

میں آپ لوگ کچے ہیں، جس میں آپ کو مات ہو جانے کا ڈر ہے' اس سے آپ کھسیا جاتے ہیں۔ اصل میں کھیل کی بنیادی بات تو وہی ہے' دوسرے کی محنت کا پھل چالاکی سے ہتھیا لینا لیکن ایک کو ساہو کا طریقہ مان لیا گیا ہے اور دوسرے کو چور کا۔۔"

اسی دوران پلیٹ فارم پر ایک گاڑی آکر کھڑی ہو گئی تھی۔ نوجوان کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ گاڑی کی طرف اس نے اشارہ کر کے کہا۔۔۔ "معاف کیجئے ذرا سی بات کے لئے میں نے آپ کا اتنا وقت برباد کر دیا۔ مجھے اس گاڑی سے لوٹنا ہے۔"

نوجوان کی باتوں سے افسوس ہو رہا تھا اور یہ ظاہر کیے بغیر میں نہ رہ سکا۔۔۔۔ "افسوس ہے' تمہاری جیسی عقل کے آدمی کی ایسی درگت ہو رہی ہے۔ تم سماج کے لئے کتنے مفید ہو سکتے تھے!"

"دیکھئے' ترس نہ دکھایئے!" مسکرا کر اس نے آگاہ کیا۔ "ترس کی بھیک مانگنے سے اکتا کر ہی میں نے یہ راستہ اپنایا ہے۔ مجھ جیسا عقل مند اور ایماندار آدمی بھی اس سماج میں وسائل کے مالک طبقوں کی مدد کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتا۔ چاہے وہ کتنا ہی بڑا مہاتما یا پنڈت ہو۔ مالک طبقے کی غلامی ہی ساہو پن ہے اور مخالفت چوری!" بھنویں سکوڑ کر اور پیچیدہ خیالات میں محو سر کے بالوں میں انگلیاں پھراتے ہوئے اس نے کہا۔۔۔ "کامریڈ لوگ کئی باتیں کہتے ہیں لیکن سچائی ان میں بھی کچھ نہیں۔ وہ بے وسیلہ لوگوں کی لیڈری ہے۔ ایک تماشا ہے! ایک جھک ہے! وہ کہتے ہیں' محنت کرنے والوں کا ہی راج قائم ہونا چاہئے۔ مزدور کا راج ہو جائے گا تو وہ کڑی محنت کرے گا کیوں؟ اور کیا ہم لوگوں کی زندگی میں ایسا ہو سکتا ہے؟ میں نے چوری باپ کے علاج کے لئے کی تھی۔ چوری کر کے روپیہ لے کر جب گھر پہنچا تو باپ مر چکے تھے۔ ان کا کچھ نہ بنا۔ ایسے ہی اگر ہم لوگ کامریڈوں کی تحریک میں حصہ لیتے لیتے مر جائیں تو بعد میں مزدور راج ہونے کا ہمیں کیا فائدہ؟ یہ اچھا خاصا مذاق ہے۔ کامریڈ صرف بات کرتا ہے۔ صرف سرمایہ داروں کو گالی دیتا ہے۔ وہ نہ سرمایہ دار کو مارتا ہے اور نہ اس سے پیسہ چھینتا ہے' اس لئے میں ان پر اعتبار نہیں کرتا!۔۔۔ ہاں' گاڑی جا رہی ہے' شکریہ!" وہ لپک کر پلیٹ فارم پر کھڑی ٹرین کی طرف بڑھ گیا۔

اس کے منہ پھیرتے ہی میں نے ایک بار پھر چالیس ہزار کے نوٹوں کو سکون

سے ٹٹولا۔ نوٹ محفوظ تھے۔ میں نے چین کی سانس لی، میں ساہو ہوں، چور نہیں۔ وہ رقم فرم کی امانت تھی اور اسے گیارہ بجے ٹینڈر کھلنے کے وقت سے پہلے ہی ٹھیکہ دینے والے افسروں کے پاس پہنچا دینا ضروری تھا۔

داس دھرم

برسات کی شروعات میں آندریکس، جمبوپ کے تجارتی سفر سے واپس آیا تو دیما کی حالت دیکھ کر اس کا دل منہ کو آنے لگا۔ دیما کا گلاب کی مانند کھلا رہنے والا نرم ونازک چہرہ جدائی میں پیڑ سے جھڑ کر کمہلائے سیب کی طرح پیلا پڑ گیا تھا۔ جلد سکڑ گئی تھی۔ آنکھیں دھنس کر دو سوکھے زخموں کی طرح معلوم ہوتی تھیں۔ اگر آندریکس کچھ اور ماہ بعد آتا تو غالباً بیوی کی جگہ اسے دیما کی سمادھی کو ہی گلے لگا کر آنسو بہانے پڑتے۔

ملن کے آنسو بہاتی ہوئی دیما کا سر اپنے سینے پر رکھ کر آندریکس نے عہد کیا تھا — "مجھے نہیں چاہئے بھارت کی دولت۔ تمہیں بلکتا چھوڑ کر اب میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ تم ہی میری دولت ہو۔ تمہیں پاکر میں ساری دولت کو لات مار سکتا ہوں۔ تمہیں خوش دیکھنے کے لئے اگر مجھے باویرو کے بازاروں میں اور گلیوں میں سر پر بوجھ اٹھاکر روزی روٹی کمانی پڑے یا ادنیٰ کسان بننا پڑے تو وہ بھی مجھے منظور ہے۔"

آندریکس اور دیما کے کتنے دن رات پیار محبت میں گذر گئے، اس کا احساس ہی نہیں ہوا۔ دیما پھر صحت مند ہوگئی۔ اس کے لال، خوبصورت ہونٹوں پر شوخی، بڑی بڑی نیلی آنکھوں میں نشہ اور رخساروں پر سرخی واپس آگئی۔ ایک شام آندریکس نے بھارت کے تجارتی دورے سے لائے ہوئے بنگ دیش کے پرکشش ملبوسات سے دیما کو سجایا اور پاٹلی پتر کے جوہری سے خرید کردہ مرصع جواہرات کا ہار اس کے گلے میں پہنایا۔ کانیہ کبز کے بیش قیمت عطر سے اسے معطر کیا۔ ہاتھی دانت سے جڑا آئینہ اس کے سامنے کر کے وہ بولا — "دیکھو اپنا عکس، اس وقت باویرو، مصر اور سیریا کے شہنشاہ آنتی اوکس کی ملکہ بھی تم سے حسد کر سکتی ہے۔"

دیما خاموشی سے اپنے ناخنوں کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کی ٹھوڑی چھوکر

آندریکس نے پوچھا۔ "کیوں پیاری! تم چپ کیوں ہو؟"

شوہر کے قریب آکر دیما نے اپنی بانہیں اس کے گلے میں ڈال دیں اور اس کی داڑھی کے بھورے بالوں میں اپنے سر کے بال ملا کر جواب دیا۔ "ہاں' اس وقت میں کسی بھی ملکہ سے زیادہ خوش ہوں لیکن یہ زیورات اور کپڑے۔ ان کی وجہ سے مجھے کتنی لمبی جدائی برداشت کرنی پڑی۔"

آندریکس نے دیما کو آغوش میں لے کر اپنے اس عہد کو دہرایا کہ وہ تجارت کی خاطر پھر سمندری سفر نہیں کرے گا۔

ایک اور برسات بیت گئی۔ بحیرہ روم کے ساحلی شہروں سے بیش قیمت تجارتی مال باویرو کے بازاروں میں بھرنے لگا۔ عظیم تاجر مراسس کے دولت خانے بیش قیمت اشیاء سے بھر گئے۔ مراسس نے اپنے عقل مند بیٹے کو مخاطب کر کے کہا۔ "بیٹے جس تجارتی مال کو وقت پر نہیں بیچا جاتا' اس کی قیمت کو وقت کھا جاتا ہے۔ تجارت کی کامیابی گاہک کے ہاتھ میں پہنچ جانے میں ہی ہے ورنہ وہ تاجر کے لئے پریشانی اور نقصان کا سبب بن جاتی ہے۔ ہمارے گودام تجارتی سامان سے بھرے پڑے ہیں۔ پچھلے سال سمندری سفر سے واپس آئی ہماری کشتیوں کا مناسب انتظام ہو چکا ہے۔ سیریا کے تاجروں کے سمندری قافلے شروع کر رہے ہیں۔ تم بھی وقت برباد نہ کرو اور سفر کے لئے تیار ہو جاؤ۔ تاجر کا مذہب ہے غفلت کے بغیر اپنی دولت بڑھانا۔ جو دولت بڑھتی نہیں' اس کا زوال ہو جاتا ہے۔ بحری تاجر کا گھر سمندر میں بہتی کشتی ہی ہے اور سفر ہی اس کی زندگی ہے۔ تمہاری عمر تک پہنچنے کے وقت تک میں چار بار جمبودیپ کا سفر کر چکا تھا۔ تین بار سمندری راستے سے اور ایک بار ہندوکش پار کر کے خشکی کے راستے سے۔ جوانی ہی فکر معاش کا زمانہ ہوتا ہے۔ باویرو' سیریا اور مصر کا چکر لگانے والے تاجر نوجوانوں کے ساتھ تم بھی کاروباری سفر پر جاؤ۔ باویرو' سیریا اور مصر کا چکر لگانے والے تاجر نوجوانوں کے ساتھ تم بھی کاروباری سفر پر جاؤ۔ خداوند یسوع بہتری کریں گے۔"

باپ کا حکم سن کر آندریکس دل ہی دل میں بے چین ہونے لگا۔ پچھلے سفر سے

واپسی پر اس نے جو دیما کا جدائی کی تکلیف سے تقریباً بے جان چہرہ دیکھا تھا' وہ اس کے تصور میں ناچنے لگا۔ دیما کو تکلیف نہ پہنچانے کی خاطر پھر کسی دور کے سفر پر نہ جانے کا اپنا عہد بھی یاد آیا۔ لیکن مردانگی' خودداری اور فرض نے اس کی زبان پر تالا لگادیا۔ اس نے باپ کا حکم مان لیا۔

دیما ساری رات روتی رہی۔ آندریکس اسے گود میں لیے بیٹھا رہا۔ دیما کی افسردگی سے اس کا دل پگھل گیا' گلا روندھ گیا۔ وہ ایک لفظ بھی نہ بول سکا۔ ہونٹ دبا کر اپنے آپ کو بس میں رکھنے کی کوشش کی۔ پھر بھی رنج سے گلابی ہوجانے والی آنکھوں سے دوچار بوند آنسو ٹپک کر بھوری مونچھوں کی نوک اور چھوٹی تکونی داڑھی کے بالوں میں جھول گئے۔ دیما کی بند آنکھوں سے مسلسل آنسوؤں کی دھار بہہ رہی تھی۔ آندریکس کا دامن اور کندھے کے کپڑے اس سے بھیگ گئے۔ چارپائی پر بچھا سونے کے تاروں سے بنا' دور دراز ہندوستان سے آیا لال کپڑا جگہ جگہ آنسوؤں سے تر ہوگیا۔ دیما کا زار وقطار رونا نہیں رکا۔ آغوش میں اسے سمیٹے ہوئے' ہونٹوں کو دبائے آندریکس کا دل بھی روتا رہا۔ دونوں کی مجبوری اور بے چینی دیکھ کر چراغ دان پر جلتے چراغ کی لو خاموش اور ساکن ہوگئی تھی۔

سورج کی پہلی کرن کے ساتھ باویرو کے عظیم بحری تاجر مراسس کے عظیم الشان محل کے گول گنگورے سنہری ہوگئے۔ سورج کی کرنیں ذرا دیر میں کمروں کے اندر جھانکنے لگیں۔ آندریکس سے رہا نہیں گیا۔ پژمردہ اور ست دیما کا آنسوؤں سے بھیگا چہرہ اپنے اس سمندری سفر میں تمہیں اپنے ساتھ لے چلوں گا۔۔۔ اطمینان رکھو۔"

دیما کا خاموش زاروقطار سسکیوں میں بدل گیا۔ وہ اپنی آنکھیں پونچھنے لگی۔ اسے اپنی آغوش میں اور زور سے بھینچ کر' ہونٹوں سے لگاکر آندریکس نے کہا۔ "اب کیوں روتی ہو' پیاری! میں وعدہ کرتا ہوں تمہیں اپنے ساتھ لے چلوں گا۔ مہذب گھرانوں کی متعدد خواتین اپنے شوہروں کے ساتھ سمندری سفر پر جاتی ہیں۔ عظیم سپہ سالار سائیکس کی تو پیدائش ہی دریائے نیل کی سطح پر بہتی ہوئی کشتی میں ہوئی تھی۔ اگر ڈر

ہے تو صرف سمندری لیڈروں کا۔"

خوشبودار چراغ کی لال روشنی اور جھروکے سے جھانکتی سورج کی کرنیں کی آمیزش میں دیما کے رو رو کر زرد ہوئے چہرے پر مسکراہٹ اور آنسوؤں کا امتزاج نظر آرہا تھا۔ آندریکس کے گلے میں اپنی بانہوں کے حلقے کو ڈھیلا کر کے اس نے کہا۔

"اب جانے دو نہ پیارے۔ دھوپ پھیلنے لگی ہے۔ داسی آتی ہوگی۔"

باویرو، سیریا اور مصر کے بڑے بڑے یونانی نسل کے تاجروں کا بحری بیڑا بحر اٹلانٹک کی نیلی سطح پر سفید کپڑوں کے محلوں کی طرح اونچے بادبان اڑاتا ہوا، جنوب کی سمت میں چلا جارہا تھا۔ کشتیوں اور بحری جہازوں کا وہ عظیم الشان قافلہ اپنی وسعت کی وجہ سے کسی ساکن شہر کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ سمندر کی مسلسل ہوا میں لہراتی اس شہر کی نیلی سطح، پورے شہر کو ایک مقررہ رفتار سے تھرکاتی رہتی۔ اس متحرک شہر میں زندگی کی تمام ضروریات اور سہولیات موجود تھیں۔ دولت مند تاجروں کی خدمت کے لئے بحری جہازوں پر نوکر چاکر تھے، لذیذ کھانے پینے کا سارا انتظام تھا، سستی اور اکتاہٹ دور کرنے کے لئے وینا، ڈھول اور رقاصاؤں کی پازیبوں کی آواز مسلسل گونجتی رہتی تھی۔ یہ بیڑا مگدھ سامراج کے عیش پسند شہریوں کے لئے مشرق وسطیٰ، یونان اور روم سے خریدا ہوا عیش و عشرت کا سامان لیے جارہا تھا۔ دوسری طرف مشرق وسطیٰ، یونان اور روم کے عیش پسند لوگوں کے لئے ہندوستان کا بیش قیمت کپڑا، اعلیٰ جواہرات اور مصالحہ جات خریدنے کے لئے ان بحری جہازوں میں بے افراط سونا بھرا ہوا تھا۔ انہیں سمندری ڈاکوؤں کا اندیشہ تھا۔ اس لئے مسلح فوجیوں سے بھری کشتیاں اس متحرک دولت مند شہر کو گھیر کر چل رہی تھیں۔ معقول پیسہ دے کر ان تاجروں نے طاقتور اور پرشکوہ پادشاہ آنتی اوکس کی بحری فوج کی خدمات اپنی حفاظت کے لئے خریدلی تھیں۔

عظیم تاجر مراسس کے نوجوان بیٹے آندریکس اور اس کی بیوی دیما کے جہازی کمرے خاص طور پر عیش و عشرت کے سامان سے بھرے تھے۔ آندریکس بیڑے کی تفریح میں شامل ہونے کے بعد تھک کر، دیما کے ہیجان انگیز حسن سے لطف اندوز

ہونے کے لئے اس کے ہاتھ سے روم اور ایتھنس کی شراب کے پیالے پی کر اپنی پیاس بجھا رہا تھا۔ اس شراب سے کہیں زیادہ نشہ آور دیما کے مدھ بھرے ہونٹ تھے۔ اس لمبے سفر میں اسے خود فراموشی کے دیگر وسیلوں کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ دیما کی اٹلانٹک کی طرح بے انتہا گہری آنکھوں میں وہ کھو گیا تھا۔ مختلف قسم کی آب وہوا، پھلوں، پھولوں، انسانوں، جانوروں اور پرندوں کو دیکھ کر دیما حیرت اور مسرت سے چلا اٹھتی تھی۔

یونان کے بحری تاجروں کا بیڑا سنگھل دیپ میں موتیوں کا ذخیرہ خریدنے کے بعد جب ہندوستان کے سمندر میں داخل ہوا تو جہازی اور فوجی زیادہ ہوشیار اور محتاط رہنے لگے۔ اس زمانے میں کلنگ پٹن، سے گنگا ساگر تک کا شرقی ساحل، چکرورتی وروانت سیمک ساتواہن، کی چشم پوشی کی وجہ سے بیباک سمندری لٹیروں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ ان کی دہشت گردی کے سبب یہ علاقہ یونان کے بحری تاجروں کے لئے کسی شمشان کی مانند بھیانک ہو رہا تھا۔ ان ڈاکوؤں کی برباد کردہ کشتیوں کے انجر پنجر اور مستولوں سے ہندوستان کا مشرقی ساحل پٹا پڑا تھا۔ سرخ سفید رنگت اور بھورے بال والے تندرست اور توانا یونانی خدمت گار آندھرا کے کالی رنگت والے شہریوں کے لئے خصوصی دلچسپی کا مرکز بن گئے تھے۔ راج محل والوں اور جاگیرداروں کی نظر میں ان خدمت گاروں کی خاص اہمیت تھی۔ اپنے ملک اور عزیزوں سے ہمیشہ کے لئے جدا ہوئے، ڈاکوؤں سے خطرہ مول لینے والے، اپنے مالکوں کے لئے، جن کی خوشی یا ناراضگی پر خدمت گاروں کی زندگی اور موت منحصر تھی، یہ خدمت گار خاص طور پر قابل اعتماد بن جاتے تھے۔ ان خدمت گاروں کے معاملے میں قریبی ریاستوں کے حریف یا جاگیرداروں کے جاسوس ہونے کا بھی اندیشہ نہیں تھا۔

یونانیوں کا بحری بیڑا ساحل سے مناسب فاصلے پر خاص احتیاط کے ساتھ گنگا ساگر کے سنگم کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔ آندریکس دولت کی حفاظت کی ذمہ داری فوجیوں اور ملاحوں کے کندھے پر ڈال کر عیش میں مگن تھا۔ شراب اور محبت کے میٹھے نشے میں رات کے دوپہر گذار کر وہ میٹھی نیند میں کھو جاتا تھا۔ وسطی علاقے کی دوپہر کو تپتے سورج کی تیز کرنیں بھی اس کی نیند میں خلل ڈالنے میں ناکام رہتی تھیں۔ اس کی نیند

کو ختم کرسکتا تھا صرف دیما کے معطر ہاتھوں کا لمس اور اس سے بھی زیادہ دیما کا دلکش، پیار بھرا، دھیما دھیما انداز تخاطب۔

شفق سحر سے خون جیسی سرخ مشرقی سمت میں سورج کا دائرہ آہستہ آہستہ افق سے نمودار ہو رہا تھا۔ جہازی صبح کی صحت بخش ہوا میں سانس لیتے ہوئے سمندر کی خاموش سطح پر، راج ہنسوں کے مربوط و منظم جھنڈ کی مانند، شمال کی طرف بڑھتے جا رہے تھے۔ ملاح اور فوجی سورج کے روشن دائرے کو سلام کرکے خداوند یسوع کی مہربانی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فلاح کی دعا کر رہے تھے۔ اچانک تنے ہوئے بادبان حملے کے نقارے کی طرح بج اٹھے۔ ملاحوں نے دیکھا۔ مغربی سمت سے آئے تیروں کی بوچھار نے بادبانوں کو چھید دیا تھا۔ فوراً بحری بیڑے میں جنگ کا بگل بجنے لگا۔

نگرانی کے لئے تعینات چوکنی نگاہ رکھنے والے ملاحوں اور فوجیوں نے سورج نکلنے سے پہلے ہی مغربی سمت میں پانی سے ملی ہوئی ایک خاکی نیلی لکیر کی طرف سپہ سالار کا دھیان مرکوز کرایا تھا۔ کئی بار دھیان دینے پر بھی اس لکیر کو بے حرکت پاکر سپہ سالار نے اسے محض ایک چٹان سمجھ کر اس کی فکر چھوڑ دی تھی۔ وہ لکیر سمندری لٹیروں کی قطار تھی۔

سپہ سالار کے حکم سے سب ہی بادبان تان کر اور بیڑے کی رفتار بڑھا کر دشمن کی پہنچ سے دور جانے کی کوشش کی گئی۔ تیروں بڑھتی تعداد نے اس کوشش کو ناکام کردیا۔ بیڑے کے فوجیوں کو اپنی طاقت پر یقین تھا۔ دشمن ابھی ان کی کرپانوں سے دور تھا۔ سپہ سالار نے حکم دیا۔۔ حفاظت کے مقصد سے گروہ بناکر، سب بادبان گرا کر بیڑے کو ساکن کردیا جائے۔

یونانی تیر اندازوں کے نشانے سے بچنے کے لئے ڈاکوؤں کی کشتیاں ایک دوسرے سے دور دور آدھے دائرے کی شکل میں پھیلتی جا رہی تھیں۔ سب ہی کشتیوں کا ایک ہی نشانہ تھا، یونانی بیڑا۔ لیکن بیڑے کے نشانے بازوں کے لئے چھوٹی چھوٹی کشتیوں کی شکل میں ایک سو سے زائد غیر معین نشانے تھے۔ یونانی جنگجو تلوار اور ڈھال لے کر ڈاکوؤں کے قریب آنے کے انتظار میں ناکام ہو کر ان کے تیروں کو سہ رہے تھے۔ آندریکس خود بھی نیند سے جاگ کر کرپان ہاتھ میں لیے سپہ سالار کے ساتھ جنگ کی

قیادت کے لئے موجود تھا۔ ڈیما کو اس نے محفوظ جگہ پر بیٹھا دیا تھا۔

قریب آنے پر ڈاکوؤں نے کمانوں پر چڑھی جلتی ہوئی شعلوں سے یونانی جہازوں کے بادبانوں پر حملہ شروع کردیا۔ بیڑے میں آگ لگ جانے سے ہلچل مچ گئی۔ ڈاکوؤں کی کشتیاں شہد کی مکھیوں کی طرح بیڑے پر ٹوٹ پڑیں۔ متعدد ملاح' فوجی' تاجر اور ان کے خدمت گار زخمی ہوئے اور خوف کے سبب سدھ بدھ کھوکر پانی میں گر گئے۔ ڈاکوؤں نے شکست خوردہ یونانیوں کے ہتھیار چھین کر عورتوں اور مردوں کو قید کرلیا۔ مسلح ڈاکوؤں کے قابوں میں آئے یونانی ملاح بچے ہوئے بیڑے کو آندھرا کے ساحل کی طرف لے گئے۔

ڈاکوؤں کا گروہ' لوٹ کا سونا' بیش بہا سامان اور یونان قیدیوں کو' جنہیں لونڈی' غلام بنا لیا گیا تھا' ساتھ لے کر آندھرا کے شہروں میں پہنچا۔ دولت کو جمع کر کے رکھنے کے رجحان سے بے نیاز اور توقع سے زیادہ مال حاصل کرنے والے ڈاکوؤں کے گروہ جہاں پہنچتے تھے' شراب خانوں کے مالک اور کپڑوں اور جواہرات کے تاجر گرمجوشی سے ان کا استقبال کرتے تھے۔ پیشہ ور عورتیں لالچ بھری نگاہوں اور دلکش آوازوں سے انہیں اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتی تھیں۔ چالاک کاروباری لوگ دولت مند بن کر بدمست ڈاکوؤں سے لوٹ میں چھینی ہوئی دولت کو سودے کی شکل میں ہتھیالیتے اور سامان کی قیمت کے طور پر دیے گئے روپیوں کو شراب اور دوسرے کھانے پینے کے سامان کی قیمت میں وصول کرلیتے۔ کنگال ڈاکو پھر کنگال بن کر روزی کے لئے جوکھم والے کام کی تلاش میں ساحل کی طرف چل دیتے تھے۔ یونانی خدمت گار خاص کشش کا سامان ہوتے تھے۔ جسمانی مشقت سے بیزار امیر اور ضعیف شہری ان جسمانی طور پر طاقتور لونڈی غلاموں کی تلاش میں رہتے تھے۔ کہیں کسی دوسرے سہارے کی امید نہ کرنے والے ان خدمت گاروں کو' جن کا اپنے مالک کے علاوہ کوئی نہیں تھا' رعایا سے جن کا کوئی تعلق نہیں تھا' حکمران خاندان اور جاگیردار لوگ اپنی طاقت سمجھتے تھے۔ بوڑھی طوائفیں' گوری نسل اور بھورے بالوں والے یونانیوں کے جسم سے بھرپور لذت حاصل کرنے کی کوشش کرتی تھیں۔ بازار میں ان قیدیوں کے آنے پر

جشن کا سا ماحول ہو جاتا تھا۔

آندھراپتی مہاراج یمک ساتواہن کی سرپرستی سے ہی ڈاکوؤں کے گروہ کا وجود تھا ان کی اس مہربانی کے لئے احسان مندی اور حکومت کی وفاداری کے لئے بطور فرض، سامان اور لونڈی غلاموں کی نمائش سب سے پہلے راج محل میں ہوتی تھی۔ ہمیشہ کی طرح اب کی بار بھی مہاراج نے سنگھل کے بڑے موتی چن لیے پھر ان کی نظر لونڈی غلاموں کی قطار کی طرف گئی۔

دیما باندیوں کی قطار میں بیٹھی تھی۔ اس کے بیش قیمت کپڑے مسل کر بے رونق ہو گئے تھے اس کی آنکھوں کا نشہ عاجزی میں اور چہرے کا حسن خوف اور اداسی کی وجہ سے پیلے پن میں بدل گیا تھا۔ ڈاکوؤں نے اس کے بالوں کا سنہری جلوہ دکھانے کے لئے چوٹی کھول کر لٹوں کو کندھوں پر پھیلا دیا تھا۔ اس کے سینے کی خوبصورتی دکھانے کے لئے اس کی چولی کا ایک حصہ پھاڑ دیا تھا۔ مہاراج کی نظر اس کی طرف جاتی ہوئی دیکھ کر، ہاتھ میں چمڑے کا گانٹھوں دار کوڑا تھامے ڈاکو نے اس کو مسکرانے کا اشارہ کیا۔ مسکرانے کی کوشش ناکام رہی۔ مہاراج کی نظر اس پر ہی ٹھہر گئی۔ دوسرے کچھ لونڈیوں کے ساتھ دیما کو مہاراج کی خدمت کے لئے منتخب کر لیا گیا۔

داسیوں کے بعد مہاراج کی پارکھی غلاموں کی قطار کی طرف گئی۔ جنگ میں ماتھے پر لگے زخم سے خون بہہ کر آندریکس کے سر اور داڑھی مونچھ میں جم گیا تھا جس کی وجہ سے اس کے بال اب بھی ناریل کے ریشے کی طرح چمک رہے تھے۔ ایک طرف کھڑی دیما خداوند یسوع کے حضور میں دعا کر رہی تھی کہ اس کا شوہر بھی شاہی خدمت کے لئے منتخب ہو جائے تاکہ وہ ایک دوسرے سے زندگی بھر کے لئے جدا نہ ہو جائیں۔

دیما کی اضطرابی دعا خداوند یسوع نے قبول کر لی۔ مہاراج کی رازداں نظر نے آندریکس میں کوئی خاص بات دیکھی اور دوسرے کئی خوبصورت غلاموں کے ساتھ اسے بھی شاہی خدمت گاروں میں لے لیا گیا۔

نرم و نازک جسم والی، عقل مند دیما کو آخر کار راج کمھشی کی دیکھ بھال کے کام پر لگا دیا گیا۔ دانائے فن مہاراج نے دیما کے ہیجان خیز حسن اور میٹھی آواز کو پرکھ کر عیش و عشرت کے لمحات میں اپنی تشفی کے لئے موسیقی اور رقص کی تعلیم دینے کا حکم

دیا۔

آندریکس نے خدا کی بنائی تقدیر کو اٹل سمجھ کر اپنے فرض کو نبھایا۔ اپنی مستعدی اور ذہانت سے جلدی ہی وہ سخت جسمانی محنت سے آزاد ہوکر غلاموں کا استاد ہوگیا۔ مالک کو ہی ایک میودیو' سمجھ کر اس نے مکمل وفاداری کا حلف لیا اور وہ مہاراج کا نہایت قریبی باڈی گارڈ مقرر ہوگیا۔

چیت کی پوری چاندنی میں بلور کے آنگن میں سفید پھولوں کا وسیع گھیرا تھا۔ سفید نشست گاہ پر سفید گدوں کے سہارے۔ سفید کپڑے اور موتیوں کا ہار پہنے' سیمک ساتواہن بیٹھے تھے۔ دو یونانی لڑکیاں دائیں بائیں سفید مور چھل ہلارہی تھیں۔ مہاراج کے پیچھے باڈی گارڈ آندریکس خدمت میں حاضر تھا۔ سامنے دائرہ نما نشستوں پر درباری اور جاگیردار بیٹھے تھے۔ بیچ کی جگہ خالی تھی۔

اپنی تعلیم مکمل کرکے دیما مہاراج کی خدمت میں پہلی بار حاضر ہوئی۔ وہ چاندی کے باریک تاروں سے بنے کپڑے کا لہنگا اور چولی پہنے ہوئے تھی۔ اس کے زیور موتیوں اور سفید پھولوں کے تھے۔ اس کے بالوں' گلے' کلائیوں اور کمر میں پھولوں کے ہار کہیں تو جسم کا احاطہ کیے ہوئے' کہیں چوٹی اور کہیں لڑیوں کی شکل میں لپٹے تھے۔ نازک قدموں سے چاندی کی پازیبوں کی تال دیتے ہوئے وہ مہاراج کے سامنے حاضر ہوئی۔ صحن میں سفید پتھروں کے فرش پر سر رکھ کر اس نے ایک میوسوامی' مہاراج کو دنڈوت کیا۔

حسب توقع دیما' مردنگ بجنے لگے۔ باندی کے روپ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد اس وقت پہلی بار دیما نے آندریکس کو دیکھا۔ اس کا دل مسرور ہوگیا۔ نگاہ بھر کر اپنے محبوب کو دیکھ کر دیما نے آنکھیں بند کرلیں۔ موسیقی کی لے پر اس کا جسم حرکت کرنے لگا۔ محو ہوکر وہ ناچنے لگی' اپنے آپ کو نچھاور کردینے کے لئے۔

ناظرین حیرت زدہ تھے۔ مہاراج سحر زدہ بھجنگ کی طرح ساکت اور جامد رہ گئے۔ غلام آندریکس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اپنی مسرت اور مہربانی ظاہر کرنے کے لئے مہاراج نے خراج تحسین کے طور پر رقاصہ کو ایک پیالہ شراب خدمت میں پیش

کرنے کا موقع دیا۔ عاجزی سے جھک کر دیما نے شراب کا پیالہ پیش کیا۔ خالی کر کے مہاراج نے رقاصہ کو اور ناچنے کا حکم دیا۔ غلام آندریکس بے حرکت دیکھتا رہا۔

رقص کے بعد شراب، شراب کے بعد رقص۔ مہاراج جھومنے لگے۔

حکم پاکر رقاصہ دوبارہ شراب کا بھرا پیالہ لے کر حاضر ہوئی۔ مہاراج نے خوش ہوکر رقاصہ کی بانہہ تھام کر اسے گود میں لے لیا۔

درباری امراء اور جاگیردار تہذیب کا مظاہرہ کرتے ہوئے سر جھکا کر چلے گئے۔ باجے والے اور باڈی گارڈ بھی چلے گئے۔ صرف خاص فرائض کے لئے منتخب قابل اعتماد باڈی گارڈ آندریکس اپنی جگہ کھڑا رہا۔

مہاراج شراب اور حسن کے نشے سے مکمل آسودگی کی کوشش میں خود فراموش ہوگئے۔ داسی رقاصہ جو ان کی گود میں تھی، آسودگی کا ذریعہ تھی۔ اس کا فرض اور دھرم تھا، مہاراج کی خواہش پوری کرنا۔

مہاراج مست ہوکر نیند میں بے سدھ ہوگئے۔ کھسوٹے گئے جسم اور مسلے ہوئے لباس والی داسی ان کی گرفت سے آزاد ہوکر گردن جھکائے شاہی نشست کے قریب کھڑی ہوگئی۔ اس نے غم زدہ نظر آندریکس کی بھیگی آنکھوں پر ڈالی اور سر جھکا لیا۔

حواس باختہ آندریکس آگے بڑھا۔ دونوں کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ آندریکس نے دیما کو اپنی آغوش میں جکڑ لیا۔ دونوں جوش میں آکر اردگرد سے بے نیاز ہوگئے۔

نیند میں بے سدھ مہاراج نے اپنی نشست پر کروٹ بدلی اور سفید پتھر والے فرش پر گر پڑے۔ ہوش میں آکر انہوں نے غلام اور باندی کو ہم آغوش دیکھا اور غصے میں چیخنے لگے۔

بیلوں کی آڑ سے مسلح باڈی گارڈ نکل آئے۔ دیما اور آندریکس کے جسم فوراً رسیوں میں بندھ گئے۔ داس کی ہمت، مالک کی استعمال کردہ عورت کو چھوئے؟

غصے سے مہاراج کا ہاتھ کرپان کے دستے پر گیا، لیکن وہ چپ رہ گئے۔۔۔ اتنی قابل نفرت بدکاری کی سزا لمحے بھر کی تکلیف کی موت سے؟ سنگین مجرموں کے بارے میں فیصلہ کرنے کے لئے انہیں دوبارہ حاضر کرنے کا حکم دے کر مہاراج بے قرار دل کو

سا کن کرنے کے لئے تنہائی میں چلے گئے۔

کلنگ کے مالک' دھرم کے محافظ مہاراج ساتواہن نے دھرم گیانی وزیر انصاف سے معلوم کیا۔۔ ایسے سخت مجرم کی سزا کیا ہونی چاہئے۔

رواج اور دھرم کو نظر میں رکھتے ہوئے شاستروں کا علم رکھنے والے وزیر نے جواب دیا۔ ایسے سنگین دغا کی سزا ہے' جسم کے ہر حصے کو ہاتھی کے پیروں تلے کچل کر موت!

شدید ذہنی اذیت کے ساتھ موت کی سزا سن کر دیما سر جھکائے کھڑی تھی۔

رحم دل مہاراج کے غصے کا زور کسی قدر کم ہوگیا تھا۔ ان کے دماغ میں گذشتہ رات کی دیوانگی کا ہلکا سا خیال آیا۔ نرم لہجے میں انہوں نے پوچھا۔۔ "داسی موت سے پہلے کچھ کہنا چاہتی ہے؟"

مہاراج کی ہمدردی سے حوصلہ پا کر دیما نے کانپتے ہوئے عاجزی سے درخواست کی۔۔ "دھرم رکشک مہاراج! یونان میں مردہ جسم چتا پر نہ جلا کر زمین میں گاڑ دیتے ہیں۔ ہم دونوں اپنے ملک میں میاں بیوی ہیں۔ موت کے بعد ہمارے جسموں کو ایک ساتھ دفنائے جانے کی مہربانی کریں تاکہ ہم لوگ جنت میں پھر ایک دوسرے کو حاصل کر سکیں۔"

مہاراج نے اجازت کے لئے شاستروں کے عالم وزیر کی طرف دیکھا۔ وزیر نے جواب دیا۔۔ "یہ گناہ کے بعد ایک اور بدکاری کی درخواست ہے۔ ان داتا' مالک کے خلاف دغا کر کے جنت کی امید کرنا ادھرم ہے۔ داس کا دھرم صرف ایک ہے۔۔ مالک کی خدمت۔"

لونڈی غلاموں کو ان کے دھرم سے باخبر رکھنے کے لئے بدمست ہاتھی کے پاؤں تلے کچلے گئے دیما اور آندریکس کے جسم راج محل کے دروازے پر کھمبوں سے لٹکا دیئے گئے۔

شمبوک

مدگل نگری میں شودروں کی تحریک کی وجہ سے بدنظمی اور افراتفری پھیل رہی تھی۔ شودر اور داس لوگ دھرماتما لوگوں کی سیوا کی قدیم رسم وروایت کو چھوڑ کر اپنی مکتی کے لئے جدوجہد کرنے لگے تھے۔

مہرشی بجرا ہوتی کے دھرم اور کرم سے متعلق گیان کی چاروں طرف شہرت پھیل رہی تھی۔ ہرشی کا وشواس متھلا دھی پتی ودیہ جنک کے آتم واد میں ہوگیا۔ مہرشی نے گیان لابھ کیا۔ کرم سے پھل اور دھیان (محویت) کا گہرا تعلق ہے۔ اچھے کرم (عمل) سے اگر سکھ بھی ملے تب بھی وہ غیر فانی آتما کو زندگی کے ساتھ جوڑ کر اسے موکش (نجات) سے دور رکھتا ہے۔ درحقیقت آتما پھل (انعام) کی خواہش کے بندھن سے آزاد ہو کر ہی حقیقی سکون حاصل کرتی ہے۔ اسے حاصل کرنے کا طریقہ ہے پھل سے مکمل بے نیازی۔

وہ اپنا آشرم چھوڑ کر اور کرم سے مکمل طور پر بے نیاز ہو کر ایکانت میں چلے گئے۔

مہرشی کا داس شمبوک بھی کرم سے بے نیازی کے ذریعہ حقیقی سکون حاصل کرنے کا راز جان کر مدگل نگری میں آیا تھا۔ شمبوک نے داسوں اور شودروں کو احساس دلایا۔۔ "شودر اور داس خود اپنی کمزوری کی وجہ سے اس کائنات کی راحتوں سے محروم ہیں۔" یگیہ باقاعدگی سے انجام دینے کے وسائل اور مواقع نہ ملنے کے سبب وہ نجات کی امید نہیں کرسکتے۔ ان کے لئے نجات کا طریقہ صرف اچھا عمل ہے۔

اس نے کہا۔۔ "شودر اور داس صرف ناواقفیت اور نادانی کے سبب زبردستی کی تکلیف برداشت کررہے ہیں۔ غذا، نیند، آرام اور پسندیدہ چیزوں کا نہ ملنا، یہ ساری جسمانی تکلیفیں محض خود فریبی کی پیداوار ہیں۔ اس خود فریبی سے چھٹکارا تپیا سے

حاصل شدہ گیان اور تدبیر کے ذریعہ پایا جاسکتا ہے۔

شمبوک کے پیدا کردہ شعور اور ہدایت سے شودر اور داس اپنے دھارمک آقاؤں کے سیوا کرانے کے حق کی مخالفت کر بیٹھے۔ خوراک اور دوسری نہایت ضروری چیزوں کی کمی انہیں ستانے لگی۔ ان کے دل ڈگمگانے لگے۔ شمبوک نے انہیں تسلی دی۔ تکلیف کا یہ احساس صرف نادانی کی وجہ سے ہے۔ بھوک سے محسوس ہونے والی تکلیف کا علاج ہے۔ سخت ریاضت سے جسم کو وہ تکلیف محسوس نہ ہونے دیتا۔"

کمی کی تکلیف سے بے چین شودر لوگ آگ تاپ کر، سلاخوں پر لیٹ کر، جسم میں سیخ گڑھا کر، نادانی کی بنا پر ہونے والی تکلیفوں سے دھیان ہٹا کر راہ نجات تلاش کرنے لگے۔

مدگل کا ورن آشرم سماج ضروری سیوا کی کمی کی وجہ سے اپنے دھرم، یگیہ، برت اور زندگی وموت سے متعلق رسوم کی ادائیگی میں ناکام ہوگیا۔ ہر طرف بدنظمی پھیلنے لگی۔

مہاگیانی رتوک ورہی اس وقت کئی دن تک چلنے والے یگیہ کا اہتمام کر رہے تھے۔ ان کا جوان بیٹا جو بڑی مدت سے بیمار تھا، ان کے داسوں کی دیکھ بھال میں تھا۔ داسوں کے کام چھوڑ جانے پر ان کا بیمار بیٹا بے سہارا ہوگیا۔ یگیہ کے کام میں لگے برہمن کا دل بیٹے کی فکر سے مضطرب ہونے لگا۔۔ کیا وہ یگیہ کو نامکمل چھوڑنے کا گناہ کریں اور بیمار، زندگی اور موت کی کشمکش میں گرفتار، بیٹے کی خدمت کریں؟

انہوں نے فیصلہ کیا۔۔ بیٹا، دھن دولت، یہ صرف اس کائنات کے ساتھی ہیں۔ آخر میں صرف دھرم ہی ساتھ جائے گا۔ یہ سب دنیاوی آسائشیں گذشتہ جنم میں کیے گئے کاموں کا پھل ہے۔ اس لئے پہلے بھلائی کے کام ہی پورے کرنے چاہئیں۔

یگیہ ختم ہونے کے ساتھ ہی رتوک کا بیٹا ضروری سیوا اور دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے مرگیا۔ مہاگیانی ورہی بیٹے کی موت کے صدمے سے بے قرار ہوگئے۔ انہیں شک ہونے لگا کیا یگیہ کے پوتر کام کا پھل انہیں بیٹے کے غم کی شکل میں ملا ہے؟ دھرم اور بھگوان کے انصاف کے بارے میں انہیں بدگمانی ہونے لگی۔

بیٹے کی موت کا شدید صدمہ کم ہونے پر مہاگیانی ورہی کے جذبات ساکن ہوئے تو وہ سوچنے لگے۔ دیوتاؤں کا ایسا شدید غصہ بغیر کسی بڑے گناہ کے نہیں ہو سکتا۔ گہرے غور و فکر سے انہیں پتہ چلا کہ ورن آشرم دھرم کے زوال کا شدید گناہ چاروں طرف بغاوت، بے چینی اور بد نظمی پھیلائے ہوئے ہے۔ شودر اور داس، برہمنوں اور دیگر بڑے لوگوں کی جیسی کرم تپسیا کے ذریعہ نجات حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اور برہمن لوگ شودروں کے برے کام کرنے پر مجبور ہیں۔ قدیم رسوم و روایات کو توڑ کر زمین کو لرزا دینے والے اسی گناہ کے نتیجے میں زمین کے دیوتا برہمن کو جوان بیٹے کا غم ملا۔ اپنی ذاتی پریشانی کو عام پریشانی کی شکل دے کر ورہی کا دل اس گناہ کی تلافی کرنے کے لئے بے قرار ہوگیا۔

مہاگیانی ورہی اس پاپ کی دہائی دینے بھکت وتسل، رگھوکل سوریہ بھگوان، بھگوان رام کی شرن لینے ایودھیا پہنچے۔ غم زدہ برہمن کی آمد کی خبر سن کر بھگوان ننگے پاؤں دوڑ کر آئے اور ہاتھ جوڑ کر التجا کی۔ "ہے بھو دیو، پرتھوی پر تمہارا وچن ہی دھرم اور قانون ہے۔ تمہارے آشیرواد سے ہی چھتری لوگ اقتدار حاصل کر کے دھرم اور قانون کی حفاظت کرتے ہیں۔۔۔ داس خدمت کے لئے حاضر ہے۔"

مہاگیانی ورہی سے مدگل شہر میں چھائے شدید پاپ اور بڑے لوگوں کی تکالیف کی روداد سن کر بھکت وتسل رام زمین پر دھرم کی حفاظت کے لئے تیار ہوگئے اور انہوں نے چتورنگی فوج ساتھ لے کر مدگل شہر کی طرف کوچ کیا۔

شمبوک کو ماننے والے داس اور شودر مدگل شہر کے قریب ایک باغیچے میں جمع ہو کر مختلف قسم کی سخت ریاضت کے ذریعہ خواہشات نفسانی سے دھیان ہٹانے کی کوشش کر رہے تھے۔ شمبوک ایک غار میں پنچ اگنی کے بیچ میں سر نیچے اور پاؤں اوپر کر کے ورکش آسن سے تپسیا کر رہا تھا۔

بدمعاشوں کو کچلنے والے بھگوان رام کے بہادر سپاہیوں نے نجات کے خواہش مند لیکن دھرم کے باغی شودروں کو قیدی بنا کر ایک میدان میں اکٹھا کردیا بھگوان رام ہاتھ میں کرپان لے کر شمبوک کی گپھا میں گئے اور اس کے بالوں سے کھینچتے ہوئے اسے گپھا سے باہر نکال لائے۔

خوف سے کانپتے قیدی شودروں اور حیرت سے آنکھیں پھیلائے ہاتھ جوڑ کر کھڑے اعلیٰ طبقے کے لوگوں کے سامنے بھگوان نے شمبوک کو بخش دیا۔

اٹھ کر کھڑے ہونے پر شمبوک نے دیکھا۔ لوگوں کو پریشانیوں سے نجات دلانے والے بھگوان مجسم اس کے سامنے کھڑے ہیں۔ خوشی سے اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔۔ "میری تپیا کامیاب ہوئی!" شمبوک نے کہا' "بھگوان مجھے مکتی دان دیجئے۔"

کنول نما آنکھوں والے رام کی آنکھیں غصے سے لال ہوگئیں۔ انہوں نے شمبوک کو ڈانٹا۔۔ مکتی دھرم برہمن کا ہے' شودر کا نہیں!"

"بھگوان' انصاف!" شمبوک نے بھیک مانگی۔

"سوامی اور برہمن کا وچن ہی انصاف ہے۔" بادل کی طرح گرج کر بھگوان نے جواب دیا! ان کا دایاں ہاتھ جس میں کرپان تھی' شمبوک کے کندھے سے اوپر اٹھ گیا۔

شمبوک نے مضطرب آنکھیں اٹھا کر دیکھا۔۔۔ "بھگوان کا کیا یہی انصاف ہے؟" اس نے کمزور آواز میں گذارش کی۔

بھگوان کا غصہ بڑھ گیا۔ "بے وقوف شودر' برہمن کا قول ہی انصاف ہے!" انہوں نے گرج کر کہا۔

"تو پھر مکتی کی خواہش بھی نہیں؟" شمبوک نے سر اوپر اٹھایا۔

"مہاپاتک!" بھگوان کے منہ سے غصے کے ساتھ نکلا اور ان کے ہاتھ کی کرپان شمبوک کے سر کو زمین پر گرا کر نیچے آگئی۔

بھگوان نے غصے سے قیدی شودروں کی طرف دیکھا۔ وہ لوگ زمین پر سر جھکا کر عاجزی کے ساتھ معافی کی درخواست کر رہے تھے۔

زمین ہل گئی۔۔۔

اعلیٰ طبقے کی قطار نے ہاتھ جوڑ کر عقیدت سے سر جھکا دیے۔ برہمنوں نے آشیرواد منتر کا اچارن کیا انہوں نے کہا۔۔ "بھگوان کے انصاف سے دیوتا خوش ہوئے اور زمین پر دھرم قائم ہوا۔

بھگوان رام کے چرنارونڈ میں دل لگا کر برہمن اور اعلیٰ طبقے کے لوگ دھرم کی باتوں میں محو ہوگئے۔

کوکلا ڈکیت

کوکلا، جیل کی زنانہ بیرک میں قیدی جمعدارنی تھی۔

کوکلا کو اعتماد اور عزت کا یہ رتبہ اس لئے دیا گیا تھا کہ بیرک میں صرف وہی ایک عورت ڈکیتی کے جرم میں سزا کاٹ رہی تھی۔ تمام قیدی عورتوں کی تعداد لگ بھگ اسی تھی۔ سیاسی قیدیوں یا کانگریس کی ستیاگرہی تحریک میں سزا یافتہ عورتوں کی تعداد گیارہ تھی۔ بیشتر عورتیں شوہر، سوت یا سوت کی اولاد کو زہر دے کر مار ڈالنے کے جرم میں آئی تھیں۔ دو تین غریب دیہاتی عورتیں لٹیا یا دھوتی چرانے کے جرم میں سزا بھگت رہی تھیں۔ ایک عورت شاید مالکن کا زیور چرانے کے جرم میں سزا بھگت رہی تھی۔

سماج میں تو عموماً دیگر جرائم کے مقابلے میں دو جرم یعنی قتل اور ڈکیتی کے خلاف ہی سب سے زیادہ نفرت یا خوف ظاہر کیا جاتا ہے لیکن جیل میں دوسرا ہی ضابطہ چلتا ہے۔ ہم لوگ عموماً جن جرائم کو نظر انداز کر دیتے ہیں، جیل کی انتظامیہ کی نظر میں وہی جرائم زیادہ سنجیدہ مانے جاتے ہیں۔ انگریزوں نے سات سمندر پار سے اپنی صرف معمولی سی برادری لا کر ڈیڑھ سو برس تک اس ملک کی چالیس کروڑ آبادی پر کامیابی سے حکومت کی تھی۔ ان کی اس سیاست کا راز اس ملک کے لوگوں کی مدد سے ہی اس ملک پر حکومت کرنا تھا۔

انگریز سرکار نے حکومت کا یہی طریقہ جیلوں میں بھی اختیار کیا تھا، یعنی جیل میں بند ڈیڑھ دو ہزار قیدیوں کو قابو میں رکھنے کے لئے، ان قیدیوں میں سے ہی کچھ لوگوں کو چن کر کام چلا لینا۔ انتظام میں مدد کے لئے چنے گئے قیدیوں کو محکمہ جیل کے دیگر ملازمین کی طرح تنخواہ نہیں دینی پڑتی۔ قید کی میعاد میں کچھ چھوٹ، سخت محنت سے نجات اور دوسری کچھ سہولتیں دے کر ہی ان قیدیوں کو انتظام کے لئے ضروری عملے

میں ملالیا جاتا ہے۔ ایسے قیدیوں کو قیدی پہریدار' (C.N.W)' قیدی نگراں' (C.O)' قیدی محرر' (C.R) اور قیدی جمعدار' (C.w) کے بغیر تنخواہ کے عہدے دیے جاتے ہیں۔

جیل کے قواعد وضوابط کے مطابق چند خاص جرائم کے قیدیوں کو ہی ایسے عہدوں کے لئے چنا جاسکتا ہے۔ بہت سے جرائم کے قیدی بھروسے کے قابل نہیں سمجھے جاتے۔ مثال کے طور پر سیاسی قیدی یا زیادہ پڑھے لکھے قیدی اعتماد کے قابل نہیں سمجھے جاتے۔ کوکلا اگر اپنا نام کوکلا' بتاسکتی تو اتنی اعتماد کے قابل نہ ہوتی۔ زیادہ پڑھے لکھے کسی قیدی کو جیل کے دفتر میں ڈیوٹی دینے کے لئے موزوں نہیں سمجھا جاتا۔ جعل سازی یا جیب کاٹنے کے جرم کے لئے جیل بھیجے گئے قیدی بھی اعتماد کے قابل نہیں سمجھے جاتے۔ فوجداری' قتل یا ڈکیتی کے لئے سزا بھگتنے والے لوگ ہی جیل کے انتظام میں مدد کے لئے قابل اعتماد سمجھے جاتے ہیں۔ کردار اور افادیت کے اسی پیمانے کے تحت کوکلا جمعدارنی بن گئی تھی۔

ویسے تو مردوں کی ہی طرح عورتوں سے بھی سب طرح کے جرائم کا خدشہ محسوس کیا جاسکتا ہے لیکن عورت کے ڈاکو ہونے کی بات سن کر کچھ حیرت ضرور ہوتی ہے۔ محسوس کیا جاتا تھا کہ کوکلا نے کسی عورت یا بچے سے کوئی کپڑا یا زیور چھین لیا ہوگا۔ اس کے علاوہ وہ اور کیا ڈکیتی کرپائی ہوگی؟

پوچھنے پر کوکلا ٹال دیتی— "ہاں بی بی جی' تم بھی کیا کہتی ہو۔ تم ہی جانو' عورت جات کیا ڈکیتی کرے گی؟"

اس جواب سے کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ سنا ہے مرد قیدیوں کا بھی یہی طریقہ ہے۔ قیدیوں سے ان کے جرم کے بارے میں پوچھنے پر عموماً یہی جواب ملتا ہے کہ انہوں نے کوئی جرم نہیں کیا' عداوت کی وجہ سے ان کے خلاف جھوٹی گواہی پیدا کرکے انہیں پھنسا دیا گیا ہے۔ کوکلا نے شروع میں بھی اتنا صاف جھوٹ نہیں بولا اس لئے اس کا معاملہ جاننے کا اشتیاق اور زیادہ تھا۔

اس رات کوکلا گشت کی ڈیوٹی پر تھی۔ دن بھر کی گھٹن کے بعد رات میں رم جھم پانی برس رہا تھا۔ وہ کمبل اوڑھے اور ہاتھ میں لالٹین لیے گشت کرتی ہوئی میری

کوٹھری کے سامنے سے گذری- اس کی ڈیوٹی تھی کہ رات میں کوٹھریوں اور بیرکوں کے چاروں طرف گھوم کر نگرانی کرے کہ کوئی قیدی عورت بھاگنے کی کوشش تو نہیں کر رہی- میری لالٹین جلتی دیکھ کر اس نے میرے جاگتے ہونے کا اندازہ لگا کر پکارا---
"بی بی جی، رام رام!"

رات میں کچھ دیر تک پڑھنے کے لئے مجھے ایک ہری کین لالٹین دے دی گئی تھی- کتاب پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن دل نہیں لگ رہا تھا- کوکلا کو جواب دیا--- "آؤ جمعدارنی، خواہ مخواہ بھیگ کیوں رہی ہو؟ اس بارش میں دیوار پھاند کر کون قیدی عورت بھاگی جا رہی ہے؟"

"بی بی جی، ذرا چابی پوری کر آؤں، آ کر بیٹھتی ہوں-" کوکلا نے جواب دیا-

قیدی مرد عورتوں کو جمعدار بنا کر بھی سرکار ان پر پوری طرح بھروسا نہیں کرتی ہے- ان جمعداروں یا پہرے داروں کی کمر پر پیٹی میں ایک گھڑی بندھی ہوتی ہے- جیل کی دیواروں اور عمارتوں میں جگہ جگہ پر زنجیروں سے چابیاں بندھی ہوتی ہیں- پہرے دار ان چابیوں کو اپنی گھڑی میں لگاتے رہتے ہیں- صبح گھڑی کے اندر لگا کاغذ کھول کر دیکھا جاتا ہے کہ گشت ٹھیک ڈھنگ سے لگایا گیا تھا یا پہریدار رات میں اونگھتا رہا تھا- کوکلا چابی پوری کر کے کچھ ہی منٹ بعد لوٹ آئی- وہ میری کوٹھی کے جنگلے دار بند دروازے کے باہر اپنا لہنگا سمیٹ کر زمین پر ہی بیٹھ گئی تھی- میں نے جیل کا کمبل سلاخوں سے باہر نکالتے ہوئے کہا--- "ہائے، زمین پر کیوں بیٹھتی ہو؟ کمبل لے لو!"

میرے احسان سے مطمئن ہو کر کوکلا نے جواب دیا--- "مالکن یہاں عمر بھر ایسے ہی اٹھتے بیٹھتے رہے ہیں- اپنا کمبل کیوں خراب کرتی ہو- ٹھنڈا ٹھنڈا تو اور اچھا لگ رہا ہے- گرمی کے مارے جان نکل رہی ہے-"

"کوکلا، تمہارا گھر تو کسی پہاڑی علاقے میں معلوم ہوتا ہے-" میں نے اس کے تلفظ سے اندازہ لگایا، "تمہیں تو بریلی کی گرمی بہت ستاتی ہو گی؟"

"ہاں بی بی جی، نینی تال کی ہوں-" کوکلا نے تائید کی، "آپ نے تو دیکھا ہو گا نینی تال؟ آپ جیسے بڑے لوگ گرمی میں نینی تال جاتے ہیں-"

"ہاں ہاں، دیکھا کیوں نہیں۔ ہماری بیٹی وہیں اسکول میں پڑھتی ہے۔ ہر سال جاتے ہی تھے۔ کیا بتائیں اس سال انگریزوں سے لڑائی کی وجہ سے جیل کاٹ رہے ہیں۔"

"ہاں مالکن اور کیا؟" کوکلا نے ہمدردی ظاہر کی، "نہیں تو جیل آپ جیسے لوگوں کے لئے تھوڑے ہی ہے۔ آپ لوگوں کو کیا کمی ہے جو جیل میں آئیں۔ آپ لوگ راجا ہیں۔ راجا سے راجا کی ہی لڑائی ہو سکتی ہے۔"

اس کی بات سے جھینپ کر میں نے بات بدلنے کے لئے پوچھ لیا--- "تمہارا گھر نینی تال سے کتنی دور ہے؟"

"دور کیا، خاص نینی تال کی ہوں، مالکن!" کوکلا نے فخر سے جواب دیا۔

"خاص نینی تال کی؟" نینی تال میں اس کا گھر کس جگہ ہے، یہ جاننے کے لئے، میں حیرت کا اظہار کیا۔

"ہاں بی بی جی، خاص نینی تال میں۔" اس نے سمجھایا، "کلا خان جانتی ہو نہ! وہیں نیچے ہی ہم لوگوں کی بکھری (چھپروں کی بستی) ہے۔"

"کیا کام ہوتا ہے تم لوگوں کے یہاں؟"

"کام کیا، بی بی جی، ہم لوگ گھاس لکڑی کا کام کرتے ہیں۔ مرد قلی کا کام کرتے ہیں۔ سیجھن (سیزن) میں رکشا، ڈانڈی ڈھوتے ہیں، جاڑوں میں پتھر ڈھوتے ہیں۔"

"ہوں، ملا جلا کر گذارا چل جاتا ہوگا۔" میں نے ہمدردی ظاہر کی۔

"مالکن، گذارا ہی چل جاتا تو یہاں کیوں آمرتی؟" کوکلا نے بلا جھجک کہہ دیا۔

"تو کیا تم نے سچ مچ ڈکیتی کی تھی؟" میں نے بے اعتمادی ظاہر کی۔

"اب جو سمجھ لو، جھوٹ بولنے سے کیا بن جائے گا مالکن؟" کوکلا نے گہری سانس لی، "اب تو سزا کٹ ہی گئی۔"

"ڈکیتی میں اور لوگ بھی تمہارے ساتھ رہے ہوں گے؟ اکیلی تم نے کیا کیا ہوگا؟" میں نے اس کی حوصلہ افزائی کرنے کے لئے سوال کیا۔

برساتی رات کی تنہائی میں کوکلا کا دل بھر آیا۔ اب تک جس راز کو وہ ٹالتی آرہی تھی، وہ اس کے گلے میں اُمڈنے لگا۔ اس نے بتایا---

کوکلا کی برادری کی عورتیں نینی تال کے آس پاس ڈھلوانوں پر گھنے جنگلوں کی گھاس اور لکڑی اکٹھا کر کے نینی تال کے بازار میں بیچتی ہیں۔ بھاری سے بھاری برسات میں بھی ان کا یہ کام چلتا ہی رہتا ہے۔ ان لوگوں کے لہنگے اور اوڑھنی چوماسے بھر گیلے ہی رہتے ہیں۔ یاد آگیا۔ اگر نینی تال کی صاف ستھری سڑک پر گھاس والی پاس سے گذر جائے تو ناک پر رومال رکھے بغیر نہیں رہا جاتا۔ شاید اسی لئے میونسپلٹی نے خاص سڑک کے ساتھ متوازی سڑک بوجھ ڈھونے والوں اور مویشیوں کے لئے بنوادی ہے۔

ہر طرح کی مصیبت جھیل کر بھی گھاس اور لکڑی کے دام اتنے کہاں ملتے ہیں کہ دو بچوں کے لئے دال روٹی مہیا کی جاسکے۔ گھاس اور لکڑی کے کمر توڑ بوجھ کے دام سات آٹھ آنے سے زیادہ نہیں ملتے۔ وہ بھی کتنے دن، جہاں اساڑھ کی بوچھاریں شروع ہوئیں، نینی تال میں کہرا پڑنے لگتا ہے۔ میدانوں سے آئے سیلانی صاحب لوگ بھی چلے جاتے ہیں۔ ان صاحب لوگوں کا شوق پورا کرنے کے لئے رام پور اور بریلی سے آئے گھوڑے والے بھی، اپنے جانور لے کر لوٹ جاتے ہیں۔ گھاس اور لکڑی کی فروخت بھی کم ہوجاتی ہے۔ ان عورتوں کا یہی روز گار ہے، ان کے لئے دوسری جگہ بھی نہیں، وہ کیا کریں؟ گذر تو کرنی ہی پڑتی ہے۔ انہیں کچھ گھاس اور لکڑی کی فروخت سے اور کچھ ویران جنگلاتی سڑک پر سیر کے لئے آنے جانے والوں سے مل جاتا ہے ویران جنگلاتی سڑک پر سیر کے لئے نکلنے والے لوگوں سے کچھ مل جانے کا مطلب بھیک مل جانا نہیں ہے۔ نینی تال آنے جانے والے اس سڑک کا ذکر انکھیوں سے کرتے ہیں۔ سڑک پر گھاس والیاں اکثر دکھائی دے جاتی ہیں۔ شوقین لوگ انہیں دیکھ کر کھانس یا کھنکھار دیتے ہیں۔ گھاس والی کے مسکرادینے پر دو تین چونی میں سودا طے ہوجاتا ہے۔ کبھی گھاس والی کے پیڑوں یا گھاس آڑ میں رہنے سے سیلانیوں کی نظر اس پر نہ پڑے تو گھاس والی ہی سڑک پر کنکر پھینک کر یا سیٹی بجاکر متوجہ کرلیتی ہے۔ ایسے اشارے نہ سمجھ پانے والے نئے لوگوں سے یہ عورتیں سڑک پر آکر سگریٹ یا بیڑی مانگ لیتی ہیں۔ مانگنے کا ڈھنگ کافی اشتیاق انگیز ہوتا ہے۔

ان عورتوں کا آسانی سے دو تین چونیاں کمالینے کا لالچ نینی تال کی پولیس چھاؤنی

کے حکام کے لئے مشکل مسئلہ بن گیا تھا۔ اس علاقے میں یہ راستہ شوقین مزاج لوگوں، گھر بار سے بچھڑے سپاہیوں اور خاص طور پر بیباک گوروں کے لئے کافی پر کشش بنا ہوا تھا۔ وہ چھپ چھپ کر وہاں جاتے اور دو تین چونی میں شوق پورا کر کے بیماری ساتھ میں لے آتے تھے، اس لئے سرکار کو ان عورتوں کی وجہ سے نہیں بلکہ انگریز حکومت کے بہادر سپاہیوں کی صحت کی حفاظت کے لئے اس سڑک پر دیکھ بھال کرنی پڑتی تھی۔ جگہ جگہ نوٹس لگا دیے گئے تھے۔۔ یہاں بدتمیزی کرنے والوں کو سزا دی جائے گی۔

اس جنگلاتی سڑک پر گھاس اور لکڑی لانے والی زیادہ تر عورتیں جس طرح گذرتی تھیں، ویسے ہی کوکلا کی بھی گذر ہوتی تھی۔ ایک دن بوجھ ڈھونے کے دوران اس کا شوہر ٹھوکر لگنے سے گر گیا۔ اس کے پاؤں کا انگوٹھا کٹ گیا۔ وہ پیر کے درد کی وجہ سے کئی دن تک گھر میں بیٹھا رہا۔ کوکلا کی کمائی سے ہی تینوں بچوں اور میاں بیوی کا گذارا ہو رہا تھا، اس پر جنگ کے زمانے کی مہنگائی۔

ایک دن کوکلا نے جلدی جلدی گھاس کاٹ کر، بوجھ باندھ کر ایک پیڑ کے تنے سے لگا کر رکھ دیا اور آنے جانے والوں کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ پچھلے دو دن سے اسے سڑک پر کچھ نہیں ملا تھا۔ پیسے کی کمی سے وہ پریشان تھی۔ بنیا دو تین روپے سے زیادہ کا ادھار بھی نہیں دیتا تھا۔ پچھلی رات بچوں اور شوہر کو جیسے تیسے کچھ کھلا دیا تھا لیکن خود بھوکی رہ گئی تھی۔

کوکلا نے سڑک پر ایک آدمی کو آتا دیکھ کر ہونٹوں سے ہلکی سی سیٹی بجائی۔ وہ آدمی بغیر دھیان دیے چلا آ رہا تھا۔ وہ سڑک پر آ گئی اور اس آدمی سے بیڑی مانگی۔ کوکلا کا چہرہ پر کشش نہیں تھا۔ شاید اس دن، پچھلی رات سے بھوکی ہونے کی وجہ سے وہ اور بھی مرجھائی ہوئی لگ رہی تھی۔ آدمی نے مسکرا کر ایک بیڑی اس کی طرف پھینک دی لیکن رکا نہیں۔ کوکلا کھسیا کر رہ گئی۔ کچھ ہی دیر میں دوسرا آدمی دکھائی دیا۔ کوکلا نے پھر ہمت کی۔ اس کے قریب جا کر مسکرا کر ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر بیڑی کے لئے اشارہ کیا۔

یہ آدمی دوسرے ڈھنگ کا تھا۔ ہشت!' اس نے کوکلا کو ڈانٹ دیا اور چلتا چلا

گیا۔ کوکلا کی مایوسی جسارت میں بدل گئی۔ وہ آپے سے باہر ہو گئی۔ اس نے بغل میں دبی گھاس کاٹنے کی ہنسیا سے آدمی کو دھمکایا۔۔ "دہشت کیا؟.... شالے ابھی نکال دو چونی، نہیں تو ابھی تجھے کاٹ کر جنگل میں پھینک دیتی ہوں؟"

آدمی سہم گیا۔ اگر وہ لڑنے کے لئے تیار ہو بھی جاتا تو ہنسیا سے ایک آدھ کھرونچ لگ جانا بھی تو کوئی اچھی بات نہیں تھی۔ ایک اٹھنی کے لئے اتنا خطرہ مول لینا اس آدمی کو مناسب معلوم نہیں ہوا۔ اس نے چپکے سے اٹھنی نکال کر کوکلا کی طرف پھینک دی۔

اس وقت تو کوکلا کی پریشانی دور ہو گئی لیکن اسے لگا کہ اسے ایک بہت اچھا طریقہ ہمیشہ کے لئے مل گیا۔ ہنسیا دکھا کر دھمکانے سے دو چونی آسانی سے مل سکتی ہیں، تو اس کے لئے کانٹوں اور کیچڑ سے بھری جنگل کی زمین پر پریشانی سہنے کی کیا ضرورت ہے؟ کچھ دن وہ ایسا کرتی رہی۔ اس طریقے میں آدمی کو خوشی یا ناخوشی کا بھی سوال نہیں تھا۔

کوکلا نے کبھی نہیں سوچا کہ اٹھنی لینے کا جو نیا ڈھنگ اس نے اپنا لیا تھا، اس کا اثر کتنی دور تک پہنچ رہا ہو گا۔ وہ اپنی کامیابی کے بھروسے نئے راستے پر چلی جا رہی تھی۔ آخری دن بھی ایک آدمی کی سیٹی سن کر وہ سڑک پر آ گئی۔ اس آدمی کے بیڑی پلانے کے اشارے پر کوکلا نے اسے ہنسئے سے دھمکا کر دو چونی مانگیں۔

اس آدمی نے کچھ اس طرح رد عمل ظاہر کیا جیسے وہ بہت ڈر گیا ہو۔

"اچھا دیتا ہوں" یہ کہہ کر وہ اندر باہر کی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ ادھر ادھر دیکھتا جا رہا تھا۔ جیب سے پیسہ نکالنے کے بہانے اس نے ایک طمنچہ نکال کر کوکلا کے سینے پر رکھ دیا اور گالی دے کر ہنسیا زمین پر ڈالنے کا حکم دیا۔

کوکلا ہکی بکی رہ گئی۔

آدمی نے بہت زور سے ایک طمانچہ بھی کوکلا کے منہ پر مار دیا اور جیب سے سیٹی نکال کر زور سے بجائی۔ دو اور آدمی بھاگتے ہوئے آ گئے۔

کوکلا حیران رہ گئی۔ پولیس نے اسے گرفتار کر لیا تھا۔

کوکلا روئی، گڑگڑائی، سپاہیوں کے پیر چھوئے لیکن سپاہی کسی طرح نہیں مانے۔

اسے تھانے لے جاکر حوالات میں بند کردیا گیا۔ گھاس والی ڈکیت' کی رپورٹ لکھانے والوں کو تھانے میں بلایا گیا۔ کوکلا پہچان لی گئی۔ اس کے ذریعے لوٹے جانے والے لوگوں میں دو گورے سپاہی بھی تھے۔ مقدمہ چلا۔ کوکلا کو تین بار ڈکیتی کرنے کے جرم میں چار برس قید بامشقت کی سزا دے دی گئی۔

اپنی بات سنا کر کوکلا نے گہری سانس لے کر تشویش کا اظہار کیا۔ جیل کی سزا پوری کرکے وہ چھوٹ بھی جائے گی تو کہاں جائے گی؟ ہو سکتا ہے اس کے شوہر نے اور شادی کرلی ہو۔ اس کے تینوں بچوں کا کیا ہوا ہوگا؟ اس کی برادری کے لوگ کیا کہیں گے؟

کوکلا اٹھ کر دوسرا گشت لگانے چلی گئی۔ میں اٹھنی کی ڈکیتی کی بات سوچتی رہی۔

اٹھنی کی ڈکیتی کے لئے چار سال کی سزا اور کوکلا کے بچوں کو ماں کے جرم کے لئے' ماں چھن جانے کی سزا۔ لیکن ڈکیتی تو ڈکیتی ہے' چاہے آٹھ آنے کی ہو یا آٹھ لاکھ روپے کی۔ کوکلا کے زور زبردستی سے کسی کے آٹھ آنے چھین لینے کے جرم کو کوئی بھی سرکار نظر انداز کیسے کرسکتی ہے؟ لوگوں کی جائیداد کی حفاظت کرکے امن قائم رکھنا ہی سرکار کا کام ہے لیکن کوئی بھی مرد ذاتی طور پر اپنی بیوی کا کس ڈھنگ سے آٹھ آنے لے لینا زیادہ ناقابل معافی سمجھے گا؟ ہنسئے کے زور سے یا....؟ لیکن انتظامیہ کی نظر سے تو جایداد اور امن کی حفاظت ہی زیادہ ضروری ہے۔

کوکلا کا ہنسئے کے زور سے سڑک پر اٹھنیاں چھیننا اصل میں ڈکیتی تھی لیکن اٹھنی کے زور سے بیسیوں بار کوکلا سے جو چھینا گیا' وہ قانون کی نظر میں کیا تھا؟

اس کی تو کوکلا شکایت بھی نہیں کرسکتی تھی۔۔۔۔

مٹھو کے آنسو

گگوکش مندر کے پجاری ہلدھر پنڈت کا چھوٹا بیٹا سداما سولہ برس کا ہوگیا تھا۔ مڈل کے امتحان میں دو بار دھکیلے جانے پر بھی وہ اسے پاس نہیں کرپایا تو اکھاڑے بازی اور راس لیلا میں ہی زیادہ دل لگانے لگا۔ پجاری جی اپنے بڑے بیٹے کو پڑھا لکھا کر بابو بنادینے پر ندامت محسوس کر رہے تھے۔ مندر کے مستقبل کا خیال کرکے چپ رہ گئے۔

سداما کا بڑا بھائی بلرام میٹرک پاس کرکے پجاری کے کام کو بطور ذریعہ معاش اختیار کرنے میں شرم محسوس کرنے لگا۔ پجاری جی پر مہربان ایک ججمان کی مہربانی سے وہ تار گھر میں نوکری کرنے لگا اور مندر چھوڑ کر شہر کے ایک محلے میں جاکر بس گیا۔ پجارن کئی برس پہلے ہی بیکنٹھ سدھار گئی تھیں۔ بڑا لڑکا بہو کو لے کر دور چلا گیا تو پجاری جی کو گھر سونا سونا لگنے لگا۔ سداما کو اس کے اکھاڑے اور راس لیلا کے ساتھی گھیرے رہتے تھے۔ اس سے ہلدھر پنڈت کو کیا سکون ملتا؟ وہ چھوٹے لڑکے کے لئے بہو تلاش کرکے اپنا گھر پھر سے آباد کرنے کی فکر کرنے لگے۔ وہ دو برس تک کوشش کرتے کرتے یم راج کے یہاں ان کا کھاتا پورا ہوگیا۔ دنیا کو اور بسانے کی فکر میں انہیں خود ہی یہ دنیا چھوڑ دینی پڑی۔

باپ کا ہاتھ سر پر سے ہٹ گیا تو سداما کو گذارا کرنا مشکل محسوس ہونے لگا۔ کچھ وقت کا اثر سمجھئے کہ ججمانوں کے یہاں سے براہ راست کچھ لانے میں پجاری کے لڑکے کو اپنی جوانی کی ہیٹی محسوس ہوتی تھی۔ اور ججمان کے گھر جانے سے ہوتا بھی کیا؟ جب غلہ روپئے کا بیس سیر ملتا تھا تو ججمان فراخدلی سے تھالی بھر آٹا' دال اور آدھا چھٹانک گھی اور نمک بھی دے دیتے تھے۔ اب غلہ ڈھائی تین سیر کے بھاؤ بک رہا تھا۔ ججمان چٹکی بھر آٹا دے کر ہی ثواب کمالینا چاہتا تھا۔ سداما کو کئی بار خیال آیا کہ جب بھگوان کی خدمت کا پھل ہی نہیں تو انہیں ان کے بھروسے چھوڑ کر جہاں سینگ

سمائے چل دے لیکن پرانی جگہ کی محبت تھی۔ مندر کا اکھاڑا اسی کا بنایا ہوا تھا۔ اس کی جان پہچان کے پانچ سات لڑکے وہاں آتے تھے۔ رام لیلا اور جنم اشٹمی کی جھانکی کا سامان اسی نے اکٹھا کیا تھا۔ اس کی گائے نئی بیائی تھی۔ کسی ججمان نے ایک بچھیا بچاری کو گودان میں دے دی تھی۔ وہ آس پاس کے کھلے میدانوں میں چر کر خوب تندرست ہوگئی تھی۔ سدا ما اس کے لئے پڑوس کے کھیتوں میں سے ہرا چارا بھی جھنگ لاتا تھا۔ کنویں سے پانی کھینچ کر پلاتا تھا' نہلاتا بھی تھا۔ اب وہ ایک بچھڑے کی ماں گوماتا' بن گئی تھی۔ چتکبرا بچھڑا بھی کودتا پھاندتا بہت پیارا لگتا تھا۔ سدا ما نے اس کے گلے میں اور کھروں میں گھنگرو باندھ دئے تھے۔ سدا ما مورتی کے منڈپ پر بنی بارہ دری میں یہ رہنے لگا۔

اسکولی تعلیم نہ پانے پر بھی سدا ما بے عقل نہیں تھا۔ اس نے دیکھا جن مندروں میں کیرتن ہوتا ہے' پوجا کرنے والوں کے لئے ان میں زیادہ کشش ہوتی ہے۔ اس نے بھی کیرتین کرانا شروع کردیا۔ اس کی آواز اچھی تھی۔ کچھ لوگ شہر سے کچھ دور چل کر بھی کیرتن کے لئے گمھوکش مندر میں آنے لگے۔ اس نے شام کو ٹھنڈائی گھوٹ کر دینے کا انتظام بھی کردیا تھا۔ پوجا کرنے والوں کے نہانے کے لئے کنویں سے پانی بھی نکال دیتا تھا۔ لوگوں کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مندر کے کنویں کا پانی دوسرے کنوؤں کے پانی سے زیادہ ٹھنڈا ہے۔ گرمیوں میں شام کے وقت کچھ بھیڑ ہونے لگی۔ ایک دو خوانچے والے بھی پہنچنے لگے۔ اس سال گمھوکش مندر کی راس لیلا بھی اچھی رہی۔

ایک ہی برس میں گمھوکش کا مندر بہت مشہور ہوگیا۔ شہر سے عورتوں کی ٹولیاں بھی پوجا کے لئے آنے لگیں۔ پہلے بوڑھی عورتیں' پھر جوان عورتیں اور بعد میں بہوئیں اور لڑکیاں بھی آنے لگیں۔ پوجا کے دوران سدا ما نہا کر کمر میں دھوتی کا پھینٹا کس کر' تیل لگے گھنگھریالے کندھے تک کیے ہوئے' مورتی کے چرنوں میں بیٹھا چڑھاوا قبول کرتا اور پرساد بانٹتا رہتا تھا۔ اس کے کھلے' ورزشی چوڑے سینے پر بھی نرم اور کالے گھنگھریالے بال اٹھ رہے تھے۔ اس کے نوجوان سے بھیگتے چہرے اور مضبوط بازوؤں کو دیکھ کر کئی البیلی . مگنوں کے دل میں گوپی کا جذبہ جاگ اٹھتا تھا۔ وہ اسے ایسے چتون سے دیکھ جاتیں کہ سدا ما کو بار بار یاد آتا رہتا اور اسے بے چینی محسوس

ہوتی تھی۔ تب اسے مٹھو کی یاد آتی تھی۔ وہ سڑک کے مشرق میں بندرا کاچھی کے یہاں سے ترکاری جیسے لوکی، ترئی یا مولی لانے کے لئے چل دیتا تھا۔

مٹھو بندرا کاچھی کی بہو تھی۔ مندر سے مشرق میں سڑک پار سو قدم پر بندرا کی کھیاری تھی۔ آدھا بیگھہ زمین میں وہ ترکاری اور پھولوں کی کھیتی کرتا تھا۔ بندرا کے لڑکے کی شادی میں قرض زیادہ ہوگیا تھا' اس لئے لڑکا ایک تیل کی مل میں نوکری کرنے لگا۔ پھر کانپور میں اچھی مزدوری ملنے پر وہاں چلا گیا تھا۔ کبھی مہینہ پندرہ دن میں ایک دو دن کے لئے گھر آجاتا تھا۔ اس کی عمر کم ہی تھی لیکن بدن سوکھا سوکھا اور گال پچکے ہونے سے بے رونق سا لگتا تھا۔ نشے کی عادت سے کمزور بھی ہوگیا تھا۔ بندرا کو گٹھیا کا مرض تھا۔ مٹھو کی ساس صبح کو ترکاری لے کر شہر چلی جاتی تھی اور تیسرے پہر کو لوٹتی تھی۔ کھیاری کا کام مٹھو کے ہی ذمہ تھا۔

مٹھو کبھی کبھی پجاری جی کی گائے کا گوبر لے جاتی تھی۔ ہلدھر دیکھ لیتے تو شور مچانے لگتے تھے۔۔۔ "گوبر کہاں لے جارہی ہے؟ کیا سینت کا گوبر ہے؟ ہم کیاری سے ایک بھنڈی توڑلیں تو بندرا لٹھ لے کر دوڑتا ہے۔"

مٹھو پانچویں چھٹے دن ترکاری دے جاتی تھی یا سداما جاکر لے آتا تھا۔ ترکاری کے لئے مٹھو اور سداما میں تکرار بھی ہوتی تھی۔ اس لئے نہیں کہ ترکاری سے سداما مطمئن نہیں ہوتا تھا بلکہ یوں ہی ذرا چھیڑنے کے لئے۔

پجاری کی موت کے بعد بھی مٹھو ترکاری لے کر آجاتی تھی۔۔۔ "دیکھیں تو کیا لائی ہو؟" سداما اس کی جھولی میں ہاتھ ڈال دیتا تھا' ہمیں نہیں چاہئے بھنڈی۔ ہم گھٹیاں لیں گے۔"

"ہائے' اس بکھت کہاں ہیں گھٹیاں؟" مٹھو مسکرادیتی۔

"یہ کیا چھپا رکھی ہیں!' سداما چھیڑ خانی کرنے لگتا۔

مٹھو جھلاتی۔۔۔ "ہم بلہ کردیں گے۔ کیا ہورہا ہے تمہیں؟ دیکھتے نہیں سورج بھگوان دیکھ رہے ہیں۔"

سداما کے اصرار پر یا مٹھو کی دعوت پر' ایک پہر رات گئے دونوں سڑک کے اس پار املی کے پیڑ کے نیچے ملے۔ پھر سداما نے سمجھایا۔۔۔ "رات میں کون رہتا ہے؟ وہیں

آجانا۔"

کبھی سدا اما مٹھو سے دن میں کہہ دیتا یا کبھی وہ خود ہی رات میں آجاتی۔

۱۹۴۰ء میں برطانوی سامراج یوروپ میں ہٹلر شاہی سے توپ تلوار سے لڑ رہا تھا۔ لڑائی میں اس ملک کی عوام اور وسیلوں کا استعمال کرنے کے لئے انہیں یہاں بھی شاطرانہ پالیسی اختیار کرنی پڑ رہی تھی۔ عوام کو بھوک سے بے چین کرکے، لڑائی کے مورچوں پر لانے کے لئے اناج اور کپڑا خوب مہنگا ہونے دیا۔ مہنگائی میں زیادہ دام حاصل کرنے کے لئے سب ہی سامان بازار سے غائب کردیا گیا۔ یہاں تک کہ سرکار کو جنگ کی ضروریات کے لئے غلہ، لوہا اور کپڑا ملنا مشکل ہوگیا۔

اناج اور کپڑے کی غیر معمولی مہنگائی کی وجہ سے ملک میں بے چینی پھیلنے کے امکانات پیدا ہوگئے، اس لئے اناج اور کپڑے کی فروخت اور قیمتوں پر کنٹرول لگادیے گئے۔ نئے نئے دفتر کھل رہے تھے۔ اکاؤنٹ کے دفتر کے سپرنٹینڈنٹ نارٹن صاحب ضلع کے راشننگ آفیسر تعینات ہوئے۔ اپنا دفتر ٹھیک سے چلانے کے لئے نارٹن صاحب نے اپنے تجربہ کار اور وفادار ہیڈ کلرک گجپت بابو کا تبادلہ اپنے یہاں کروا کر انہیں اپنا پرسنل اسسٹنٹ بنوالیا۔

گجپت بابو نے اپنی زندگی کے بیس سال اکاؤنٹ دفتر میں کلرکی کرتے ہوئے گذار دیے تھے۔ ان کی عمر چالیس برس ہونے تک بھگوان نے اپنے لاتعداد بندوں کی طرح ان کی طرف بھی خاص دھیان دیا تھا۔ تیس روپئے ماہ وار کی نوکری پر وہ کلرک بنے تھے۔ پہلے ڈھائی روپیہ سالانہ اور پھر پانچ روپیہ سالانہ کی ترقی کرتے کرتے وہ بڑے بابو کی کرسی پر بیٹھنے اور دو سو روپیہ ماہانہ پانے کے لائق ہوگئے تھے۔ گجپت بابو نے بھگوان کی طرف سے خاص حوصلہ افزائی نہ پاکر سرکار کے نمائندے، اپنے دفتر کے انگریز اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ کے لئے بھگتی اور شردھا دکھائی۔ ان کے کوئی غلطی نہ کرنے پر بھی صاحب انہیں غلطی سے "اسٹوپڈ" کہہ کر دھمکا دیتے، تب بھی وہ یس سر کہہ کر اپنی بھول کا اقرار کرلیتے تھے۔ صاحب، بابوجی کی اس صلاحیت کی قدر کیسے نہ کرتے!

جنگ کے دوران تاجر لوگ کپڑے' لوہے اور سیمنٹ کے بڑھے ہوئے داموں کی بدولت دونوں ہاتھوں سے منافع کما رہے تھے۔ سرکار نے ان کے منافع کو روکنے کے لئے کنٹرول لگادیا تاکہ سرکار کی ضرورتیں پہلے پوری ہو سکیں۔ کنٹرول کی نگرانی کر رہے تھے' نارٹن صاحب اور ان کی مدد کے لئے تھے گپت بابو۔ سیٹھ جی پندرہ منٹ کے سودے میں بیس ہزار کما سکتے تھے۔ لیکن خریدنے اور بیچنے کے پرمٹ کے بغیر کیسے کرتے۔ سیٹھ صاحبان کپڑے' لوہے اور سیمنٹ کی خرید و فروخت کے پرمٹوں کے لئے گڑگڑانے لگے اور درخواستوں کے نیچے سو یا دو سو کی رقم رکھ کر بابو جی کو دینے لگے۔ صاحب کو اتنی فرصت کہاں تھی کہ پوری فائلیں پڑھتے۔ منظوری یا انکار کے حکم گپت بابو ہی لکھتے تھے۔ صاحب منہ میں سگار دبائے دستخط کی مشین کی طرح حکم پاس کرتے جاتے تھے۔

بازار میں قیمتیں بڑھ جانے سے گپت بابو کی تنخواہ کے روپیوں کی قیمت چوتھائی بھی نہیں رہ گئی تھی۔ اس وقت خود بخود آتے ہوئے روپئے کو وہ کیسے ٹھکرا دیتے؟ اس پیسے کو ٹھکرانے سے وہ دگنا ہوکر ان کے پیروں میں گرتا تھا۔ سیٹھ صاحبان انہیں ان داتا پکار کر پانچ سو کا ہزار کے نوٹ تھما کر رحم کی بھیک مانگتے تھے۔ اسے گپت بابو اپنے پچھلے جنم کے پنیہ کا پھل اور بھگوان کی مہربانی کے علاوہ اور کیا سمجھتے؟ بھگوان نے دیر سے ہی سہی ان کی دعا سن لی۔ سرکار سے انہیں جو تنخواہ ملتی تھی' اس کے لئے وہ سرکار کا کام کرتے تھے۔ سیٹھ جی کو پچاس ہزار اکٹھا کرنے کا موقع دے کر اگر وہ مدد کے لئے ایک ہزار قبول کر لیتے تھے تو اس میں اندھیر کیا تھی؟

گپت بابو کو بھگوان کی اتنی بڑی مہربانی سنبھال لینے کی عادت نہیں تھی۔ یہ طاقت حاصل کرنے کے لئے انہیں بھگوان سے خاص مدد کی ضرورت تھی۔ ڈیڑھ برس کے دوران ہی سوا لاکھ سے زیادہ جمع کیے گئے روپئے کے خوف کے بوجھ سے ان کی سانس رکنے سی لگتی تھی۔ کالی گھاٹ کے مندر کی طرف پھیلتی بستی میں انہوں نے زمین کا ایک ٹکڑا لے کر بڑا سا مکان بھی بنوانا شروع کر دیا تھا۔ اس مکان کو دیکھ کر دوسرے لوگوں کو حیرت ہوتی تھی لیکن گپت بابو کو ڈر لگتا تھا۔ اپنے اندر محسوس ہونے والے ڈر کا ایک ہی حل تھا کہ وہ سب بھگوان کی مرضی اور مہربانی پر چھوڑ دیں۔ جیسے جیسے

ان کی پوشیدہ دولت بڑھ رہی تھی ان کا جسم اس کے بوجھ سے سوکھتا جا رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں بھگوان کو یاد کرنے لگے لیکن اس سے بھی سکون نہیں ہوتا تھا۔ ان کا دل چاہتا تھا کہ سہارے کے لئے بھگوان کے پاؤں پکڑلیں۔ وہ مندر جانے لگے۔ مندر میں بھگوان کے دیدار سے دل نہیں بھرتا تھا، خواہش ہوتی کہ بھگوان کے سامنے لوٹ کر ان کو پکاریں لیکن محلے کے مندر میں شناساؤں کے سامنے پوجا کی عاجزی دکھاتے ہوئے بھی جھجک ہوتی تھی۔ وہ دنیاوی دکھاوے کے لئے پوجا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ گپت بابو بھگوان کے چرنوں میں تنہائی پانے کے لئے کبھی ایک مندر میں جاتے تھے اور کبھی دوسرے میں۔

بھوکش کا مندر شہر سے ذرا ہٹ کر ہونے کی وجہ سے پجاری سداما . بھگتوں کی آسانی کا خیال کرکے رات کے نو بجے تک کیرتن اور آرتی ختم کر دیتا تھا اور مندر میں سناٹا ہو جاتا تھا۔ گپت بابو کیرتن ختم ہونے کے وقت بھوکش کے مندر میں آئے اور ایک طرف چپ چاپ بیٹھ کر بھجن کرنے لگے۔ آرتی بھی ہوگئی لیکن بابو خاموش بیٹھے بھجن کرتے رہے۔ سداما روزانہ کی طرح مندر کی بارہ دری میں جنگلے دار دروازہ بند نہ کرسکا۔ وہ ایک طرف بیٹھ کر سرتی ملنے لگا کہ بابو کا بھجن ختم ہوجائے۔ کافی دیر تک جب بھجن ختم نہیں ہوا تو اسے پریشانی ہونے لگی۔ اس نے اس رات مٹھو سے آنے کے لئے کہا تھا۔ وہ اس کا انتظار کر رہا تھا۔

آنکھیں بند کیے ہوئے بابو کا بھجن ختم نہیں ہوا۔ پچھواڑے کی طرف سے مٹھو آتی ہوئی دکھائی دی۔ سداما نے اس طرف جاکر مٹھو کا ہاتھ تھام کر اسے چبوترے پر چڑھا دیا اور آہستہ سے کہا۔ "یہ کوئی لمبا بھجن کرنے والا ہے۔ کافی دیر سے بیٹھا ہے۔ بس اب جانے ہی والا ہوگا، تو آجا۔ کھمبے کی آڑ میں بیٹھ جا۔ لے تب تک سرتی مرکرکھا۔"

گپت بابو کو بھجن کرتے کرتے کچھ اور وقت بیت گیا۔ بھجن ختم کرکے وہ مندر سے چلے جانے کے بجائے مورتی کے سامنے سا شٹانگ لیٹ گئے اور روہانسو آواز میں بولنے لگے۔ "ہائے، بھگت وسل، مرلی منوہر، گوپیوں کے پیارے، گوؤں کے رکھوالے، گجا کو تارنے والے، میری حفاظت کرو۔ ہے جگتارن، رادھا موہن، میں بڑا گناہ گار،

اور بدکردار ہوں۔ مجھے گناہ سے بچاؤ۔ میری حفاظت کرو۔" جیسے جیسے بابو کی بھکتی میں بے چینی بڑھ رہی تھی، ان کے رونے کی آواز اونچی ہوتی جارہی تھی۔ اوندھے منہ لیٹ کر وہ چلانے لگے، "ہے، درویدی کی لاج کے بچیا، شرناگت کے رکھیئا، مجھے پاپ کے مگر نے پکڑ لیا ہے، مجھے نجات دو!" بھکت بہت اونچی آواز میں چلانے لگا۔ مٹھو کو لگا کہ لوگ اکٹھے ہوجائیں گے۔ وہ ڈر کے مارے اٹھ کر بھاگ گئی۔ سداما بے بسی میں دانت کچکچا کر رہ گیا۔۔

سداما کا خیال تھا، بابو کی بے چین بھکتی صرف ایک ہی رات کی بات ہے۔ پہلے بھی ایک آدھ بھکت رات بھر جپ کرنے کے لئے مندر میں بیٹھ چکے تھے۔ یہ بابو پابندی سے آنے لگے اور ان کی رو در کر پوجا کرنے کے وقت اور آواز میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ سداما اکھاڑے کا ورزشی آدمی تھا۔ اسے نیند بھی زیادہ آتی تھی۔ اس کی آدھی رات تک کی نیند غائب ہوجاتی تھی۔ چوتھے یا پانچویں دن مٹھو آجاتی تھی، وہ بھی ختم ہوگیا لیکن بھکت سے کیا کہے؟ وہ ہی تو اس کے ان داتا تھے۔

سداما مٹھو سے ملا تو اس نے بھی طنز کیا۔۔ "واہ، ہمیں بلا کر یوں ہی ہلکان کیا۔ اس موئے کو روز بیٹھا لیتے ہو۔ پرسوں ہم پھر آئیں تو پھر بیٹھا تھا۔ ہم ڈر کے مارے بھاگ آئیں۔"

"روز ہی آکر بیٹھتا ہے۔ اچھی پریشانی ہوگئی۔ سونے بھی نہیں دیتا۔" سداما نے قبول کیا۔

"داڑھی جار کو ڈانٹ کیوں نہیں دیتے؟ کہہ دو، مت آیا کرو یہاں۔" مٹھو نے راستہ بتایا۔

"یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ بھکتوں کو کہیں ڈانٹا جاتا ہے۔ ایسا کریں تو مندر میں کوئی آئے کیوں۔" سداما نے فکر کا اظہار کیا۔

"تو ہم بتائیں" مٹھو نے صلاح دی۔ "منوا رات کو لوٹنے لگے تو پیچھے جاکر بڑے بڑے پتھر آس پاس پھینکنے لگنا۔ سمجھے گا راستے میں بھوت ہے۔ خود ہی نہیں آئے گا۔"

سداما سن کر چپ رہ گیا۔ سوچتا رہا، پھر بولا۔۔ "اچھا، آج ہی سہی، تو آکر دیکھنا۔

ذرا دیر سے آنا جب وہ مورتی کے سامنے لیٹ کر چلانے لگتا ہے تب۔"

اگلے دن سداما آرتی ختم کرکے کیرتن کے جھانج، کھڑتال اور ڈھولکی سمیٹ رہا تھا کہ گپت بابو آگئے۔ سداما نے سمجھانا چاہا۔۔ "بابو جی، کافی رات تک بھجن کرتے رہتے ہیں۔ سو نہیں پاتے ہیں، اسی وجہ سے تو آپ کا جسم کمزور ہوتا جارہا ہے۔ جلدی آجایا کیجئے۔"

اپنی بھکتی کے اس بکھان سے مطمئن ہوکر گپت بابو نے جواب دیا۔۔۔ "بھیا، بھکتی کسی کو دکھانے کے لئے تو نہیں کرنی۔ اس جسم کی مایا کا کیا ہے؟ بھگوان جتنی جلدی اپنے قدموں میں جگہ دے دیں، ان کی مہربانی ہے۔ گوپی ولبھ سے یہی برارتھنا ہے کہ اسی لمحے ہمیں اپنے اندر سمولیں۔" سداما خاموش رہ گیا۔

مٹھو آئی اور دیکھا کہ بھگت آنکھیں بند کیے ہوئے ایک طرف بیٹھ کر بھجن کر رہے ہیں۔ سداما کہیں نظر نہیں آیا۔ وہ بارہ دری کے ایک کھمبے کی آڑ میں کھڑی ہوکر سداما کا انتظار کرنے لگی۔

بابو بھجن ختم کرکے مورتی کے سامنے ساشٹانگ لیٹ گئے اور پکارنے لگے۔۔ "اے گردھاری، نٹور بنواری، مجھ گناہ گار کو اپنے چرنوں میں پناہ دو!" ان کی بے چین آواز بڑھتی جارہی تھی۔ ویران مندر ان کی درد بھری پکار سے گونجنے لگا۔

مٹھو دھوتی کے کنارے دانتوں میں دبائے حیرت سے خاموش کھڑی تھی۔ بابو اور زور سے بولنے لگا۔۔۔ "ہے. بھکتوں کے گناہوں کو معاف کرنے والے! ادھرموں کا ادھار کرنے والے! مجھے اپنے اندر ولین کرکے اس مکروفریب سے بھری دنیا سے موکش دو۔"

مٹھو کو مندر کے منڈپ میں رکھی چھوٹی مورتی کے پیچھے ایک اور بڑی مورتی دکھائی دی۔ وہ گھبراہٹ میں چیخ کر بھاگنا ہی چاہتی تھی کہ آواز آئی۔۔ "اے میرے پیارے بھگت، میں تیری بھکتی سے خوش ہوں، میں تیری پکار سن کر کدمب بن سے آیا ہوں۔"

بابو بے چینی سے روتے روتے رک گیا۔ زمین پر اوندھے لیٹے لیٹے انہوں نے گرگٹ کی طرح سر اٹھا کر مورتی کے منڈپ کی طرف دیکھا۔۔ مرلی منوہر کی چھوٹی سی

مورتی نے بڑھ کر پورے جوان کی ہیئت اختیار کرلی تھی لیکن وہی سانولی شکل' مور کا تاج' ہاتھ میں بانسری' سینے پر مال اور کمر میں پیتامبر۔"

گپت بابو حیرت زدہ رہ گئے۔ پلک تک نہ جھکا پائے۔

مورتی نے ہمدردی سے مسکرا کر نرمی سے کہا۔۔ "او میرے بھکت' میں بھکتوں کا بھکت ہوں۔ تیری فریاد سن کر تیری خواہش پوری کرنے کے لئے آیا ہوں۔ آپیارے' تو مجھ میں ولین ہوجا۔ میں تیری آتما کو اپنے دھان میں سورگ لے جاؤں گا۔" بھگوان بانہیں پھیلائے گپت بابو کی طرف بڑھ گئے۔

گپت بابو کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ان کا جسم تھر تھر کانپ رہا تھا جوڑے' گھگھی بندھے گلے سے بڑی مشکل سے بولے۔۔ "بھگوان' بھگوان چھما کیجئے! ا۔ ا۔ ابھی نہیں! ا۔ا۔ کرپالو' میرا مکان ابھی پورا نہیں ہوا۔ ا۔ا۔ ابھی ایک بھی لڑکی کی شادی نہیں ہوپائی•••!"

بگھوان کے ماتھے پر غصے کی تیوریاں پڑگئیں۔ بھگوان نے اپنے ہاتھ کی بانسری سے بابو کی طرف اشارہ کرکے سخت لہجے میں ڈانٹا۔۔ "نکل جا یہاں سے! تو میرا بھکت نہیں۔ تو چھلیا ہے۔ یم دوت تجھے خوف ناک جنم میں لیجائیں گے۔" بھگوان بانسری کو بابو کی طرف تانے ہوئے غصے میں کھڑے رہے۔

گپت بابو نے اپنے الٹے پڑے جسم کو جیسے تیسے سنبھالا اور مندر کے دروازے کی طرف دوڑے۔ وہ دہلیز سے ٹھوکر کھاکر گر پڑے۔ یہ دیکھ کر بھگوان مورتی کے منڈپ سے نکل کر آئے اور گرے ہوئے بابو کو سنبھالنے لگے۔

بابو بے ہوش ہوگئے تھے۔

"اری ذرا پانی تو لے آ۔ لوٹے میں ہے۔ "کھمبے کے پیچھے کھڑی متھو نے سداما کی آواز سنی۔ وہ پانی لے کر آئی۔

"موٹے کو زیادہ چوٹ تو نہیں آئی۔" متھو نے گھبراہٹ میں پوچھا۔

سداما نے بابو کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے لیکن وہ ہوش میں نہیں آئے۔

"تو اسے آنچل سے ہوا کر۔ میں ابھی آتا ہوں۔" سداما نے کہا۔

سداما راس لیلا کا سنگار اتار کر آیا۔ بابو کو اب بھی ہوش نہیں آیا تھا۔ سداما

گھبرانے لگا۔۔ "اسے کچھ ہو گیا تو؟"

"کیا جانے؟" مٹھو نے فکر مند ہو کر کہا۔ کچھ دیر بعد وہ چلی گئی۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد بابو کو ہوش آیا۔ ننگے سینے والے صحت مند نوجوان کو اپنے قریب بیٹھے اور اپنی طرف دیکھتے ہوئے پا کر بابو چیخ پڑے۔۔ "یم دوت! یم دوت! ہے بھگوان بچاؤ۔ میں چھلیا نہیں۔" یہ کہہ کر بابو پھر بے ہوش ہو گئے۔

"ڈرو مت بابو۔ بھگوان نہیں تھے۔ ارے ہم تھے، ہم! ہم نے سوانگ رچا تھا۔ ڈرو مت۔ ہم یم دوت نہیں۔ ہم سداما پجاری ہیں۔" بابو بے ہوشی میں سن نہیں پائے سداما اور بھی گھبرا گیا کہ کیا کرے۔ اسے بابو کا گھر بھی معلوم نہیں تھا۔ سامنے آدمی بے ہوش پڑا تھا۔ اسے نیند بھی کیسے آسکتی تھی۔ یہی فکر کھائے جا رہی تھی کہ کہیں معاملہ بگڑ گیا تو؟

بابو کو ایک بار پھر ہوش آیا اور وہ چلانے لگے۔۔۔ "یم دوت! یم دوت! بچاؤ بھگوان! نہیں میں چھلیا نہیں۔۔۔"

سداما نے سمجھانا چاہا لیکن بابو نے سنا نہیں اور بے ہوش ہو گئے۔

کوتوالی میں تین بجے کا گھڑیال بج رہا تھا۔ سامنے سے کچھ آدمی لالٹین اور بیٹری کی ٹارچ لے کر آتے دکھائی دیے۔ بابو کا بڑا لڑکا محلے کے تین چار آدمیوں کو لے کر انہیں ڈھونڈتا ہوا آیا تھا۔ بابو کے گرنے اور بے ہوش ہو جانے پر سب لوگ حیرت زدہ تھے۔

سداما سوانگ رچا کر بابو کو ڈرانے کی بات ان سے کیسے کہتا؟ اتنے میں بابو نے آنکھیں کھول دیں۔ اپنے آپ کو کئی لوگوں سے گھرا دیکھ کر اور بھی زیادہ خوف زدہ ہو کر چلانے لگے۔۔۔ "یم دوت! یم دوت! بچاؤ بھگوان، بچاؤ! میں چھلیا نہیں۔"

سداما نے بتایا کہ بابو روزانہ کافی رات تک بھجن کرتے رہتے تھے۔ وہ تو سو جاتا تھا، آج بھی ویسے ہی سو گیا تھا۔ بابو کے چلانے سے آنکھ کھلی تو دیکھا وہ بھاگے جا رہے ہیں اور دہلیز سے ٹھوکر لگ جانے سے گر پڑے۔ ہم دوڑ کر پہنچے، تب تک بے ہوش ہو چکے تھے۔ ہوش آتا ہے تو بڑبڑانے لگتے ہیں۔

اتنے میں بابو پھر چلانے لگے ۔۔۔۔ "بھگوان! بچاؤ بچاؤ، یم دوت آ گئے! میں چھلیا نہیں۔ میں تمہارا بھگت ہوں۔ میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔"

گجپت بابو کے بیٹے کے ساتھ آئے بنواری نے سب لوگوں کی طرف دیکھ کر فیصلہ کن لہجے میں کہا ۔۔ "کیا کہتے ہو؟ ہم کہتے ہیں کہ بابو کو بھگوان نے درشن دیے ہیں۔ بابو بھگتی بھی تو بہت کرتے تھے۔ ہو سکتا ہے بھگوان نے بابو کا امتحان لیا ہو یا وہ ڈر گئے ہوں۔" اس کے علاوہ اور قیاس بھی کیا ہو سکتا تھا۔ ایک چارپائی لائی گئی اور بابو کو ان کے گھر پہنچایا گیا۔

یہ خبر بجلی کی طرح شہر میں پھیل گئی۔ ہزاروں کی بھیڑ بھگوان کے درشن کرنے والے بھگت کے دیدار کرنے کے لئے آنے لگی۔ ہزاروں کی بھیڑ گموکش کے مندر میں دن بھر جمع رہنے لگی۔ چڑھاوا اتنا آنے لگا کہ منڈپ میں سما نہیں سکتا تھا۔ گجپت بابو کا بھگوان کے درشن کرنے کا معتبر بیان اخباروں میں چھپ گیا۔ بابو بہت ولین ہو کر روزانہ گڑگڑا کر بھگوان کو پکارتے تھے۔ آدھی رات کو مندر میں ہنسی کی آواز گونج اٹھی۔ پجاری سداما بھی جاگ گیا۔ بھگوان نے بھگت کو اسی وقت موکش دینے کی خواہش ظاہر کی، لیکن بھگت کا مایا موہ ختم نہیں ہوا تھا، اس لئے بھگوان اسے چھوڑ کر چلے گئے۔۔۔"

گجپت بابو کا علاج کرنے کے لئے، بلائے گئے ڈاکٹروں کی رائے تھی کہ کسی بڑی نفسیاتی ضرب سے بابو کا دماغی توازن بگڑ گیا۔ انہیں تیز بخار ہو گیا تھا۔ ایسی حالت میں ہی وہ تیسرے دن یم دوتوں کے اپنے چاروں طرف منڈلانے کا تصور کرتے کرتے اور بھگوان کو پکارتے پکارتے بیکنٹھ سدھار گئے۔

گموکش کے مندر میں بھگوان کے پرکٹ ہونے کی خبر دیہات اور دوسرے شہروں میں پہنچ گئی۔ بھگت راجستھان، پنجاب اور سندھ سے آ آ کر سونے کا چھتر چڑھانے لگے۔ مندر کی مرمت اور توسیع ہو گئی۔ چبوترہ چاروں طرف بیس بیس ہاتھ بڑھ گیا۔ چھ مہینے کی مدت میں آس پاس کچھ دکانیں بھی بن گئیں۔ ایک سیٹھ نے ایک گاؤں کی آمدنی مندر کے نام کر دی۔ اس رقم سے سینکڑوں بھکاریوں کو پرساد بانٹا جانے

لگا۔

مندر میں بے انتہا دولت برس رہی تھی لیکن سداما اس بات سے افسردہ تھا۔ وہ مندر کی بارہ دری کے کسی کھمبے سے پیٹھ لگائے بیٹھا اپنے فریب کا انجام دیکھتا رہتا تھا لیکن بول نہیں پاتا تھا۔ کھانا بھی کوئی کھلا دیتا تھا تو کھا لیتا تھا۔ لوگوں کو یقین تھا کہ وہ بھی بھگوان کے درشن کر چکا ہے۔ وہ بھگوان کی لو میں چپ رہتا تھا۔ اسے بھوک پیاس کیا لگے گی؟ بھکت اس کی تعریف میں کہتے تھے ––– "جس نے بھگوان کو مجسم دیکھ لیا، اسے مایا کیا لبھائے گی۔"

سداما کا بڑا بھائی تار گھر میں نوکری کر رہا تھا۔ اس نے یہ حالت دیکھی تو بھگوان کی خدمت کے لئے نوکری چھوڑ کر مندر میں آکر بس گیا۔ اب اس کے لئے پکا مکان بن گیا تھا۔

اب مندر میں پھولوں کی فروخت بہت زیادہ ہوتی تھی۔ مٹھو کے علاوہ اور بھی کئی پانچ سات پھول بیچنے والے صبح ہی آجاتے تھے۔ مٹھو کا دل بھاری بھاری رہتا تھا۔ اس رات کے بعد مندر میں ایسا میلہ لگنے لگا تھا کہ اسے سداما سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا۔ کبھی نظریں مل بھی جاتی تھیں تو مٹھو کو سداما کی آنکھیں بجھی بجھی دکھائی دیتی تھیں، جیسے وہ پہچان ہی نہیں رہا ہو۔ اس کا جسم بھی سوکھتا جارہا تھا۔ مٹھو کا دل کٹ کر رہ جاتا تھا۔ وہ دل ہی دل میں سوچتی ––– اس پر آدمی کی جان کا بوجھ ہے۔ کس لئے میں نے ویسی بات کہی تھی۔

گموکش کے مندر میں بھگوان کے مجسم درشن کے واقعے کے ٹھیک ایک سال بعد سداما بارہ دری کے کھمبے سے پیٹھ لگائے بیٹھے بیٹھے ہی ختم ہوگیا۔

بھکتوں نے کہا ––– "بھکت راج سداما اپنے بھگوان کا بھجن کرتا ہوا بھگوان کے دھام سدھار گیا۔"

بھگوان کے درشن کرنے والے پجاری کی بیکنٹھ یاترا کی تیاری ہوئی۔ گاڑی پھولوں سے لد گئی۔ آگے آگے بینڈ بج رہا تھا۔ گھنٹے، گھڑیالوں اور شنکھوں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ کیرتن کرتی ہوئی ٹولیاں آگے پیچھے چل رہی تھیں۔ مندر سے ندی

تک دو میل کا راستہ بھگت راج سدا ما کی جے!' پکارتی بھیڑ سے بھر گیا تھا۔ اس موت کا کسی کو صدمہ نہیں تھا' کسی کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے۔ بھیڑ جوش سے نعرے لگا رہی تھی۔

صرف مٹھو مندر کے چبوترے کی سیڑھیوں کے نیچے آنچل میں منہ چھپائے سسک سسک کر آنسو بہا رہی تھی۔

تم نے کیوں کہا تھا میں سندر ہوں؟

"اچھا' ہمارا ایک فوٹو بنا دیجئے۔۔" مایا نے جھجکتے ہوئے کہہ ڈالا۔
نگم کو بہت اچھا لگا۔۔۔ "واہ' ضرور۔" اس نے اطمینان دلایا۔
مایا سے اتنی بات کہلوانے میں نگم کو لگ بھگ ڈیڑھ مہینے کا وقت لگا تھا اور کوشش کرنی پڑی تھی۔ اس کوشش کے گذشتہ واقعات زیادہ دلچسپ نہ ہوتے ہوئے بھی اپنی اہمیت رکھتے ہیں۔
نگم اور مایا دونوں ہی دق کی بیماری کی ابتدائی حالت میں تھے' جب احتیاط علاج اور پرہیزی کھانے سے بیماری کا علاج یقینی طور پر ہو سکتا تھا۔
بیماری ہوجانے کے اندیشے کی وجہ دونوں کے لئے الگ الگ تھی۔ مایا کو اس کے شوہر نے اپنے رشتے کے عمر رسیدہ بڑے بھائی کی دیکھ بھال میں رکھا تھا' جو خود دمے کے مریض تھے اور کسی بھی کام کے لائق نہیں تھے۔ علاج کے لئے دونوں ایک ہی جگہ' بھوالی میں تھے۔ ایک ہی بنگلے کا آدھا آدھا حصہ لے کر وہ رہ رہے تھے۔ علاج ایک ہی ڈاکٹر کا تھا اور لگ بھگ ایک ہی طرح کا تھا۔
دق کی بیماری جتنی خطرناک ہے' اس کا علاج اتنا ہی سیدھا اور آسان ہے۔ مکمل آرام' اچھا کھانا اور خوش رہنا۔ ڈاکٹر صاحب اپنے مریضوں سے صاف الفاظ میں کہتے تھے۔۔۔ "ڈاکٹر' جادو سے آپ کا علاج نہیں کر سکتا۔ علاج آپ کے ہاتھ میں ہے۔ ڈاکٹر صرف صلاح دے کر اور دوا بتا کر مدد کر سکتا ہے۔"
اسی صاف گوئی کے سلسلے میں ڈاکٹر صاحب مایا کو ہمدردی میں ڈانٹ بھی دیتے تھے۔ ڈاکٹر ہر ساتویں دن اپنے مریضوں کو تول کر ان کا وزن گھٹنے یا بڑھنے سے ان کی صحت میں سدھار کا اندازہ لگایا کرتے تھے۔ مایا کے وزن میں تولہ بھر بھی اضافہ نہ پا کر اور اپنے نسخے کو ناکام ہوتے دیکھ کر وہ پریشانی میں مایا کے جیٹھ سے پوچھتے تھے۔۔۔ "کیا

بات ہے؟••• یہ کیا کھاتی ہے؟••• کتنا کھاتی ہے؟••• کبھی گھومنے جاتی ہے یا نہیں؟••• کبھی ہنستی بولتی ہے؟••• وغیرہ وغیرہ۔

مایا کے جیٹھ منشی جی دبے اور بڑھاپے کی نقاہت کی وجہ سے رک رک کر سب باتوں کا غیر اطمینان جواب دیتے تھے اور اپنے سمجھانے کا کچھ اثر نہ ہونے کی شکایت کردیتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب اپنی ذمہ داری کے اختیار سے اسے ڈانٹتے تھے۔ "کیا گم سم بنی بیٹھی رہتی ہیں آپ؟ علاج نہیں کرانا تو آگرہ لوٹ جایئے!••• ہماری بدنامی کرانے سے آپ کو کیا فائدہ؟ انہیں دیکھیے!" ڈاکٹر صاحب نگم کی طرف اشارہ کرتے تھے۔ "پندرہ دن میں تین پونڈ وزن بڑھ گیا۔ آپ ڈیڑھ مہینے سے یوں ہی پڑی ہیں۔••• ابھی کچھ نہیں بگڑا ہے، لیکن آپ کا یہی ڈھنگ رہا تو بیماری بڑھ جائے گی••••"

واپس جاتے ہوئے ڈاکٹر صاحب مایا کے جیٹھ، ان کے پڑوسی نگم اور ان کی ماں چاچی، سب سے اپیل کرجاتے۔۔۔ "آپ لوگ انہیں سمجھایئے••• کچھ کھلایئے پلایئے اور ہنسایئے!"

نگم بالعموم صحت مند، محنتی اور قوت ارادی والا شخص ہے۔ وہ مصور ہے۔ پچھلے سال دسمبر میں وہ امریکہ میں ہونے والی ایک نمائش میں بھیجنے کے لئے کچھ تصویریں بنارہا تھا۔ اسے انفلوئنزا ہوگیا تھا۔ بیماری میں آرام نہ کرنے کی وجہ سے اس کا بخار ٹھہر گیا۔ ڈاکٹروں کی صلاح سے وہ آب وہوا بدلنے کے لئے بھوالی چلا گیا۔ اسے فوراً ہی فائدہ محسوس ہوا۔ صحت مند ہونے کے بعد وہ ذرا اور موت پر زندگی کی فتح، کے موضوع پر ایک تصویر بنانا چاہتا تھا۔ اسی کیفیت کو وہ اپنے چاروں طرف محسوس کرنا چاہتا تھا، لیکن صحت اور زندگی کے بارے میں مایا کے پست حوصلے سے اس کے دل میں درد سا محسوس ہوتا تھا۔

مایا کے خاموش اور گم سم رہنے کے باوجود نگم کو چاچی، سے یہ معلوم ہوگیا تھا کہ مایا آگرہ کے ایک خوشحال کائستھ وکیل کی تیسری بیوی ہے۔ چوبیس پچیس برس کی عمر میں گود سونی ہونے پر بھی وہ قانوناً وکیل صاحب کے پانچ بچوں کی ماں ہے۔ مایا کی شادی ہونے سے پہلے، وکیل صاحب کی پہلی بیوی، دو لڑکیاں اور ایک لڑکا چھوڑ کر اور

دوسری بیوی دو لڑکیاں چھوڑ کر ایک کے بعد ایک دق کا مرض ہونے کے سبب چل بسی تھیں۔ جب وکیل صاحب کے عمر تقریباً چھیالیس برس تھی تو انہوں نے گرہستی سنبھالنے اور اپنا اکیلاپن دور کرنے کے لئے مایا کو بیوی کے طور پر قبول کرلیا تھا۔ مایا کی عمر بیس برس ہونے پر بھی اس کے باپ کو لڑکی کے لئے کوئی اچھا لڑکا نہیں ملا تھا۔ شاید وہ وکیل صاحب کی دوسری بیوی کے انتقال کا ہی انتظار کر رہے تھے۔

مایا اپنی اس زندگی کو اپنا مقدر سمجھ بیٹھی ہے' یہ اندازہ کرلینا نم کے لئے مشکل نہیں تھا۔ اس کا دل ہمدردی سے مایا کی طرف جھک گیا۔ ایک بھرپور جوانی کی اس طرح بربادی اسے بے انصافی محسوس ہو رہی تھی۔

مایا کے لئے بھرپور جوانی' کی اصطلاح کا استعمال صرف ہمدردی سے ہی کیا جاسکتا تھا۔ عمر چوبیس پچیس ہی تھی۔ جسم بھی چھریرا اور ساخت سڈول تھی۔ سلونے چہرے پر نمک بھی تھا لیکن آنسوؤں کی نمی سے سیل کر بہا جارہا تھا۔ آنکھوں کے نیچے اور گالوں میں گڈھے پڑے ہوئے تھے' جیسے کسی اچھی خاصی تصویر پر میلا پانی پڑ جانے سے رنگ بگڑ جائے اور صرف خارجی ساخت بچی رہے۔

نم نے جس نیک نیتی اور صاف دل سے مایا کی طرف دوستی اور یگانگت کا قدم بڑھایا تھا' اس سے بے اعتنائی اور اس کی مخالفت دونوں ہی ناممکن تھی۔ ہاتھ میں تاش کی گڈی پھر پھراتے ہوئے وہ چاچی سے گھر اور چوکے کا کام چھڑوا کر انہیں زبردستی برآمدے میں بلا لیتا تھا اور پھر مایا کے جیٹھ کو للکارتا تھا' آیئے منشی جی' دو دو ہاتھ ہوجائیں۔' اس کے ساتھ ہی مایا کو بھی کھیل میں شامل ہونے کی ترغیب دیتا تھا۔ برادری کے ناتے وہ مایا کو بے دھڑک ہوکر 'نگینہ بھابی' کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔

اس محفل میں ترپ کا ہی کھیل چلتا تھا۔ نم بڑے زور سے وہ مارا پایڑ والے کو!' چلا کر غلط پتہ چل دیتا اور پھر اپنی بھول پر حیرت زدہ ہوکر سر کھجاتے ہوئے' ارے!' کہہ کر سب کو ہنسا دیتا تھا۔

مایا کے سفید خشک ہونٹ مسکرائے بغیر نہیں رہ پاتے تھے۔

نم للکارتا۔۔۔۔ "آپ ہنستی ہیں؟ اچھا اب کی کیجئے!"

پانچ سات منٹ میں پھر کوئی زبردست داؤ دکھائی دے جاتا تو کہتا تھا۔۔۔ "یہ دیکھئے

کھرا کھیل فرخ آبادی" اور پھر ویسی ہی بھول ہو جاتی تھی۔

تاش کے کھیل کے علاوہ نگم کی آپ بیتی، مزاحیہ کہانیوں کا بے شمار ذخیرہ بھی مایا کو حیرت سے سننے کے لئے مجبور کر دیتا تھا۔ مایا کی افسردگی کچھ دیر کے لئے دور ہو جاتی تھی۔ کبھی کبھی وہ مایا کو کوئی کہانی کی کتاب، رسالہ یا منتخب تصویروں کا البم ہی دل بہلانے کے لئے دے دیتا تھا۔ نگم نے ان تصویروں کو اپنے پیشے میں استعمال کے لئے چنا تھا۔ ان میں متعدد ملکی اور غیر ملکی نیم برہنہ یا برہنہ تصویریں بھی تھیں۔ ان کا استعمال نگم اپنی تصویروں میں جسمانی عضو کا صحیح توازن بنانے کے لئے کرتا تھا۔ مایا کو البم دیتے وقت تہذیب کے خیال سے ایسی تصویریں نکال لیتا تھا۔

نگم کی خوش مزاجی کے اثر سے مایا کی خاموشی میں کچھ کمی آگئی تھی لیکن اس طرح جیسے بڑی مدت سے استعمال میں نہ آنے والے تالاب پر جمی موٹی کائی کبھی کبھی ہوا کے جھونکنے سے پھٹ تو جاتی ہے لیکن فوراً ہی پھر مل جاتی ہے۔ مایا کتابوں یا رسالوں کو کتنا پڑھتی اور سمجھتی ہے، اس موضوع پر کبھی کوئی بات نہیں ہوتی تھی۔ ہاں، جب نگم بنگلے کے آنگن سے دکھائی دینے والے نظاروں کے فوٹو، جو مایا کے سامنے کھینچے ہوئے ہوتے تھے، اسے دکھاتا تھا تو تعریفی مسکراہٹ مایا کے ہونٹوں پر ضرور آجاتی تھی۔ اور وہ دو چار الفاظ میں فوٹو کی تعریف بھی کر دیتی تھی۔

مایا کی حوصلہ افزائی کے لئے نگم کہہ دیتا تھا۔۔ "آپ بھی سیکھ لیجئے نا، فوٹو کھینچنا••• بڑا آسان ہے۔ کچھ کرنا تھوڑے ہی ہوتا ہے۔ بس اچھے نظارے کے سامنے کیمرہ کھول دینا اور بند کر دینا، تصویر تو اپنے آپ بن جاتی ہے۔"

کیا کروں گی؟••• مجھے کیا کرنا ہے۔" مایا ٹال جاتی تھی۔ نگم اسے زندگی سے مایوس نہ ہونے کی صلاح دینے لگتا تھا۔ اس بات سے جان چھڑانے کے لئے کوئی دوسری بات کرنے لگتی، "یہ میرا نوکر بازار جاتا ہے تو وہیں سو جاتا ہے۔ دیکھوں، شاید آگیا ہو۔"

ایسے ہی ایک دن نگم مایا کو نئے کھینچے ہوئے فوٹو دکھا رہا تھا اور سمجھا رہا تھا۔۔۔۔

"آدمی کچھ کرتا رہتا ہے تو اسے مایوسی نہیں گھیرتی۔"

مایا کہہ اٹھی۔۔۔ "اچھا، ہمارا ایک فوٹو بنا دیجئے۔"

"ضرور!" نگم نے تپاک سے جواب دیا، "جب کہئے!"

"ارے جب ہو سکے، چاہے ابھی بنا دیجئے۔"

اتفاق کی بات، اس وقت نگم کے پاس فلم ختم ہو چکی تھی۔ فلم ختم ہونے کی بات بتا کر اس نے یقین دلایا کہ کسی دن وہ خود یا اس کا نوکر کرم سنگھ نینی تال جائے گا تو فلم آجائے گی۔ وہ سب سے پہلے مایا کا فوٹو کھینچے گا۔

مایا کا فوٹو کھینچنے کی بات ہونے کے چوتھے یا پانچویں دن کرم سنگھ کچھ سامان لینے نینی تال گیا تھا۔ لگ بھگ سورج ڈوبنے کے وقت لوٹ کر کرم سنگھ نے سامان اور بچے ہوئے پیسے نگم کو واپس کیے۔

مایا نے آکر پوچھا — "بھائی صاحب، فلم منگوالی ہے؟"

"ہاں ہاں، کیوں نہیں!" فلم کے بارے میں بھول جانے کی بات نگم قبول نہیں کر سکا، "کیوں کیا فوٹو ابھی کھینچوائیے گا؟" اس نے جوش کا اظہار کیا۔

"ابھی بنا دیجئے۔" مایا کو بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔

"منشی جی کو بلالیں؟" نگم نے سوچ کر کہا۔

"وہ تو بازار گئے ہیں، دیر میں لوٹیں گے!"

"آپ بھی تو کپڑے بدلیں گی، تب تک روشنی کم ہو جائے گی۔" نگم نے دوسرا بہانہ سوچا۔

"کپڑوں سے کیا ہے؟" بے اعتنائی سے مایا نے جواب دیا، "کپڑے بدل کر کیا کرنا ہے؟ ٹھیک تو ہیں۔"

کوئی اور بہانہ سوچتے ہوئے نگم کمرے میں فلم لگا کر لانے کے لئے اندر چلا گیا۔ فوٹو کے سامان کی الماری کے سامنے کھڑا ہوا وہ سوچ رہا تھا، مایا کا دل رکھنے کے لئے بولے ہوئے جھوٹ کو کیسے نبھائے! اس کی انگلیاں ان فوٹوؤں کو پلٹ رہی تھیں، جنہیں اس نے مایا کو البم دینے سے پہلے نکال لیا تھا۔ دل میں ایک خیال آنے پر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ کیمرے میں فلم کی جگہ سما سکنے کے لائق ایک فوٹو اس نے چن لیا۔

دو منٹ بعد نگم کیمرے کو تیاری کی حالت میں لے کر باہر آیا — لیجئے، کیمرہ تو

تیار ہے۔" اس نے مایا کو مخاطب کیا۔

"اچھا۔" مایا بھی تیار تھی۔

"ساڑی نہیں بدلی آپ نے؟" نگم نے پوچھا۔

"ٹھیک ہے۔ کیا ضرورت ہے؟"

"آپ کہتی ہیں نہ' ساڑی کی تصویر تھوڑے ہی بنوانی ہے۔" نگم مسکرایا۔

"ہاں' ساڑی سے کیا ہوگا؟ جیسی ہوں' ویسی ہی رہوں گی۔"

"آپ کے بیٹھنے کے لئے کرسی لاؤں؟"

"نہ' ایسے ہی ٹھیک ہے۔"

"جیسے میں کہوں' بیٹھ جائیے۔"

"اچھا۔"

"برآمدے میں سامنے سے روشنی آرہی ہے۔ یہاں فرش پر بیٹھ جائیے۔ دائیں بازو سے ٹیک لگا لیجئے۔۔۔ بائیں بازو کو سامنے ایسے رہنے دیجئے۔۔۔ گردن ذرا اونچی کیجئے۔۔۔ ہاں' سر ادھر کر لیجئے' جیسے اس پیڑ کی چوٹی پر دیکھ رہی ہوں۔۔۔ ہاں۔"

مایا نگم کی ہدایت کے مطابق بیٹھ گئی۔

نگم نے آگاہ کیا۔ "اب آدھا منٹ بالکل ہلئے گا نہیں۔" وہ خود دو گز دور فرش پر اکڑوں بیٹ کر کیمرے کو مایا کی طرف سادھ رہا تھا۔ کیمرے کا شٹر کھلنے اور بند ہونے کی 'ٹک' کی آواز آئی۔

"تھینک یو' بس ہوگیا۔" نگم نے ہنس کر کہا۔

"جانے کیسی بنے گی؟ مایا فرش سے اٹھتی ہوئی بولی۔

"ابھی معلوم ہو جائے گا۔" نگم نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

"ابھی کیسے؟" مایا نے حیرت کا اظہار کیا' "ایک دو دن تو لگتے ہیں بنانے میں۔"

"ہاں' ایسے کیمرے اور فلم بھی ہوتے ہیں۔" نگم نے قبول کیا اور بتایا' "یہ دوسری طرح کا کیمرہ ہے۔"

"یہ کیسا ہے؟" مایا کا تحیر بڑھا۔

"اس کیمرے سے فوٹو پانچ منٹ میں اپنے آپ ہی تیار ہو جاتی ہے۔" نگم نے

سمجھایا اور اپنی کلائی پر بندھی گھڑی کی طرف دیکھ کر بولا' "ابھی دو منٹ ہی ہوئے ہیں۔"

باقی تین منٹ مایا بے چینی سے انتظار کرتی رہی۔ دو منٹ اور گذر جانے پر نگم نے ٹھٹک کر کہا... "آدھا منٹ اور ٹھہر جانا اچھا ہے۔ جلدی کرنے سے کبھی کبھی فوٹو کو ہوا لگ جاتی ہے۔" مایا بے چینی سے بغیر پلک جھپکے کیمرے کی طرف دیکھتی رہی۔

نگم کیمرے کو ایسی بیباکی سے مایا کی آنکھوں کے سامنے کھولنے لگا کہ شک کی کوئی گنجائش نہ رہے۔ جیسے جادو گر تماشائیوں کے سامنے رومال کو جھاڑ کر دکھا دینے کے بعد اسے لپیٹ کر اس میں سے حیرت انگیز چیز نکالتے وقت آہستہ آہستہ دکھا دکھا کر نہ کھولتا ہے۔ کیمرے کا پچھلا حصہ کھلا۔ فوٹو کے پیچھے کی سفیدی دکھائی دی۔ نگم نے فوٹو کو خود دیکھے بغیر مایا کی طرف بڑھا دیا۔

مایا کا ہاتھ اضطراب سے فوٹو کی طرف بڑھ گیا' لیکن فوٹو آنکھوں کے سامنے آتے ہی اس کے ہاتھ سے گر گیا' آنکھیں جھک گئیں اور جسم میں جو بھی تھوڑا بہت خون تھا' پیلے چہرے پر کھینچ آیا۔

"کیوں؟" معصومانہ انداز میں نگم نے حیرت کا اظہار کیا۔

"یہ ہمارا فوٹو ہے؟" مایا آنکھیں نہیں اٹھا پائی لیکن ہونٹوں پر آئی مسکراہٹ بھی چھپ نہ سکی۔

نگم نے زور دے کر کہا۔۔۔ "آپ کے سامنے ہی تو فوٹو لے کر کیمرہ کھولا ہے۔"

"اس میں ہمارے کپڑے کہاں ہیں؟" ذرا آنکھ اٹھا کر مایا نے ہمت کی۔ فوٹو میں مایا کی طرح چھریرے جسم والی لیکن بہت خوبصورت متوازن جسم والی برہنہ دوشیزہ' دائیں بانہہ کا سہارا لیے ایک چٹان پر بیٹھی' کہیں دور دیکھ رہی تھی۔

آپ نے ہی تو کہا تھا۔" نگم نے صفائی پیش کی' "کہ کپڑوں کا فوٹو تھوڑے ہی کھنچوانا ہے۔"

"ایسا کہیں ہوتا ہے؟" مایا نے جھینپ کر بے یقینی ظاہر کی اور اس کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا۔

"اوہو!" نگم نے پریشانی ظاہر کی، "آپ نے کیا ایکسرے نہیں دیکھا کبھی! ایسا بھی کیمرہ ہوتا ہے جس میں جسم کے اندر کی ہڈی اور نسیں آجاتی ہیں۔" اپنا کیمرہ دکھاتے ہوئے بولتا رہا، "اس کیمرے سے کپڑوں کے اندر سے جسم کی فوٹو آجاتی ہے۔ آپ اگر پورے کپڑوں سمیت چاہتی تو میں دوسرے کیمرے سے ویسا ہی فوٹو کھینچ دوں گا۔"

مایا نے ایک بار پھر فوٹو کو دیکھنے کی کوشش کی لیکن دیکھ نہیں سکی۔ اس کا چہرہ سنجیدہ ہوگیا۔ وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

نگم بھی کیمرہ اور فوٹو سنبھال کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ فکر مند ہوکر سر جھکائے ہوئے پچھتانے لگا، یہ کیا کر بیٹھا؟ مایا ہنسنے کے بجائے چڑ گئی۔۔۔ ناراض ہوگئی۔ کہیں چاچی سے شکایت نہ کردے۔۔۔ شکایت کرسکتی ہے یا نہیں؟ رات میں نیند آجانے تک یہی خیال نگم کو بے چین کرتا رہا اور اس پریشانی کی وجہ سے نیند بھی ذرا دیر سے آئی۔

اگلے دن نگم کی پشیمانی اور فکر میں اضافہ ہوگیا۔ مایا کی ناراضگی اب صاف ظاہر تھی۔ صبح سورج نکلتے وقت مایا کچھ دیر کے لئے دھوپ میں آتی تھی اور نگم سے سلام دعا اور خیر وعافیت ہوجاتی تھی۔ اس دن مایا دکھائی نہیں دی۔ نگم کیا کرتا؟ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ وہ صرف اپنے آپ کو ہی سمجھا سکتا تھا کہ اس کی نیت خراب نہیں تھی۔ اس نے صرف مذاق کیا تھا۔ لیکن ہنسی دور تک چلی گئی۔

پشیمانی کی وجہ سے نگم خود بھی خاموش رہا۔ اس کی خاموشی چاچی سے چھپی نہ رہ سکی۔ انہوں نے پوچھا۔۔۔ "جی تو اچھا ہے!"

نگم نے ایک کتاب میں مگن ہوجانے کا بہانہ بناکر چاچی کو ٹال دیا لیکن افسردگی دور نہیں کرسکا۔ وہ کتاب پڑھنے کا بہانہ کرکے دس بجے تک اپنے کمرے میں لیٹا رہا۔

کمرے کے باہر سے آواز آئی۔۔۔ "سنئے!"

آواز پہچان کر نگم تڑپ اٹھا۔۔۔ "آیئے!"

مایا دروازے پر آگئی۔ کلف کی ہوئی باریک دھوتی میں سے پیٹھ پر پھیلے گیلے بال جھلک رہے تھے۔ شرم سے آنکھوں کی مسکراہٹ چھپاتے ہوئے بولی۔۔۔ "بھائی صاحب، ہمارا فوٹو دے دیجئے۔"

نگم کے دل سے پشیمانی اور بے چینی اس طرح اڑ گئی جیسے پھونک مارنے سے آئینے پر پڑی دھول صاف ہو جاتی ہے۔

"کل والا؟" جیسے یاد کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"ہاں۔" مایا نے ہامی بھری۔

"وہ تو ہم نے اپنے پاس رکھنے کے لئے بنایا ہے۔" نگم نے سنجیدگی سے کہا۔

"واہ' تصویر تو ہماری ہے!" مایا نے حق جتاتے ہوئے کہا۔

"آپ کی ہے؟ کل تو آپ کہہ رہی تھیں کہ تصویر آپ کی نہیں ہے۔"

"دے دیجئے! آپ نے ہی تو کھینچی ہے۔" مایا نے اصرار کیا۔ اس کی آنکھوں میں چمک تھی اور آواز میں شوخی۔

"اچھا لے لیجئے!" نگم نے ہار مان لی اور تصویر میز پر سے اٹھا کر مایا کی طرف بڑھا دی۔ مایا نے دو تین سیکنڈ تک تصویر کو ترچھی نگاہوں سے دیکھا اور پھر شرما کر مخالفت کی۔۔ "ہماری نہیں ہے تصویر!"

"ابھی آپ مان رہی تھیں۔" نگم نے الجھن ظاہر کی' "کیوں؟"

"یہ تو بہت اچھی ہے۔ ہم ایسی کہاں ہیں؟" مایا کی آنکھیں جھک گئیں اور چہرے پر سرخی بڑھ گئی۔

اسی وقت غسل کر کے آئی مایا کے صاف بالوں سے خوشبو دار صابن کی مہک آ رہی تھی۔ اپنے خون میں جھنجھناہٹ محسوس کرتے ہوئے بھی نگم نے کہہ دیا۔۔ "ہیں تو!... نہیں تو تصویر کیسے سندر ہوتی؟"

"سچ کہتے ہیں؟" مایا نے نگم کی آنکھوں میں سچائی کا اندازہ لگانے کے لئے دیکھا۔

"ہاں' بالکل سچ۔" نگم کو مایا کی شرم و حیا اور خوشی سے عجیب سی لذت مل رہی تھی۔

مایا پھر فوٹو کی طرف دیکھتی رہی۔۔ "اسے پھاڑ دیجئے!" آنکھیں نچاتے ہوئے اس نے کہا۔

"میں اسے سنبھال کر رکھوں گا" نگم نے جواب دیا' "لکھنؤ جانے کے بعد یاد

آنے پر اسے دیکھوں گا۔"

مایا نے نگم کی آنکھوں میں دیکھنا چاہا لیکن دیکھ نہ سکی۔ اس نے فوٹو لے لیا۔۔
"آپ کو پھر دے دوں گی۔" فوٹو کو ہاتھ میں لے کر اور دھوتی میں چھپائے وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

مایا کے چلے جانے پر نگم پھر لیٹ گیا اور سوچنے لگا۔۔۔ کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔۔ زندگی کا بالکل دوسرا ہی نظارہ اس کی آنکھوں کے سامنے آگیا۔

اب تک نگم اور مایا کے درمیان جو بات ہوتی تھی وہ سب کے سامنے اور خوب اونچی آواز میں ہوتی تھی، لیکن اب اکیلے میں کرنے کے لائق بات بھی ہوگئی۔ غیر معمولی اور خاص بات میں ہی تو مزہ ہوتا ہے۔ جسے حاصل کرنے میں مشکل ہو، وہی حاصل کرنے کی خواہش ہوتی ہے۔ اکیلے میں یا دوسروں کے کان کی پہنچ سے دور ہونے پر نگم کہہ دیتا تھا۔۔ "وہ تصویر آپ نے لوٹائی نہیں؟"

"ہماری تصویر ہے، ہم کیوں دیں؟ لیکن اچھی تھوڑے ہی ہے!" مایا ہونٹ دبا کر کہتی تھی۔

"ہمیں تو اچھی لگتی ہے!"

"آپ تو یوں ہی کہتے ہیں!"

"اچھا، کسی اور کو دکھا کر پوچھ لو۔"

"دھت!"

"کیوں؟"

"شرم نہیں آتی، ایسی تصویر؟ بڑے ویسے ہیں۔" مایا پیار سے غصہ دکھاتی۔

نگم کی نس نس میں بجلی دوڑ جاتی تھی۔ اسے مایا کے رویے میں تبدیلی دکھائی دے رہی تھی۔ اب مایا کی آنکھیں دوسری آنکھوں سے بچ کر نگم کو ڈھونڈتی تھیں۔ موقع کی تلاش کے لئے اس میں ایک چستی سی آگئی تھی۔ یہ تبدیلی صرف نگم کو ہی نہیں، چاچی اور منشی جی کو بھی دکھائی دے رہی تھی اور اس تبدیلی کا ناقابل تردید ثبوت تھا ڈاکٹر صاحب کا مریضوں کو تولنے والا ترازو۔ ترازو نے پہلے ہفتے مایا کے وزن میں آدھا پونڈ کا اضافہ دکھایا اور دوسرے ہفتے میں ایک پونڈ۔ اب مایا چاچی کے ساتھ،

نگم کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی کچھ دور گھومنے جانے لگی۔ گھومتے وقت، تاش کھیلتے ہوئے یا برآمدے میں چہل قدمی کے دوران نگم سے بات کرنے اور نظریں ملانے کے مواقع کی تلاش میں مایا کے دماغ اور جسم میں ہمیشہ تجسس اور مستعدی رہتی تھی۔

جولائی کا تیسرا ہفتہ تھا۔ بھوالی میں موسلا دھار بارش ہوتی رہتی تھی۔ گھروں میں بھی بادل، کہرے اور دھند کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ سیلن اور سردی سے چاچی، جوڑوں میں درد کی شکایت کرنے لگی تھیں۔ منشی جی کو بھی دمے کے دورے زیادہ پڑنے لگے تھے۔ بہت سے مریض برسات سے گھبرا کر گھر چلے گئے تھے۔ مایا اور نگم صحت میں بحالی محسوس کر رہے تھے۔ نگم اور مایا کے بنگلے سے تقریباً سو گز اوپر واقع بڑا پیلا بنگلہ اور بائیں طرف کے بنگلے خالی ہو گئے تھے۔

ڈاکٹر کی رائے تھی کہ نگم ابھی لکھنؤ کی گرمی میں نہ جائے تو اچھا ہے اور مایا کا تو ابھی رہنا ضروری تھا۔ اس کی حالت تو اب بہتر ہونا شروع ہوئی تھی۔

آسمان میں گھٹا ٹوپ بادل موجود رہنے کے باوجود مایا کی آنکھوں میں اور چہرے پر امنگ کے سبب صحت کی کرنیں پھیلی رہتی تھیں۔ مایا کی آنکھوں کی جرات بڑھتی جا رہی تھی۔ جب بھی نگم سے آنکھیں چار، ہو جاتی تھیں، وہ بھی ان کی پر سکون حرارت محسوس کیے بغیر نہیں رہتا تھا۔ جسم میں ایک امنگ اور طاقت کا خوشگوار احساس ہوتا تھا۔ اپنے وجود اور طاقت کے لئے مایا کی دعوت پا کر اسے قبول کرنے اور مایا کو حاصل کر لینے کی پر زور خواہش ہوئی تھی۔

نگم کو مایا سے شاید بیماری کی چھوت لگ جانے کا اندیشہ تھا۔ اپنے آپ کو اس طرح روکے رہنے میں بھی اطمینان تھا۔ جیسے تیز دوڑنے کے لئے اتاولے گھوڑے کی لگام کھینچ کر روکے رہنے میں طاقت، راحت اور فخر کا احساس ہوتا ہے۔ نگم اور مایا دونوں زندگی کی طاقت اور امنگ کے احساس سے خوش رہنے لگے تھے۔

بارش کیوجہ سے گھومنے کے مواقع کم ہو گئے تھے۔ نگم جسم کو کچھ چست رکھنے کے لئے چھتری لے کر بازار تک چلا جاتا تھا۔ مایا اس کی آنکھوں میں مسکرا کر شکایت کرتی تھی۔ "آپ تو اکیلے ہی گھوم آتے ہیں۔ ہمارا گھومنا ہی بند ہو گیا ہے۔ چاچی کہیں جا نہیں پاتی ہیں۔"

دن بھر بارش ہوتی رہی۔ مایا چاہتی تھی کہ تاش کھیلنے کی بیٹھک جمے لیکن منشی جی کے دمے کی دوروں اور چاچی' کے درد کی وجہ سے جم نہیں پائی۔ مایا نے کئی بار برآمدے کے چکر لگائے۔ رہا نہیں گیا تو نگم کے کمرے کے دروازے پر جاکر آواز دی۔۔ "سنئیے!"

نگم نے استقبالیہ انداز میں مسکرا کر کہا۔۔۔ "آیئے۔"

جھنجلاہٹ کے انداز میں مایا نے شکایت کی۔۔۔ "کیا کریں بھائی صاحب! کوئی کتاب ہی دے دیجئے۔ بیٹھے بیٹھے دن نہیں کٹتا ہے۔"

نگم نے پوچھا۔۔۔ "کیسی کتاب چاہئے؟ تصویروں والی!"

"دھت' بڑے ویسے ہیں آپ!" نگم نے رسالہ اٹھا کر دے دیا۔ اٹھتی ہوئی انگڑائی کو دبا کر نگم کی آنکھوں میں دیکھ کر مسکراتی ہوئی مایا رسالہ لے کر واپس چلی گئی۔

مایا کچھ دیر بعد رسالہ واپس کرنے آئی۔

"پڑھنے میں دل نہیں لگ رہا' بھائی صاحب!" مسکرا کر اس نے نگم کی آنکھوں میں دیکھا اور پھر انھیں جھکائے اور بہت دبی ہوئی آواز میں بولی' "کہیں گھومنے نہیں چلتے؟"

چلو' کہاں چلیں؟" نگم نے ویسے ہی انداز میں جواب دیا۔

"کہیں چلیں' اوپر کا پیلا بنگلہ تو اب خالی ہے۔" مایا کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی' "آپ نیچے سڑک سے گھوم کر چلے آیئے۔"

نگم کے جسم کا خون بجلی کا تار چھو جانے کی مانند کھول اٹھا۔ خواہش ہوئی کہ قریب کھڑی ہوئی مایا کو باہوں میں لے لے لیکن جگہ اور وضع داری کا بھی خیال آگیا۔ وہ ٹھٹک گیا۔ بولا۔۔۔ "اچھا؟" اس کا جسم ایک نئی حرارت کا احساس کر رہا تھا۔

بادل گھرے ہوئے تھے۔ نگم نے چھتری ہاتھ میں لے لی اور باورچی خانے میں بیٹھی چاچی کو آواز دے کر کہا۔۔ "ذرا بازار تک گھوم آؤں۔"

نگم اپنے بنگلے سے اتر کر سڑک پر آگیا اور گھوم کر اوپر واقع پیلے بنگلے کی طرف چڑھ گیا۔ بنگلے کے احاطے میں برسات میں پھیلنے والی للی کے پھول خوب کھلے ہوئے

تھے اس سے کچھ دن پہلے بنگلے میں کرایے داروں کی رہائش کے دوران نگم' چاچی اور مایا شام کو کچھ دور گھومنے جاکر لوٹتے وقت اسی طرف سے ہو کر جا چکے تھے۔ پڑوسیوں کی مزاج پرسی کر کے نگم یہاں سے پھول بھی لے جاتا تھا۔

بنگلہ سنسان پڑا تھا۔ بنگلے کے پچھواڑے' ذرا نیچے مالی اور نوکروں کے لئے بنی چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ مالی شام کے لئے کھانا پکار رہا ہو گا۔ چڑھائی چڑھتے وقت دم پھولنے کی وجہ سے سانس لینے کے لئے کھڑے ہو کر نگم نے پیچھے کی طرف دیکھا کہ مایا آنے والی ہوگی۔ مایا کی جرات مندانہ دعوت سے اس کا رواں رواں مسرت محسوس کر رہا تھا۔

پگڈنڈی پر کچھ دکھائی نہیں دیا۔ بھیگی گھاس پر بادل کا ایک ٹکڑا مچل کر بیٹھ گیا تھا اور نیچے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ برآمدے میں کچھ آہٹ سی محسوس کرنے پر نگم نے دیکھا' مایا سامنے والے بڑے کمرے کے دروازے میں پہلے ہی سے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ مایا نے ہاتھ اٹھا کر اسے آنے کا اشارہ کیا۔ وہ آگے بڑھ کر کمرے میں چلا گیا۔

تنہائی میں مایا کے اتنے قریب ہونے سے اس کے خون کی روانی تیز ہو گئی اور چہرے پر چنچناہٹ محسوس ہونے لگی۔ چڑھائی پر تیزی سے آنے کی وجہ سے مایا کا سینہ بھی ابھی تک لمبی سانسیں لینے سے اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ایسی سرخی اور سلونا پن تھا کہ نگم دیکھتا رہ گیا۔

آسمان میں گھنے بادل اور دھند ہونے کی وجہ سے دروازوں اور کھڑکیوں کے شیشوں سے صرف اتنی روشنی آ رہی تھی کہ جسم کی ساخت ہی دکھائی دے سکتی تھی۔

کرایے داروں کے چلے جانے کے بعد سفید نواڑ سے بنی خالی چارپائی اندھیرے میں اجلی دکھائی دے رہی تھی۔ اور وارنش کی ہوئی کرسیاں پرچھائیں کی مانند لگ رہی تھیں۔

مایا نے دروازہ بند کر دیا۔ نگم نے ایک گھبراہٹ سی محسوس کی' جیسے جوش میں کسی خندق کو معمولی سمجھ کر کود جانے کے لئے تیار ہو جائے لیکن قریب آ کر خندق کی چوڑائی سے دل دہل جائے! مایا اس کے بالکل قریب آ گئی تھی۔

مایا نے ہانپتے ہوئے پوچھا-- "ہمارا فوٹو اچھا تھا؟ سچ کہئے؟" اور وہ چڑھائی کی تھکان سے کھڑی نہ رہ پانے کی وجہ سے دھم سے چارپائی پر بیٹھ گئی- اندھیرے میں بھی نگم کو اس کی آنکھوں میں چمک اور چہرے کی دعوت بھری مسکراہٹ بغیر دیکھے ہی دکھائی دے رہی تھی-

نگم کا دل دھک دھک کر رہا تھا- گلے میں اٹھ آئے ہیجان کو نگل کر اور سمجھانے کے لئے اس نے جواب دیا-- "ہے تو..."

"جھوٹ! اب دیکھیے!" پاؤں چارپائی پر سمیٹتے ہوئے اور چارپائی کے بیچ سرک کر مایا نے ہانپتے ہوئے روندھی ہوئی آواز میں اصرار کیا اس کی ساڑی کا ایک کونا کندھے سے چارپائی پر گر گیا تھا- اپنے ہاتھ میں لیا وہ فوٹو' چارپائی پر نگم کے سامنے ڈالتے ہوئے اس نے اصرار کیا-- "ایسا کہاں ہے؟ کب دیکھا آپ نے؟"

نگم کے سر میں خون کے ہتھوڑے کی چوٹیں سی محسوس ہو رہی تھیں- اس کے جسم کے سب اعصاب تن گئے-- کیا ہو رہا ہے؟ شرم!... بیمار لڑکی!

"یہاں آؤ!" بے چینی سے مچل کر مایا نے نگم کو پکارا-

مایا اپنا بلاؤز کھولنے کے لئے اسے کھینچ رہی تھی- کاجوں میں پھنسے بٹن کھینچے جا رہے تھے اور اس کے پستان چونچ اٹھائے تیتروں کی طرح بلاؤز کو پھاڑ دینا چاہتے تھے-

بہت زور سے دیئے گئے دھکے سے سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے نگم نے سخت آواز میں جواب دیا-- "پاگل ہو!... ہوش میں آؤ-"

مایا کا چہرہ تمتما اٹھا- وہ حیرت سے بے حرکت ہو گئی- پگھلی ہوئی آنکھیں پتھرا گئیں اور گردن غصے میں تن گئی- سانس اور بھی گہری اور تیز ہو گئی- لمحہ بھر حیران رہ کر غصے سے نگم کو گھور کر سخت آواز میں پھنکار اٹھی-- "تو تم نے کیوں کہا تھا میں سندر ہوں؟..."

وہ آنچل کو سنبھالے بغیر تیزی سے فرش پر کھڑی ہو گئی- دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں باندھے' آنسوؤں سے ڈبڈبائی آنکھوں میں چنگاریاں بھر کر اس نے ہونٹ چبا کر دھمکایا-- "جاؤ! جاؤ! ہٹ جاؤ!"

نگم کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ ایک کپکپی سی آگئی۔ وہ ہکا بکا رہ گیا۔

مایا پھر چارپائی پر گر پڑی۔ وہ اپنا سر بانہوں میں چھپا کر اوندھے منہ لیٹ گئی۔ اس کی پیٹھ رونے کی وجہ سے بہت زور سے ہل رہی تھی۔

نگم ایک لمحے تک کھڑا اس کی طرف دیکھتا رہا اور پھر دروازہ کھول کر تیز قدموں سے باہر چلا گیا۔

نگم اگلے دن چاچی کے جوڑوں کے درد کی فکر میں لکھنؤ واپس چلا گیا۔

مایا کا بخار پھر بڑھنے لگا۔ ڈاکٹر نے ہفتہ بھر اس کی صحت میں سدھار ہونے کا انتظار کیا۔ بخار نہیں رکا۔

ڈاکٹر نے رائے دی۔۔ برسات کی سردی اور سیلن آپ کو موافق نہیں آرہی ہے۔ دو مہینے کا موسم ٹھیک نہیں۔ آپ آگرہ لوٹ جایئے۔ ستمبر کے وسط میں واپس آسکیں تو فائدہ ہو سکتا ہے۔

پھر مایا کے بارے میں کوئی خبر نہیں ملی۔

ایک ہاتھ کی انگلیاں

رومی نے پہلی بار درد کی شکایت کی تو مسز سینڈل' آیا اور بیرے سے بہت ناراض ہوئیں۔۔ "گھر میں تین تین نوکر ہیں۔ ایک بچہ ہے' اسے بھی نہیں سنبھال سکتے۔ لڑکا دوپہر کی کڑکتی دھوپ میں بھٹکتا ہے۔ یہ لوگ ہیں کس لئے؟"

مسز سینڈل نے آیا کو حکم دیا۔۔ "فرج سے سنگترے لے کر" بابا کو ایک گلاس رس دے دو۔ یہاں ہمارے سامنے لاؤ' ہمارے سامنے پلاؤ!"

آیا ستیا نے فرج کی طرف بڑھتے ہوئے صفائی پیش کی۔۔ "سرکار ہم نے تو بابا کو بہت منع کیا۔ ہماری تو سنتے ہی نہیں'" "اے ڈبلوام" (اسسٹنٹ ورکس منیجر) صاحب کے بانی اور "فورمین" صاحب کے کمی کے ساتھ غلیل سے پیڑوں پر چڑیا کا شکار کرتے رہے۔" پھر آیا منہ پھیر کر ہونٹوں میں بڑبڑائی' "ابھی پھاگن لگا نہیں' ان کے تائیں کڑکتی دھوپ ہو گئی۔"

شام کو باتھ روم میں رومی پھر درد سے چیخ اٹھا۔ آیا دوڑی ہوئی گئی۔ بیٹے کی چیخ سن کر مسز سینڈل گھبرا گئیں۔ آیا کو حکم دیا۔ "بابا کو اس کے بیڈ روم میں لے جاؤ۔"

مسز سینڈل نے لڑکے کو بہت دھیان سے دیکھا۔ ان کے چہرے پر گہری فکر نمایاں ہو گئی۔ بڑے تامل اور جھجک سے لڑکے سے چند سوالات کیے۔ رومی شرم اور غلطی کا الزام سمجھ کر چپ ہو گیا۔ وہ باتھ روم میں نہیں گیا۔ درد کو بس میں کر کے چپ چاپ لیٹ گیا۔

پھاٹک سے کار کی آواز سن کر رومی سمجھ گیا کہ ڈیڈی آ گئے ہیں۔ دو ہی منٹ میں اس کے کمرے کے باہر ممی اور پاپا کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ دونوں اندر آ گئے۔ رومی کو ڈیڈی کے سامنے پتلون اتارنے کو کہا گیا۔ لڑکے کی آنکھیں شرم اور ذلت کے احساس سے سرخ ہو گئیں۔

روی نو برس کا ہوگیا ہے۔ بوائز اسکول' کی تیسری کلاس میں ہے۔ ڈیڈی کبھی کبھی اسے مسٹر روی کہہ دیتے ہیں۔ روی نے پینٹ اتارنے سے منع کردیا اور غصے سے رو پڑا۔

مسز سینڈل نے لڑکے کو پیار سے سمجھایا۔ ڈیڈی نے سنجیدگی سے حکم دیا۔ صاحب کے پیچھے کھڑی آیا نے پچکار کر خوشامد کی لیکن لڑکا اڑ گیا۔ اس نے اس توہین کے خلاف بطور احتجاج خاموشی اختیار کرلی۔ تکلیف کو قابو میں کرنے کے لئے دانت دبا کر لیٹ گیا۔

احتجاج خاموشی اختیار کرلی۔ تکلیف کو قابو میں کرنے کے لئے دانت دبا کر لیٹ گیا۔

سینڈل صاحب نے اسپتال میں فون کیا۔ فیکٹری کی بستی کا بڑا ڈاکٹر کیپٹن ستولے فوراً سائیکل سے بنگلے میں حاضر ہوگیا۔ صاحب نے ڈاکٹر کو ایک طرف لے جاکر بات کی۔

ڈاکٹر روی کے کمرے میں آگیا اور لڑکے کو مسکرا کر مخاطب کیا۔۔ "ہیلو ماسٹر سینڈل" اور پیار سے درد کے بارے میں پوچھا۔

روی چپ رہا۔ ڈاکٹر نے اس کی جھجک دور کرنے کے لئے پیٹھ تھپتھپائی اور اس کا معاینہ کرنے کے لئے پینٹ اتارنے کے لئے کہا۔

روی فیکٹری کی بستی میں رہنے والے سب سے بڑے صاحب کا بیٹا ہے۔ وہ کسی سے توہین نہیں سہہ سکتا۔ اس نے پھنکار کر ڈاکٹر کو ڈانٹ دیا۔ "شٹ اپ' گیٹ اوے!"

ڈاکٹر نے سمجھا کر لڑکے سے چند سوالات کر کے مسئلہ حل کرنا چاہا لیکن لڑکا خاموش رہا۔

ڈاکٹر ستولے نے سینڈل صاحب کے سامنے فکر اور افسوس کے ساتھ لاچاری ظاہر کی۔ میم صاحب اور نوکروں سے لڑکے کے کھانے پینے اور برتاؤں کے متعلق جو معلومات حاصل ہوسکتی تھی' اس سے ڈاکٹر لڑکے کی تکلیف کے بارے میں کچھ معلوم نہیں کرسکا۔

ڈاکٹر نے صاحب کے سامنے بہت جھینپ اور جھجک کے ساتھ کہا۔۔ "اس عمر کے بچے کی ایسی جھجک غیر معمولی بات ہے۔ کھانے پینے کی بات سے تو کوئی اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ معاف کیجئے گا' شاید بچہ وجہ بتانے میں شرم محسوس کررہا ہو۔ کوئی انفیکشن نہ ہو۔"

ڈاکٹر نے اور بھی تامل کے ساتھ کہا۔۔ "لیکن ایسا انفیکشن صرف ڈائریکٹ کانٹکٹ سے ہی ہوسکتا ہے۔"

سیڈل صاحب کے ماتھے پر تیوریاں گہری ہوگئیں۔۔۔ "یہ کیسے ممکن ہے' لڑکا صرف نو برس کا ہے۔"

ڈاکٹر نے آنکھ چرا کر کہا۔۔ "یس سر' میں خود بہت الجھن میں ہوں۔ ایسے معاملے میں لیبوریٹری ٹیسٹ ضروری ہے لیکن میڈیکل کالج اسپتال میں اس سے بھی کم عمر کے لڑکوں میں ایسے انفیکشن ہونے کے کیس آتے رہتے ہیں۔ معصوم اور نادان لڑکے بہکانے والوں کا شکار ہوجاتے ہیں۔"

"شاید... ممکن ہو!" صاحب نے ناراضگی کے ساتھ قبول کیا' "لیکن یہاں ایسا امکان کہاں ہے؟"

سیڈل صاحب نے "تھینک یو' کہہ کر ڈاکٹر کو چلے جانے کا اشارہ کیا اور فکر میں سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

روی کچھ دیر باتھ روم نہ جانے کا فیصلہ کرکے دانت پیسے خاموش پڑا رہا لیکن پھر برداشت نہ کرسکا اور باتھ روم میں جاکر چیخ پڑا۔

سیڈل صاحب نے چھاؤنی کے فوجی اسپتال کے بڑے ڈاکٹر کرنل چودھری کو فون کیا اور روی کو اس کی ممی کے ساتھ گاڑی میں اسپتال لے گئے۔

روی تکلیف سے نڈھال ہوگیا تھا۔ کرنل نے اس کی مزاحمت اور رونے یا چلانے کی پرواہ نہیں کی۔ لڑکے کی پینٹ اتار کر معمولی معاینہ کرکے سیڈل صاحب کو رائے دی۔۔ "لڑکے کو فورا دہلی لے جایئے۔ ہمیں ٹیسٹ کے لئے سلائڈ بنواکر ہیڈ کوارٹرز بھیجنی ہوگی' اس میں وقت لگ جائے گا۔"

کرنل چودھری کی صاف گوئی سے سیڈل صاحب کی گردن جھک گئی۔ ان کی خود

اعتمادی کو چوٹ لگی اور ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے۔ انہوں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ ان کے اکلوتے بیٹے کی زندگی اور مستقبل کا سوال تھا۔ فیکٹری واپس جاکر انہوں نے اگلے دن کے لئے سب احکام جاری کیے۔ ڈرائیور کو حکم دیا۔۔ فوراً دہلی جانے کے لئے گاڑی میں پیٹرول بھر کر تیار ہو جائے۔

دوسرے دن صبح آٹھ بجے ہی سیڈل صاحب گاڑی میں روی اور مسز کو لے کر دہلی میں بچوں کے کلینک میں پہنچ گئے۔

ٹیسٹ کی رپورٹ کی بنیاد پر کلینک میں روی کے پورے جسم کا معاینہ کیا گیا۔ خون ٹیسٹ کیا گیا۔ ٹیسٹ کی رپورٹ کی بنیاد پر کلینک کے بڑے ڈاکٹر نے گنوریا (سوزاک) کے انفیکشن کے علاج کے لئے انجکشن تجویز کیے۔

سیڈل صاحب نے اپنے وقار کے تحفظ کے کی آخری کوشش میں گڑگڑا کر ڈاکٹر کے سامنے شک ظاہر کیا۔۔ "معاف کیجئے گا' اس بچے کے حالات میں ایسے امکان کا موقع....."

یہ کلینک ہے' پولیس اسٹیشن نہیں ہے۔ یہاں مرض کی تشخیص کر کے علاج بتایا جاتا ہے۔ انفیکشن کے امکان کی تحقیقات کرنا آپ کا کام ہے۔" ڈاکٹر بات ختم کر دینا چاہتے تھے لیکن بچے کے عزت دار ماں باپ کے چہرے پر بے حد عاجزی دیکھ کر انہوں ذرا نرمی سے کہا۔۔ "آپ محتاط رہتے ہوں گے لیکن عورتوں اور لڑکیوں میں یہ بیماری پوشیدہ طور پر ہو سکتی ہے۔ لڑکا کسی بیمار جنس زدہ ڈائن کے ہاتھ پڑ گیا ہے۔ ہو سکتا ہے' مریض خود اپنی بیماری سے لاعلم ہو۔"

ڈاکٹر نے دوسرے مریض کو بلانے کا حکم دے کر سیڈل صاحب کو چلے جانے کا اشارہ کیا۔

سیڈل صاحب کی آنکھوں کے سامنے سرسوں پھول گئی تھی۔ سائنٹیفک ثبوت کے سامنے ان کی گردن جھک گئی تھی لیکن ان کا ذہن اس شکست کو آسانی سے قبول نہیں کر رہا تھا۔ انہوں نے اپنے مختصر خاندان اور اکلوتی اولاد کو عوام الناس کے غیر صحت مند اثرات اور بری تہذیب سے بچانے کے لئے کیا نہیں کیا تھا؟

سیڈل صاحب نے انگریزی عملداری ختم ہونے کے بعد ہی بڑے انگریز آفیسر کا عہدہ اور بنگلہ حاصل کیا ہے چھوٹے آفیسر ہونے کے زمانے میں بھی وہ صحت اور تہذیب کے خیال سے عوام الناس کی صحبت سے دور رہنا پسند کرتے تھے۔ ان کے والد منی رام سیڈل' اردو رسم الخط میں دستخط کرتے تھے۔ صاحب انگریزی میں دستخط کرنے لگے۔ انگریزی میں ان کے نام کا تلفظ ہوگیا۔۔ بی این سیڈل۔'

سیڈل صاحب بڑے انگریز آفیسر کے لئے انگریز عملداری میں بناگئے بنگلے میں رہتے تھے۔ انگریزوں کے قاعدے اور دستور کے مطابق عام ہندوستانی لوگوں کے انفیکشن کو دور رکھنے کے لئے بنگلہ سڑک سے ایک سوگز کے فاصلے پر بنایا گیا تھا۔ بنگلہ کانٹے دار ہری جھاڑیوں کی اونچی باڑوں سے گھرا ہوا ہے۔ بنگلے کی سب کھڑکیاں اور برآمدوں میں باریک جالی لگی ہوئی ہے۔ عوام الناس کے تعلق میں آنے والے مچھر اور مکھی بھی اندر داخل نہیں ہوسکتے۔ ان کے بنگلے کے مچھر' مکھی اور مکڑی الگ ہیں۔

فیکٹری کی اسٹیٹ کے انتظامیہ آفیسر' بڑے صاحب کے آرام و آسائش کی خاطر سرکاری ڈی ڈی ٹی اور دوسرے جراثیم کش دوائیں بڑی مقدار میں ان کے بنگلے کے حدود میں صرف کردیتے ہیں۔ چھوٹے ان چیزوں کی قدر کیا جانیں۔ وہ لوگ جراثیم کا اثر سہنے کے عادی ہوگئے ہیں۔ صاحب کے یہاں ڈبے میں بند ولایتی مٹھائی یا بسکٹ کے علاوہ دیسی دکانوں کی مٹھائی نہیں آتی۔ پھل بازار سے آتے ہی لال دوا کے پانی سے دھو دیے جاتے ہیں۔

بنگلے میں عام لوگوں کے داخلے کو روکنے کے لئے تعینات سرکاری وردی پوش چپراسی ہر وقت چوکس رہتا ہے۔ صاحب کے دھوبی اور مہتر الگ ہیں۔ ان خدمت گاروں کے کوارٹر بھی بنگلے کی وسیع حدود میں ہی ہیں۔ دفتر میں پیاس لگتی ہے اس لئے صاحب بنگلے سے تھرمس میں پانی لے جاتے ہیں۔ اس سڑک پر صرف تین سینئر آفیسروں کے بنگلے ہیں۔ چھوٹے افسروں کے بچے جو مزدور بستیوں میں بہت اکڑ کر چلتے ہیں' بڑے افسروں کے بنگلوں کی طرف آنے کی ہمت بھی نہیں کرتے۔

سیڈل صاحب کے رشتے دار عموماً اتنے نفاست پسند نہیں ہیں۔ صاحب ان سے زیادہ میل جول نہیں رکھتے لیکن کبھی کبھی کوئی رشتہ دار یا بچپن کے دوست بغیر دعوت

کے آہی جاتے ہیں۔ بنگلے میں مہمانوں کے لئے گیسٹ روم اور غسل خانے الگ ہیں۔ گیسٹ کے بستر اور تولیہ الگ ہیں۔

روی جب ڈھائی برس کا تھا اور تتلا کر بولتا تھا' اس نے ایک دن صاحب کے سامنے الو پٹھا' الو پٹھا کہہ دیا تھا۔ مسز سیڈل جھینپ کر جیسے زمین میں گڑ گئی تھیں۔ صاحب نے بہت فکر مند ہو کر انگریزی میں جواب طلب کیا تھا۔۔ لڑکے نے یہ کہاں سے سیکھا؟ بچے کو ہواخوری کے لئے کون لے جاتا ہے۔ کہاں لے جاتا ہے؟"

روی بولنا سیکھتے سیکھتے یہ بھی سیکھ گیا تھا کہ ممی اور ڈیڈی کے سامنے کیا نہیں بولنا چاہئے! بچے کی کچھ سیکھنے کی جبلت اور بے قرار تجسس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ ممی اور ڈیڈی اسے کئی باتوں سے لاعلم رکھنا چاہتے ہیں۔ بنگلے سے باہر اور نوکروں کے سامنے وہ سب لوگوں کی طرح آزادی سے گالی دینے کا مزہ لے سکتا تھا لیکن ممی ڈیڈی کے سامنے اس طرح کے الفاظ اس کی زبان پر نہیں آتے تھے۔ اتنی احتیاط سے پرورش کیے گئے بڑے صاحب کے لڑکے کو ایسا انفیکشن لگ گیا۔ بچے کو ایسی بیماری ہو جانے سے معمولی کلرک اور چپراسی کا سر بھی جھک جاتا۔۔

سیڈل صاحب نے نہ کبھی بھگوان کی طاقت پر شک کیا ہے اور نہ کبھی وہ بھگوان کے بھروسے رہے ہیں۔ اپنے خاندان کی صحت اور ممتاز حیثیت کے تحفظ کی خاطر وہ خود ہوشیار رہے ہیں لیکن ان کی ساری احتیاط اور کوشش بے کار ہو گئی۔ صاحب بے بسی میں بھگوان سے گڑگڑانے لگے۔ یہ سب کیسے ہو گیا؟

سیڈل صاحب دہلی جاتے وقت ذہنی پریشانی اور فکر کے سبب خاموش تھے۔ لوٹتے وقت وہ اور بھی شکست خوردہ تھے۔ ان کا جسم پوری رات جاگنے سے اور تھکان سے نڈھال تھا لیکن فکر مند ہونے کی وجہ سے جمائی بھی نہ لے سکا۔ ان کی سرخ آنکھیں پلک مارنے سے محروم تھیں۔ سڑک کے کنارے کے ایک گاؤں کو پہچان کر انہوں نے گھڑی دیکھی۔۔ فیکٹری تک صرف بیس منٹ کا فاصلہ تھا۔

روی ممی کی بغل میں لیٹا ہوا سو رہا تھا۔ مسز سیڈل کی آنکھیں بند تھیں لیکن نیند کوسوں دور تھی۔ صاحب نے انگریزی میں پوچھ لیا۔ "ڈاکٹر کہتے ہیں' بغیر ڈائریکٹ کانٹیکٹ کے یہ ممکن نہیں' لیکن انفیکشن آیا کہاں سے؟ نادان بچے کو ایسی نفرت انگریز

صحبت کہاں سے ملی؟ کس نے اس پر یہ ظلم کیا؟

مسز سیڈل آنکھیں نہیں کھول سکیں۔ بند آنکھوں کے کونوں میں آنسوؤں کی نمی نظر آئی۔ انہیں نے گہری سانس لے کر کہا۔۔ "بھگوان ہی جانتے ہیں۔"

مسز سیڈل کے تصور میں دو برس پہلے کا ایک واقعہ منڈلا رہا تھا۔ ان کی ماں نے گھر کی بھینس کا گھی اور دیسی شکر اپنے بھتیجے کے ہاتھ ان کے گھر بھیجی تھی۔ ان کا ممیرا بھائی ہری دوار تیرتھ یاترا کے لئے جاتے وقت یہ سوغات پہنچانے کے لئے ان کے یہاں ہو کر گیا تھا۔ سرد اور پرکشش جگہ دیکھ کر وہ چار پانچ دن کے لئے ٹھہر گیا تھا۔

سیڈل صاحب فیکٹری میں تھے۔ مسز سیڈل روی کو اسکول میں چھوڑ کر، اس کے کپڑے درزی کے یہاں دینے کے لئے بازار چلی گئی تھیں۔ بنگلے پر واپس آئیں تو آیا نے ان کے سامنے سر پیٹ لیا۔ آیا نے رو رو کر بتایا۔۔ وہ ذرا اسپتال چلی گئی تھی۔ اپنی گیارہ برس کی بیٹی گنیا کو گیسٹ روم کا فرش فنائل سے دھو دینے کے لئے کہہ گئی تھی۔ لوٹی تو لڑکی سبک سبک کر رو رہی تھی... لڑکی کی ایسی حالت تھی.... برادری اس کی فضیحت کرے گی۔۔۔ لڑکی کا کیا ہوگا؟

مسز سیڈل شرم اور پشیمانی سے گویا زمین میں گڑ گئی تھیں۔ لیکن کیا کر سکتی تھیں؟ انہوں نے کافی تسلی دلاسا دے کر آیا کو چپ کرایا۔ غصے میں کہا۔۔ ایسے لوگوں کو تو گولی مار دینی چاہئے۔ ابھی جوتے لگوا کر یہاں سے نکلواتی ہوں۔ تو اپنی بدنامی اور بچی کے کلنک کا خیال کر کے چپ رہ۔ انہوں نے آیا کے ہاتھ میں لڑکی کی دوا وغیرہ کی ضرورت کے لئے اور اسے خاموش کرنے کے لے پچاس روپے رکھ دئے تھے۔

مسز سیڈل کا سر نفرت اور غصے سے پھٹا جا رہا تھا۔ صاحب فیکٹری سے لوٹنے ہی والے تھے۔ ان کے سامنے وہ اپنے ایسے رشتہ دار کے بارے میں کیا جواب دیں گی۔ آہٹ پا کر ان کی نظر اٹھی۔ مہمان تانگے پر اپنا سامان لیے بنگلے سے جا رہا تھا۔ انہوں نے بھگوان کا شکر ادا کیا۔۔ "تم ہی محافظ ہو۔ تم ہی مددگار ہو۔" انہوں نے کوشش کر کے اپنے آپ کو سنبھالا۔ لنچ پر صاحب سے صرف اتنا ذکر کیا کہ مہمان چلا گیا تھا۔ صاحب کو ایسے مہمان سے کوئی سروکار نہ تھا۔

گاڑی میں سیڈل صاحب کے قریب بیٹھی ہوئی مسز سیڈل کا سر بے خوابی اور

تھکان سے پھٹا جارہا تھا- دو برس پہلے آیا ستیا پھوٹ پھوٹ کر رونے کے واقعے کے ساتھ نفرت انگیز بیماریاں اور ان کے علاج کے متعلق سنی ہوئی حماقت بھری اور نفرت انگیز باتیں یاد آرہی تھیں بیماری تو دو برس سے ان کے بنگلے میں موجود تھی- دو برس سے وہ کیوں خاموش تھیں؟ شوہر کے سامنے خاموشی کے لئے کیا جواب دے سکتی تھیں؟ بھگوان نے ان کے اس گناہ کی سزا ان کے اکلوتے بیٹے کو دی تھی-

مسز سیڈل کو قریب بیٹھے شوہر کی خود بخود بڑبڑانے کی آواز سنائی دی- "ایسے ظالم گناہ گار کا پتہ لگائے بغیر' اسے سزا دیے بغیر نہیں چھوڑوں گا-"

مسز سیڈل کے غم اور فکر سے پھٹے جارہے سر پر ایک خطرے کا پہاڑ ٹوٹ پڑا- ان کا سوکھا ہوا گلا اور بھی سوکھ گیا-

فیکٹری کے مزدوروں کے کوارٹروں میں' افسروں کے نوکروں کے کوارٹروں میں اور پوری اسٹیٹ میں سنسنی پھیل گئی- اسٹیٹ میں سب لوگوں کا ڈاکٹری معاینہ ہوگا-

طرح طرح کی افواہیں تھیں- کوئی کہتا تھا-- ہیڈ کوارٹر سے آرڈر آیا ہے کہ اسٹیٹ کے سب مرد' عورتوں اور بچوں کے کپڑے اتار کر ڈاکٹری معاینہ ہوگا- کئی لوگ کہتے تھے-- بڑے صاحب کے لڑکے کو اسٹیٹ سے خراب بیماری لگی ہے- بڑے صاحب نے حکم دیا ہے بیماری والے آدمی برخاست کیے جائیں گے-

مزدوروں کی طرف سے مخالفت کا طوفان اٹھنے لگا--- ایسی بے عزتی برداشت نہیں کریں گے- پہلے افسروں اور ان کے گھر کی عورتوں کا معاینہ مزدوروں کے سامنے کیا جائے تب مزدوروں کا معاینہ ہوگا-

افسروں کو مع خاندان گالیاں دی جانے لگیں-- اسپتال کی سب دوائیں کھاجاتے ہیں..... مزدوروں کی ہوا سے دور بنگلوں میں رہتے ہیں- مزدور تو ان کے بنگلوں کے پاس بھی نہیں پھٹک سکتے- یہ اپنی بیماری اور گندگی مزدوروں کے یہاں پھینکواکر مزدوروں کو بیماری دیتے ہیں- عہدے اور پیسے کے زور پر دنیا بھر کے برے کام کرتے ہیں- مزدور انہیں کیا بیماری دیں گے-؟

فیکٹری مزدور یونین کی طرف سے مخالفت ہوئی--- فیکٹری میں بھرتی کے وقت

سب مزدوروں کا ڈاکٹر معائنہ ہوچکا ہے۔ ہمارے گھروں کی عورتیں سرکاری نوکر نہیں ہیں۔ فیکٹری کو ہماری عورتوں کی ڈاکٹری سے کیا مطلب؟ کوئی ہماری عورتوں کی ڈاکٹری کرے گا تو خون بہہ جائے گا۔ بتایا جائے' کس قانون سے ہمارے گھروں میں ڈاکٹری کرائی جاسکتی ہیں!

افسروں کے نوکر بھی بڑبڑانے لگے۔۔۔ ہمارے ہی سر پر تو افسروں کے گھروں کی صفائی' تندرستی اور آرام کی ذمہ داری ہے۔ ہم ان کا گندہ اٹھائیں' میلا اٹھائیں' بیماری میں خدمت کریں! بیماری ان کی ہمیں لگے گی یا ہم سے انہیں لگے گی؟

مسز سیڈل کو خبر ملی۔ ستیا کہہ رہی تھی۔ "ہم کیا جانیں ان بڑے لوگوں کے گھر میں کیسی بیماریاں ہوتی ہیں؟ بڑے لوگ چاہیں جس کی عزت مٹی کردیں اور منہ سی لیں! کنواری لڑکیوں کی ڈاکٹری کیسے ہوسکتی ہے! ہم نے خدمت کرنے کی نوکری کی ہے' سو خدمت کروالیں۔ اپنی بے عزتی اور بدنامی کروانے کے لئے نوکری نہیں کی ہے۔

مسز سیڈل کلیجے پر پتھر رکھے خاموش تھیں۔ جانتی تھیں' صاحب کسی بات پر اڑ جاتے ہیں تو کسی کی نہیں سنتے۔ سوچتی تھیں۔ بھگوان کو جو منظور ہے۔ جانے کس گناہ کی سزا دے رہے ہیں؟

فیکٹری کی مزدور یونین نے قرارداد پاس کردی۔ فیکٹری' مزدوروں کے گھریلو معاملات میں دخل دے گی تو اسٹرائک ہوگی۔ اس معاملے میں فیکٹری کے دوہزار مزدور اور ڈیڑھ سو کلرک لال جھنڈا لے کر فیکٹری میں مظاہرہ کرنے لگے۔

اسٹرائک کی تجویز کی خبر پاکر سیڈل صاحب کے پاؤں لڑکھڑا گئے۔ قانون اور ہیڈ کوارٹرز کی حمایت حاصل ہونے پر وہ کبھی نہ دبتے لیکن اس ہڑتال کی دھمکی' ان کے اپنے آرڈر کی مخالفت میں تھی۔ فیکٹری میں ہڑتال کی رپورٹ اور اس کی تفصیل ہیڈ کوارٹر اور منسٹری تک بھیجنی ہوگی۔ ہڑتال انتظامیہ کے سپرنٹنڈنٹ کی نااہلی کا ثبوت ہوگی۔ اس عہدے سے ہی تو سیڈل صاحب کا ممتاز وجود برقرار تھا۔

سیڈل صاحب نے غلط فہمی دور کرنے کے لئے مزدور لیڈروں کو بلا کر بات کی۔ "بھائیو! فیکٹری کی طرف سے جبرا ڈاکٹری کرانے کا کوئی آرڈر نہیں ہے۔ آرڈر اسپتال کے لئے ہے کہ جو بھائی کسی طرح کی ڈاکٹری کرانا چاہتے ہیں' ان کی فورا ڈاکٹری کی

جائے اور ان کی مفت اور خفیہ علاج کیا جائے۔ یہ جبرا کسی کے لئے نہیں ہے۔"

"یہ انتظام ہماری اور آپ لوگوں کی بھلائی کے لئے ہے، ہمارے بال بچوں کی بھلائی کے لئے، سوشل ویلفیئر کے لئے ہے۔ ہم لوگوں کا کیا ہے، ہماری عمریں تو ختم ہو رہی ہیں۔ ہم سب کو اپنے بچوں کا خیال رکھنا چاہئے۔ ہمارے ملک کا مستقبل تو انہیں بچوں پر منحصر ہوگا۔ ہمارے سماج میں کہیں بھی کوئی مرض رہے گا تو ہم سب لوگوں کے لئے، پورے سماج کے لئے، ہمارے بچوں کے لئے خطرہ رہے گا۔ سماج کے خطرے سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ ہم سب ایک ہی ہاتھ کی چھوٹی بڑی انگلیاں ہیں۔ سب انگلیاں مل کر ہی مٹھی بنتی ہے۔"

سیڈل صاحب کے اطمینان دلانے سے مزدوروں کی غلط فہمی دور ہو گئی۔ ڈاکٹری معائنے سے توہین کا خدشہ دور ہوگیا۔ ہڑتال کا طوفان تھم گیا۔ اسٹیٹ کے مزدور مطمئن ہو کر صاحب کی تعریف کرنے لگے۔

آیا ستیا شام کے وقت سورتی کے لئے تمباکو لینے بھیٹی کی دکان تک گئی تھی۔ دکان پر بھی صاحب کی تعریف ہو رہی تھی۔ اتنے بڑے آدمی ہیں لیکن کہہ رہے تھے، ہم سب بھائی بھائی ہیں۔ ہم سب ایک ہاتھ کی چھوٹی بڑی انگلیاں ہیں۔ سب انگلیاں بندھ کر ہی مٹھی بنتی ہے....."

ستیا نے بات سننے کے دوران سورتی پھانک لی تھی۔ منہ میں سورتی سنبھالے رکھنے کے لئے ٹھوڑی بنا کر بولی، "ہاں، انگلی ہتھیلی پر جھکے نہیں تو مٹھی نہیں بندھتی۔ تم جانو، ایک انگلی للکارنے کے لئے ہوتی ہے اور کئی انگلیاں انجلی پسارنے کے لئے....

ستیا نے کسی جانکاری رکھنے والے شخص کے طور پر آنکھیں مٹکائیں جیسے وہ بڑے صاحب کے گھر کی آیا ہونے کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی جانتی تھی۔ اس نے صاحب کی تعریف پر پچ، سے پیک تھوک دی اور فخر سے گردن ٹیڑھی کر کے چلی گئی۔

آتم گیان

مہاراج جنک ودیہہ تھے۔ ان کے اثر سے میتھل ریاست اور جنک پوری کے عوام میں بھی ضبط نفس اور آدھیاتم سادھنا کا رجحان بڑھ رہا تھا۔ جنک پوری کے مشہور سیٹھ شیمک دنیا سے بے لوث ہوکر دنیا چلاتے تھے۔ شیمک کے تاجر سارتھ کیشا سے کاماکشا تک اور تریگرت سے لنکا تک سفر کرتے تھے۔ شیمک اپنے ذریعہ معاش سے بہت زیادہ مال جمع کرکے، مال کو یگیہ میں دان کرکے بہت زیادہ پیسہ کماتے تھے۔ شیمک کے لئے مال نجات کا صرف ایک وسیلہ تھا۔

ایک دن صبح کو شیمک کے خدمت گار آئینے کے سامنے ان کا سنگار کررہے تھے۔ سیٹھ کو خیال آیا کہ ان کے سر میں سفید بالوں کی تعداد بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ سوچا گرہستی اور دولت کمانے کی فکر سے علیحدگی کا وقت آگیا ہے۔

سیٹھ شیمک کا ایک ہی بیٹا تھا۔ سیٹھ نے اپنے بیٹے بھدرک کو یگیہ کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد گوروکھ سے تعلیم حاصل کرنے کے لئے مہرشی میدھر کے آشرم میں بھیج دیا تھا۔ سیٹھ نے عمر کے تیسرے مرحلے کی شروعات سے باخبر ہوکر بیٹے کو جنک پوری بلوایا اور اسے اپنے خاندانی پیشے سے دولت کمانے کی تعلیم دینے لگے۔ بیٹے کے لئے ایک اعلیٰ خاندان کی حسین لڑکی تلاش کرکے اس کی شادی بھی کردی۔

سیٹھ کے بیٹے بھدرک کا رجحان گرہستی اور دولت کی طرف نہیں ہوا۔ وہ عیش وعشرت اور حصول دولت کی طرف دھیان ہی نہیں دیتا تھا۔ تنہائی میں بیٹھا غور وفکر اور آتم گیان میں ہی مگن رہتا تھا۔

سیٹھ کے حرم کی خوبصورت داسیاں، معزز خاندانوں کی روایت کے مطابق سیٹھ کے جوان بیٹے کے جسم پر چندن کا لیپ کرنا چاہتی تھیں۔ بھدرک ان سے اس طرح منہ موڑ لیتا تھا جیسے وہ اس کے جسم پر سڑک کی کیچڑ پوت رہی ہوں۔ داسیاں اس کے

کھانے کے لئے بہترین اور لذیذ غذائیں پیش کرتی تھیں۔ مگر بھدرک انہیں ہاتھ بھی نہیں لگاتا تھا۔

بھدرک کی نوجوان حسین بیوی رات میں سندری داسی کے ہاتھوں سے گندھی مالا لے کر اس کے پاس آتی تو بھدرک خواب گاہ چھوڑ کر اوس میں گھاس پر جاکر بیٹھ جاتا تھا۔

سیٹھ تیمک بیٹے کو نصیحت کرتے تھے۔ جوانی اور گرہستی میں علیحدگی، دھرم اور اصول کے خلاف ہے۔

بھدرک باپ کو جواب دیتا تھا۔۔۔ "ہے پتا! موکش غور و فکر سے ہی ملتا ہے۔ موکش کو جسم نہیں آتما حاصل کرتی ہے۔ اس لئے آتما ہی غور و فکر کے لائق ہے۔ جسمانی تعلقات میں محو ہو جانا روح سے بے اعتنائی برتنا ہے۔ اے محترم، مباشرت کی کشش چراغ کی لو کی طرح ہے۔ ذی روح پروانہ، اس کی کشش میں اپنا وجود کھو بیٹھتا ہے اور دوبارہ چراغ کی لو میں جلنے کے لئے پروانے کا جسم اختیار کرلیتا ہے۔ آتما کے اس آواگون سے کیا فائدہ؟"

بھدرک کے بیراگ سے تیمک کو بہت فکر ہوئی۔ سیٹھ سوچنے لگے۔۔ گرہستی میں سنیاس کا خیال آشرم دھرم کی خلاف ورزی ہے۔ دھرم کی بے وقت پابندی خود دھرم کو ہلاک کردیتی ہے۔ جیسے برتن کے نیچے رکھی آگ کھانا پکاتی ہے لیکن برتن میں ڈالی گئی آگ کھانے کو برباد کردیتی ہے۔ بیٹے کے ایسے خیالات ہیں تو ان کے خاندانی دھرم کی تکمیل کیسے ہوگی؟ دھارمک اعمال و رسوم اور یگیوں کو باقاعدہ انجام نہ دینے سے دیوتا ناخوش رہیں گے۔ کام اور معاش کے دھرم کی کمی کے سبب مکتی بھی حاصل نہیں ہوگی۔ اس سے عوام کا نقصان ہوگا، اس دنیا میں کلیان نہیں ہوگا اور پرلوک کا بھی نقصان ہوگا۔

سیٹھ تیمک اپنے بیٹے کے شکوک و شبہات کو دور کرنے کے لئے اسے لے کر صحیح راہ دکھانے والے اور کرم کانڈ کے بارے میں اپدیش دینے والے راج گورو مہرشی سدانند کے آشرم میں گئے اور مہرشی سے اپنے بیٹے کے شکوک و شبہات دور کرکے ان کے خاندان کرم اور دنیا کی حفاظت کی التجا کی۔

راج گورو مہرشی سدانند نے بھدرک کو اپدیش دیا۔۔ "ہے سومیہ! دھرم ہی موکش کا مارگ ہے۔ سچائی ہی دھرم ہے۔ موجودہ صورت حال ہی حقیقت ہے۔ جسم بھی ہے اور آتما بھی ہے۔ جسم کے دھرم سے آتما کے دھرم کی تکمیل ہوتی ہے۔ اس دھرم کی تکمیل ہی یگیہ ہے۔ یگیہ کا دھرم ہی کرم کانڈ ہے۔۔۔ یگیہ کی پورتی ہی موکش ہے۔"

مسلسل استغراق اور غور و فکر سے بھدرک کی قوت استدلال بڑھ گئی تھی۔ اس نے ادب و احترام کے ساتھ مہرشی کے سامنے اپنا شک ظاہر کیا۔۔ "پرم گیانی' اپدیش کریں۔۔ پرم لکش کرم ہے یا موکش؟"

مہرشی نے سوچ کر جواب دیا۔۔۔ "سومیہ پرم لکش موکش ہے۔"

بھدرک نے سوال کیا۔۔ "پرم گیانی اپدیش کریں موشک جسم حاصل کرتا ہے یا آتما؟"

مہرشی نے جواب دیا۔۔ "وتس' موکش آتما حاصل کرتی ہے۔"

بھدرک نے پھر سوال کیا۔۔ "ہے پرم گیان' اپدیش کریں' فانی مادی جسم اہم اور غور و فکر کے لائق شے ہے یا غیر فانی آتما؟"

مہرشی نے قبول کیا۔۔۔ "اہم تو غیر فانی آتما ہی ہے لیکن غیر فانی آتما کرم سے فراغت ہی موکش ہے۔ کرم کی تکمیل کے بغیر اس سے فراغت نہیں ہو سکتی۔ اس لئے وتس' موکش کی راہ کرم کی تکمیل ہے اور کرم کی تکمیل کرم سے فراغت کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔"

بھدرک نے مہرشی کے سامنے موجود تجسس عوام کو مخاطب کیا۔۔ "موکش کی خواہش کرنے والے سچ کو پہچانیں! فانی کی فکر میں غیر فانی کو آلودہ کرنا محض فریب خیال ہے۔ کرم سے فراغت کے مقصد سے کرم کو اختیار کرنا وزن کو صرف پھینک دینے کے لئے اٹھانا ہے۔ یہ ناکامی کا راستہ ہے۔"

راج گورو مہرشی سدانند کے آشرم کے متعدد رشی اور برہمچاری بھدرک سے شاستر ارتھ کرنے کے لئے آگے بڑھے۔

بھدرک نے ہاتھ اٹھا کر ایک ہی سوال کیا۔۔ "گیانی حضرات جواب دیں' جسم

اہم ہے یا آتما؟"

زیادہ تر رشی اور برہمچاری مناسب جواب کی تلاش میں خاموش رہ گئے لیکن کچھ اتاولے شاگرد بول اٹھے۔۔ "آتما"

بھدرک نے انہیں مخاطب کیا۔۔ "گیانی حضرات، سچ ہے آتما مکھیہ ہے۔ غیر فانی نرمل (خالص) آتما کو مذہبی اعمال ورسوم کے کردم میں غرق کرنے سے کیا فائدہ؟ آتما کے غیر فانی، نرمل اور بے میل گن کو پہچانو۔ وہی صحیح راستہ ہے۔ کرم کانڈ کے کردم میں آتما کو غرق کرنا موہ کا راستہ ہے۔"

بھدرک نے عزم کیا کہ وہ غیر فانی اور نرمل آتما کی پرتشٹھا کے ذریعہ ودیہہ کے سچے راستے کو تلاش کرے گا۔ اس مقصد سے اس نے گیان میں کمال حاصل کرنے کا عزم کیا۔ اس نے گرہستی ترک کردی۔

سیٹھ بیمک نے اپنے دل کو سمجھایا۔۔ دنیا کے رکھوالے دیوتاؤں کو جو منظور ہوگا، وہی ہوگا۔ اگر دیوتاؤں کو اپنی پوجا، تشٹی اور میرے ونش دھرم کی حفاظت منظور ہے تو وہ خود ہی میرے بیٹے کے وہم کو ختم کردیں گے۔"

اس زمانے میں سب سے مشہور آتم درشا مہرشی یاگیہ ولکیہ کے مقررہ نظام کو ہی قطعی ثبوت اور حجت مانا جاتا تھا۔ مہرشی یاگیہ ولکیہ کا ایک آشرم کوشل اور متصلہ ریاستوں کی سرحد پر واقع نیمی شارنیئے میں بھی تھا۔ اس سال مہرشی نیمی شارنیئے میں ہی تھے۔ بھدرک مہرشی یاگیہ ولکیہ کے نظام سے مستفید ہونے کی آرزو لیے نیمی شارنیئے پہنچا۔

بھدرک نے نیمی شارنیئے کے آشرم میں پہنچ کر مہرشی یاگیہ سے آتما، جسم اور موکش سے متعلق گیان کی پرارتھنا کی۔

مہرشی نے بھدرک کے مطالعہ، تپیا اور تجربے کا اندازہ لگانے کے لئے اسے سر سے پیر تک دیکھا، اس کی عمر کا اندازہ لگایا اور آدیش دیا۔۔ "نوجوان جاؤ، رشی شویت کیتو سے گیان حاصل کرو۔"

نیمی شارنیئے کے آشرم میں رشی شویت کیتو، آتم گیان مارتنڈ مہرشی یاگیہ ولکیہ کے خاص شاگرد اور آتم گیان کے خصوصی مقرر تھے۔ وہی آشرم کے اپ کل پتی

(وائس چانسلر) تھے۔ مطالعہ اور غوروفکر کے اثر سے ان کے بالوں اور مونچھوں پر سے سیاہی دور ہو چکی تھی۔ بھدرک نے رشی شوئیت کیتو سے آتم گیان کی تعلیم کے لئے درخواست کی۔

رشی شوئیت کیتو نے بھدرک سے مہرشی سدانند کے آشرم میں حاصل کیے گئے گیان اور اس کے غوروفکر کے بارے میں اختصار سے چند سوالات کیے اور حکم دیا کہ وہ ان کے شاگرد منی ادھو سے گیان حاصل کرے۔

منی ادھو نے بھدرک کو گیان دینا منظور کرلیا۔ بھدرک چھ مہینے تک منی ادھو کی پچپاس گنوؤں کی سیوا کرتے ہوئے لگاتار آتم گیان کے بارے میں غوروفکر کرتا رہا۔

منی ادھو نے بھدرک کے گیان حاصل کرنے کے جذبے کا امتحان لیا۔ بھدرک کی سیوا سے مطمئن ہوکر منی نے اس کے سامنے کئی دن تک آتما کی حقیقت اور اس کے ہمہ گیر اوصاف کی تشریح کی۔ منی نے کرم کانڈ کے ذریعہ آتما کے برہم میں مل جانے سے موکش حاصل کرنے کا اپدیش دیا۔

بھدرک نے منی ادھو کا پورا اپدیش سن کر درخواست کی۔ "گیان دھن منی فیصلہ کریں، آتما خاص ہے یا جسم؟"

منی نے جواب دیا۔۔ "بھدر، کوئی خاص اور کوئی عام نہیں ہے۔ روح اور جسم کا تعاون ہی موکش کا واحد راستہ ہے۔

اس جواب سے بھدرک کی تشفی نہیں ہوئی۔ اس نے دوبارہ رشی شوئیت کیتو کی پناہ لی۔ رشی شوئیت کیتو نے دوبارہ اسی گیان کی تلقین کی اور منی ادھو کے گیان کو سچ بتایا۔ بھدرک نے رشی شوئیت کیتو کے سامنے عرض کیا۔۔۔ "رشی اپدیش کریں، آتما خاص ہے یا جسم؟ موکش کس کا ہوتا ہے؟"

رشی شوئیت کیتو نے جواب دیا۔۔ "کوئی خاص نہیں ہے، کوئی عام نہیں ہے۔ ہر جاندار آتما اور جسم کا امتزاج ہے۔ کرم کانڈ جاندار کا دھرم ہے۔ دھرم کی تکمیل سے ہی موکش حاصل ہوتا ہے۔"

بھدرک نے اصرار کیا۔۔ "جسم سے پہلے بھی آتما کا وجود ہوتا ہے۔ جسم ختم ہونے پر بھی آتما لازوال رہتی ہے۔ موکش جسم نہیں، آتما حاصل کرتی ہے۔ رشی ور

قبول کریں، آتما ہی خاص ہے۔"

شوئیت کیتو نے پھر تشریح کی۔۔ "آتما جسم سے الگ ہو کر موکش کی خواہش اور اس کے لئے سادھنا نہیں کر سکتی۔ جسم ہی آتما کی فکر کرتا ہے۔ جسم سے ہی آتما تک رسائی ہوتی ہے۔ اس لئے دونوں کا تعاون ہی حقیقت ہے۔ خاص اور عام کا سوال محض کٹ حجتی ہے۔"

بھدرک کی تشفی پھر بھی نہیں ہوئی۔ وہ مہرشی یاگیہ ولکیہ کی کٹیا کے دروازے پر جا بیٹھا۔ مہرشی کو تیکھی نظر سے اپنی طرف دیکھتے پاکر بھدرک نے اپنی پریشانی ظاہر کی۔۔۔ "تپودھن' منی ادھو اور رشی شوئیت کیتو میرے تجسس کو مطمئن نہیں کرپائے۔ مہرشی میرا ادھار کریں۔"

مہرشی یاگیہ ولکیہ نے بھدرک کو اپنے شکوک ظاہر کرنے کی اجازت دی۔

بھدرک نے مہرشی کے آسن کے سامنے پرنام کرکے التجا کی۔۔ گیان دھن' پرم مہرشی' اپدیش کریں' آتما خاص شے ہے یا جسم خاص شے؟"

روشن ضمیر مہرشی نے بھدرک کی آنکھوں میں دیکھ کر جواب دیا۔۔ "جسم خاص ہے۔"

بھدرک بے وقوفوں کی طرح ہکا بکا رہ گیا۔ مہرشی کی طرف کچھ پل دیکھ کر بولا۔۔ تپودھن' جسم تو فانی ہے۔"

مہرشی نے جواب دیا۔۔ "جسم تو فانی ہے' لیکن وہی خاص شے ہے۔"

بھدرک نے التجا کی۔۔ "تپودھن ایسا اپدیش تو کسی گیانی نے نہیں دیا۔ مہرشی اس لئے گیان کی تشریح کریں۔"

مہرشی نے سوال کیا۔۔ "سومیہ' تو گیان کو براہ راست تجربے کی بنا پر حاصل کرنا چاہتا ہے یا لفظی ثبوت کی بنا پر۔"

بھدرک نے سوچ کر جواب دیا۔۔ "مہرشی براہ راست تجربے کے ذریعے ہی گیان دینے کی مہربانی کریں۔"

مہرشی نے ہمدردی سے مسکرا کر جواب دیا۔۔ "سومیہ' ایسے موقع کے لئے انتظار کرو۔"

ایک دن صبح اگنی ہوتر کے بعد مہرشی نے بھدرک کو طلب کر کے حکم دیا۔۔ "وتس، آج ہمیں کالے کھجور کا ذائقہ لینے کی خواہش ہے۔ جہاں سے ملے کالے کھجور کا پھل گورو کے لئے حاضر کرو۔"

سب ہی لوگ جانتے تھے کہ کالے کھجور کے درخت صرف سدھ ہرنیئے کے آشرم میں ہی تھے۔ آشرم میں رہنے والوں نے بھدرک کے لئے مہرشی کا حکم سنا تو خوف سے کانپ اٹھے۔ سدھ ہرنیئے ماہر طلسمات اور تانترک تھا۔ وہ اپنی سادھنا کے لئے انسان کی قربانی دیتا تھا۔ وہ انسانوں کو مویشی کی شکل دے کر ان کا گوشت بھی کھاتا تھا۔ بھدرک نے جان کی پرواہ نہیں کی۔ وہ مہرشی کے حکم سے سدھ ہرنیئے کے آشرم کی طرف چل پڑا۔ وہ گیان کے لئے سادھنا کر رہا تھا۔ گورو کے حکم کی تعمیل ہی سب سے بڑی سادھنا تھی۔

بھدرک خوف سے بے پرواہ ہرنیئے کے طلسماتی آشرم میں چلا گیا۔ پھلوں سے لدے کالے کھجور کا درخت دیکھ کر وہ اس پر چڑھ گیا۔ بھدرک نے کھجور کا ایک گچھا توڑ لیا۔

اپنی کٹیا میں بیٹھے ہرنیئے نے پھل توڑنے کی آہٹ محسوس کی۔ اس کی نظر بھدرک کی طرف گئی۔

ہرنیئے نے پل بھر کے لئے سوچا اور منتر کی طاقت سے حکم دیا۔۔ "کچھپ بن کر نیچے زمین پر گر جا۔"

بھدرک کا جسم فوراً کچھوے میں تبدیل ہو گیا اور وہ درخت پر سے گرنے والے ناریل کی طرح ٹپ سے زمین پر گر پڑا۔ بھدرک کا جسم کچھوئے کی کھوپڑی میں محفوظ تھا۔ اتنی اونچائی سے گرنے پر بھی اس کا جسم صحیح سلامت رہا۔

تانترک ہرنیئے ایک رسی ہاتھ میں لے کر کچھوئے کی شکل والے بھدرک کے پاس گیا۔ جادوگر نے منتر کی طاقت سے کچھوئے کو بکرا بن جانے کا حکم دیا۔ بھدرک بکرا بن گیا۔ ہرنیئے نے بکرے کے گلے میں رسی ڈال کر اسے اپنی کٹیا کے پچھواڑے، قربانی کے ستون سے باندھ دیا۔

بکرے کی شکل میں بھدرک لاچار تھا۔ گلے میں رسی بندھی تھی۔ وہ قربانی کے

ستون کے چاروں طرف چکر لگاتا ہوا ممیا ممیا کر گورو کو پکار رہا تھا۔ اس تکلیف میں آتم گیان کے تجسس کو بھول کر وہ اپنے گلے پر جادوگر کے کھڈگ کے حملے کے اندیشے سے کانپ رہا تھا۔

تپودھن مہرشی یاگیہ ولکیہ نے اپنے آشرم میں بیٹھے بیٹھے بکرے کے گلے سے اپنے لاچار شاگرد کی پکار سن لی۔ یوگ کی طاقت سب کچھ معلوم کرلیا۔ کچھ دیر تک کوئی خطرہ نہ دیکھ کر بھدرک کو بکرے کی شکل میں ہی رہنے دیا۔

بکرے کا جسم اختیار کیے ہوئے بھدرک کے سامنے بیر کے پتے ڈال دیے گئے تھے اور ایک کنڈ سے پانی پیا اور بیر کے پتے بھی کھاگیا۔ بھدرک دیوتاؤں کی مرضی کے سامنے خود سپردگی کر کے چاروں کھر سمیٹ کر بیٹھ گیا اور جگالی کرنے لگا۔

مناسب وقت سمجھ کر اپنے آشرم میں بیٹھے مہرشی یاگیہ ولکیہ نے بکرے کی شکل میں بندھے ہوئے بھدرک کے اوپر جادوگر ہرنیئے کے منتر کی طاقت کو اکھاڑ پھینکا اور اپنے منتر کی طاقت سے اسے پھر انسان کی شکل دے دی۔

بھدرک کو چار کھروں کی جگہ پر دو ہاتھ اور دو پاؤں مل گئے۔ اس نے فورا اپنے گلے کی رسی کھول ڈالی۔ وہ جادوگر ہرنیئے کی پناہ سے بھاگتا ہوا مہرشی یاگیہ ولکیہ کے آشرم میں پہنچ گیا۔ بھدرک بہت تیزی سے بھاگ کر آنے کی وجہ سے ہانپ رہا تھا۔ اس نے مہرشی کے چرنوں میں اپنا سر رکھ دیا۔

مہرشی یاگیہ ولکیہ نے دھیان میں خلل پڑنے پر تیزی سے سانس لیتے ہوئے بھدرک کی طرف دیکھا اور پھر سوال کیا۔ "کیوں رے' تو اتنے وقت تک کہاں تھا؟ کالے کھجور کا پھل لایا؟"

بھدرک گورو کے حکم کی تعمیل نہ کرپانے کی سزا کے خدشے سے کانپ اٹھا۔ معافی مانگنے کے لئے ہاتھ جوڑ کر اس نے ہانپتے ہوئے گذارش کی۔ "تپودھن' سیوک تو جادوگر کے جال سے بکرے کے جسم میں قیدی بن کر لاچار ہوگیا تھا۔"

"ارے تو بکرے کے جسم میں تھا تو کیا ہوا؟" مہرشی نے بھنویں چڑھا کر سوال کیا۔ "تیری آتما تو اسی نیک شخص بھدرک کی ہی تھی۔ بول تھی یا نہیں؟"

"سچ ہے چتودھن' آتما تو وہی تھی۔ متحرک یا غیر متحرک میں ایک ہی آتما ہے۔" بھدرک نے قبول کیا۔

"بتا' تو نے کیا محسوس کیا؟ روح خاص ہے یا جسم؟ مکتی کے لئے سادھنا آتما سے کرے گا' یا جسم سے؟"

بھدرک نے مطمئن ہوکر مہرشی کے پاؤں کی دھول لی اور تمام شکوک وشبہات رفع کرکے اپنے خاندان کا دھرم سنبھالنے کے لئے جنک پوری لوٹ گیا۔

جہاں حسد نہیں

نور حسن اپنی زندگی سے مطمئن تھا۔ ریلوے ورکشاپ میں پکی نوکری اور گھر پر اطاعت گذار بیوی۔ بیوی کو وہ گاؤں سے لے آیا تھا۔ وہ بلو چودھری کے احاطے میں ایک مکان کے آدھے حصے میں گذر کر رہا تھا۔ جگہ چھوٹی تھی لیکن پردہ دار تھی۔ اوپر چھت پر ایک اینٹ کی قد آدم دیوار بناکر دو مکان بنادیے گئے تھے۔ زینہ دونوں طرف الگ الگ تھا۔ نور حسن دائیں طرف کے حصے میں رہتا تھا۔ نہ کسی سے لینا نہ کسی کا دینا۔ ورکشاپ میں کام اور گھر پر آرام۔

بیوی کے لئے نور حسن نے سفید برقع سلوادیا تھا۔ اتوار یا چھٹی کے دن بیوی کو برقع اڑھا کر تیسرے پہر سیر کے لئے لے جاتا تھا۔ کہیں کسی خوانچے والے کے پاس کوئی اچھا پھل یا مٹھائی بیوی کو پسند آجاتی تو وہ اشارہ کرکے دو قدم ہٹ کر کھڑی ہوجاتی اور نور حسن وہ چیز خرید لیتا تھا۔ گھر لوٹ کر دونوں کھاتے تھے۔ دونوں خوش مزاج اور نیک چلن تھے۔ اپنے کام سے کام اور اللہ سے واسطہ رکھنے والے۔ جب کبھی اتوار کو بھی میاں کی ڈیوٹی ورکشاپ میں لگ جاتی تھی تو سعادت کو بہت برا لگتا تھا۔ خیر نوکری کا معاملہ تھا' مجبوری تھی۔

ایک دن دوپہر کو سعادت نہانے کے بعد چھت کی منڈیر پر بیٹھ کر دھوپ میں بال سکھا کر کنگھی کر رہی تھی۔ بیچ بیچ میں وہ نیلے آسمان میں اڑتی رنگ برنگی پتنگوں کے داؤ پیچ بھی دیکھ لیتی تھی۔ سامنے کے مکان کی چھت پر ہندو پڑوسنیں چٹائیاں بچھا کر بڑیاں توڑ رہی تھیں۔ سعادت سردی کی دھوپ میں ستا کر آہستہ آہستہ کنگھے سے اپنے بال کاڑھ رہی تھی اور انگلیوں سے کنگھے کو صاف کرتی جاتی تھی۔ کسی کی آنکھیں وہاں پہنچ کر اسے چھیڑ نہیں سکتی تھیں۔ اس نے یوں ہی بائیں طرف نظر کی تو دیکھا' دیوار کے اس طرف سے دو آنکھیں اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ وہ گھبرا کر اٹھی اور

اندر چلی گئی۔ اندر جاتے جاتے اس نے ایک بار پھر گھوم کر دیکھا، واقعی کوئی اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

سعادت جانتی تھی، جو لوگ دوسرے کی بیویوں کو دیکھتے ہیں وہ بھلے آدمی نہیں ہوتے۔ بدمعاشوں کی نظر کیسی ہوتی ہے، یہ تو وہ ٹھیک سے نہیں جانتی تھی لیکن اس نظر میں کوئی تیزی نہیں تھی، جس سے وہ ڈر جاتی۔ پھر بھی اسے کوئی کیوں دیکھے؟ اس نے اندر بیٹھ کر چوٹی باندھی اور دوپٹہ سر پر ڈال لیا۔ کنگھی میں سے نکلے بال پرنالے کی موری میں پھینکنے گئی تو اس نے ایک بار پھر جاننا چاہا، اب تو کوئی اسے نہیں دیکھ رہا؟ اسے پتہ چلا کہ وہ سچ مچ اسے دیکھ رہا تھا لیکن اسی طرح انتظار کی مضطرب نظر سے، جھپٹ لینے والی تیکھی نظر سے نہیں۔

سعادت نے دل کو سمجھایا۔۔ جانے دو۔ مجھے کیا؟ چولہا جلا کر وہ کھانا پکانے میں لگ گئی۔ اسے معلوم تھا کہ اس طرف کوئی عورت نہیں رہتی، کبھی دیکھی جو نہیں تھی۔

رات میں اس نے میاں سے کوئی ذکر نہیں کیا، ضرورت بھی کیا تھی؟ خواہ مخواہ اسے برا لگتا۔ دوسرے تیسرے دن اسے ادھر کوئی دکھائی نہیں دیا لیکن چوتھے دن دوسری طرف سے دیوار پر سوکھنے کے لئے ڈالا ہوا ایک تہبند اڑ کر ادھر گر گیا تھا۔ سعادت نے سوچا۔۔۔ مجھے کیا؟ تہبند اپنا تو ہے نہیں۔ پھر سوچا پڑوسی پریشان ہوگا۔ تہبند اٹھا کر اور تہہ کرکے اس نے دیوار پر رکھ دیا لیکن ادھر دیکھا نہیں۔ بعد میں اسے معلوم ہوا کہ ادھر سے دیکھنے والی آنکھیں صبح نو بجے سے پہلے اور شام کو پانچ بجے کے قریب ہی دیکھتی ہیں۔ ہوگا، مجھے کیا، اس نے سوچا لیکن آنگن میں جانے پر وہ دیکھ لیتی تھی کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا؟ اپنے پردے کا خیال جو تھا۔

ایک دن پڑوسی نے سلام کرلیا۔ سعادت شرما گئی۔ ایسے تو نہیں کرنا چاہیے۔ اس نے سوچا لیکن اس نے کوئی بری بات تو کی نہیں۔ شکایت کی تو کوئی بات ہے نہیں۔ ہوگا، مجھے کیا؟ دل ہی دل میں اس نے کہا۔۔ ہے تو مرد لیکن سیدھا لگتا ہے۔

نور حسن کے ورکشاپ سے آنے کا وقت ہوتا تو سعادت کھڑکی میں لگی چق سے جھانکنے لگتی تھی۔ اس دن نور حسن کو دیر ہوگئی۔ وہ بڑی فکر سے راہ دیکھ رہی تھی اور

جب نور حسن دور سے لکڑی ٹیکتا اور لنگڑاتے ہوئے آتا دکھائی دیا تو سعادت کے سر پر جیسے پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ زینے سے لپک کر دوڑتی ہوئی نیچے آئی۔

"ہائے ہائے' یہ کیا ہوا؟" وہ میاں سے لپٹ کر رونے لگی۔ اسے سہارا دے کر زینے پر چڑھا کر اوپر لائی۔ نور حسن کے گھٹنے پر ایک بھاری بیلن گر جانے سے چوٹ لگ گئی تھی۔ گھٹنا سوج گیا تھا۔ آدھی رات تک سعادت نے نمک کی پوٹلی سے سینک کا اور پھر تکیے سے روئی نکال کر پٹی باندھ دی۔ شوہر کے گھٹنوں کو گود میں لیے ہوئے اس نے پوری رات گذار دی لیکن گھٹنا صبح تک سوج کر دگنا ہوگیا۔ نور حسن کے لئے ہلنا مشکل تھا۔ کرتا تو کیا؟

اس پریشانی کی حالت میں نور حسن سوچنے لگا۔۔ چھٹی کی عرضی ورکشاپ کیسے بھیجوں؟ دوا تو سعادت برقع اوڑھ کر پنساری کی دکان سے لاسکتی ہے۔ سعادت نے بتایا۔۔ "دیوار کے اس طرف ایک مسلمان بھائی رہتا ہے' اتنا تو کر ہی دے گا۔ اس میں کیا ہے؟"

نور حسن بہت سوچ سمجھ کر لکڑی کے سہارے چھت کو بانٹنے والی دیوار تک پہنچا اور پڑوسی کو بلا کر' سلام کر کے اس نے اپنی پریشانی بتائی۔

پڑوسی نے بہت ہمدردی سے اطمینان دلایا۔۔ "تم چارپائی پر لیٹو' میں آکر سب کردیتا ہوں۔" تھوڑی دیر بعد نیچے سے زینے کی کنڈی کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ سعادت کو دروازہ کھولنے جانا پڑا برقع اوڑھ کر وہ گئی اور کنڈی کھول کر پڑوسی کے زینے میں آنے سے پہلے اوپر آگئی۔

پڑوسی کا نام تھا' حبیب۔ یہ کوئی اٹھائیس تیس برس کا شریف جوان تھا' ریل کے دفتر میں بابو تھا۔ اس نے عرضی لکھ کر پہنچا دینے کا اطمینان دلایا اور پنساری کی دکان سے دوا کا سامان اور بازار سے ترکاری' مصالحہ تک لاکر دیا۔ شام کو پھر آیا اور ضروریات کے بارے میں پوچھ کر چلا گیا۔ اسی طرح لگاتار تین چار دن تک یہ سلسلہ چلا۔ سعادت نے سوچا۔۔ بھلا آدمی ہے' یہ تو پہلے ہی بھلا آدمی معلوم ہوتا تھا۔

نور حسن کے گھٹنے کی تکلیف بڑھتی گئی۔ حکیم نے رائے دی۔۔ "اسپتال لے جاؤ!"

سعادت رونے لگی۔ غریب مزدور کو اسپتال میں کون جگہ دیتا لیکن حبیب نے انگریزی میں بات چیت کر کے سارا کام ٹھیک طرح سے کرا دیا۔

نور حسن کے گھٹنے کا آپریشن ہوا۔ سعادت روز کھانا پکا کر' برقع اوڑھ کر تیار ہو جاتی تھی اور حبیب اسے ساتھ لے کر اسپتال جاتا اور واپس لاتا تھا لیکن سلام دعا کے علاوہ کوئی بات چیت نہیں ہوتی تھی اسپتال سے واپس آ کر وہ اپنے لئے کھانا پکاتا تھا۔ نور حسن اور سعادت دونوں پڑوسی کی تعریف کرتے تھے اور شکریہ ادا کرتے تھے۔

ایک دن سعادت سے نہ رہا گیا۔ اس نے برقع میں سے کہا۔۔۔ "اسپتال سے لوٹ کر چولہا کس طرح جلاؤ گے؟ اپنا آٹا دے دینا' تمہارے لئے بھی دو روٹیاں پکا دوں گی۔"

"کیوں تکلیف کرو گی؟ تم خود مصیبت میں ہو!" حبیب نے جواب دیا۔

"مصیبت تو ہے ہی لیکن تم اتنا کر رہے ہو! اتنا کیا کوئی دوسرا کرتا ہے؟" سعادت حبیب کے لئے بھی دو روٹیاں پکا دیتی تھی اور وہیں اسے بھی کھلا دیتی تھی۔ اب اس سے پردہ کیا کرتی؟ چہرے کے سامنے دوپٹہ لگائے رہتی اور پھر حبیب تو پہلے ہی اسے دیکھ چکا تھا۔

نور حسن کا گھٹنا آہستہ آہستہ ٹھیک ہو رہا تھا۔ عید آ گئی تھی۔ حبیب عید کے لئے مٹھائی اور پھل لے کر آیا۔ سعادت نے بھی اس دن نئے کپڑے پہنے تھے۔ آ کر حبیب نے کہا۔۔۔ "سلام! عید مبارک!"

ہنس کر سعادت نے بھی 'عید مبارک' کہا۔ ایک رکابی میں پلاؤ نکال کر اس نے حبیب کے سامنے رکھا اور کہا۔۔۔ "کھاؤ!"

"نہیں" حبیب نے سر ہلا دیا۔

"ہائے کیوں؟"

"ایسے ہی!"

"کھاؤ نہ' آج تو عید ہے!"

"ہاں' لیکن تم نے ہم سے عید کہاں ملی؟"

"ہائے اللہ" سعادت نے شرما کر کہا' ایسا تھوڑا ہی کہتے ہیں' کھاؤ نہ!"

"جانے دو، دل نہیں ہے تو!"

حبیب اداس ہو گیا۔

اس کے سب احسانات سعادت کی آنکھوں کے سامنے آ گئے۔ کتنا بھلا اور سیدھا آدمی ہے۔ بے بس ہو کر سعادت نے کہا۔۔ "اچھا" اور شرما کر کھڑی ہو گئی۔

حبیب نے عید ملی اور اس کا ماتھا چوم لیا۔ سعادت کے گال سرخ ہو گئے۔ اس نے آنکھیں جھکالیں۔

حبیب نے پوچھا۔۔ "ناراض ہو گئیں کیا؟"

سعادت نے سر ہلا کر نفی میں جواب دیا۔

حبیب نے کہا۔۔۔ "آؤ، ایک ساتھ کھائیں گے۔"

سعادت گھبرائی لیکن حبیب نے اپنے سر کی قسم دے دی تو مان لینا پڑا۔ دونوں نے ایک ہی رکابی میں پلاؤ کھایا۔

حبیب سعادت کو اسپتال سے واپس لاتا تو اس کے یہاں کھانا کھا کر اپنے حصے میں واپس جاتا تھا۔ واپس جانے سے پہلے کچھ دیر اور بیٹھتا تھا، باتیں ہوتی رہتی تھیں۔

سعادت نے پوچھا۔۔۔ "اپنے ہاتھوں چولہا پھونکتے ہو، بیاہ کیوں نہیں کر لیتے؟"

حبیب نے کہا۔۔۔ "اپنا کوئی ہے ہی نہیں۔ غریب آدمی ہوں، میری کون فکر کرتا ہے؟"

سعادت کے دل میں برچھی سی لگی۔ اس دن سے وہ اس سے اور زیادہ محبت سے پیش آنے لگی۔ صبح شام دونوں ایک یا ڈیڑھ گھنٹہ ایک ساتھ بیٹھتے تھے۔

نور حسن کا گھٹنا ٹھیک ہو گیا اور وہ گھر لوٹ آیا۔ سعادت نے اللہ کا شکر ادا کیا اور پیر صاحب کی منت پوری کی۔ حبیب ان کے گھر آتا جاتا رہتا تھا۔ نور حسن جانتا تھا کہ حبیب اچھا آدمی ہے لیکن پڑوس والوں کی چغلیوں کا کیا کرتا؟ اس نے سعادت سے کہا۔۔ "مکان بدل لیں۔" لیکن سعادت نے انکار کر دیا۔ وہ کہیں جانے کو تیار نہیں تھی چاہے اس کے ٹکڑے کر دیے جاتے۔

مایوس ہو کر نور حسن بولا۔۔۔ "ایسی بات ہے تو میں تجھے طلاق دیے دیتا ہوں، پھر

تو جہاں چاہے خاک پھانکنا۔" سعادت نہیں مانی۔ نور حسن کو وہ چھوڑ نہیں سکتی تھی۔

نور حسن کی آنکھیں غصے سے لال ہو گئیں۔ جس لاٹھی کو ٹیک کر وہ چلتا تھا' اسی سے سعادت کو خوب پیٹا۔ سعادت نے مار کھائی لیکن اف تک نہیں کی۔ نور حسن نے دھمکی دی۔۔۔ "اگر اب تو نے دیوار سے جھانک کر بات کی تو میں تجھے قتل کردوں گا اور تیرے اس یار' کو بھی قتل کردوں گا!"

سعادت آنگن میں جاتی تو آنکھیں نیچی کیے رہتی تھی۔ تین دن تک اس نے آنکھیں اوپر نہیں اٹھائیں۔

نور حسن کی ڈیوٹی رات میں ورکشاپ میں لگتی تو زینے پر تالا لگ جاتا تھا اور آدھی رات میں ہی وہ لوٹتا تھا۔ سردیوں کی رات تھی۔ سعادت پرچھتی میں باورچی خانے کا کام نمٹا کر' چولہے میں بجی آنچ کے سامنے بیٹھ کر ہاتھ تاپ رہی تھی۔ قریب ہی لالٹین جل رہی تھی۔ کچھ آہٹ سن کر اس نے پیچھے گھوم کر دیکھا۔ دیوار کے پاس حبیب تھا۔ کاغذ کا ایک مڑا ہوا پرزہ سعادت کی چھت پر ڈال کر وہ چلا گیا۔ سعادت کا کلیجہ دھک دھک کرنے لگا' پرزہ اٹھائے یا نہیں! رہا نہ گیا۔ وہ پرزہ اٹھا لائی۔

سعادت نے پرزہ کھول کر لالٹین کے سامنے رکھ کر پڑھا۔ حبیب نے موٹے موٹے حروف میں لکھا تھا۔۔ "پیاری سعادت' تم بڑی بے رحم ہو! تین دن سے تمہارا چہرہ دیکھنے کو نہیں ملا۔ آنکھیں ترس گئیں۔ رات میں دس بجے تک اوس میں کھڑا تمہاری راہ دیکھتا ہوں لیکن تم دکھائی نہیں دیتیں۔ آج قسم کھائی ہے' تمہارا چہرہ نہیں دیکھ لوں گا تو مجھ پر لقمہ حرام ہے۔ تمہارا غلام ——— حبیب۔"

سعادت جھجکتی ہوئی باہر آئی۔ دیوار پر سے اچک کر اس نے دیکھا——— واقعی حبیب اس کے گھر کی طرف منہ کیے کھڑا تھا۔ سعادت نے اسے پکار کر کہا——— "پاگل ہو' کھانا کیوں نہیں کھایا؟ تم نہیں جانتے میں بے بس ہوں۔ جاؤ' کھانا کھاؤ!"

حبیب نے کہا——— "رہنے دو اس بات کو۔"

"کیوں؟"

"پکایا ہی نہیں۔"

"ٹھہرو' میں لائے دیتی ہوں۔"

"کیوں، میاں کہاں ہیں؟"

"رات کی ڈیوٹی پر گئے ہیں۔"

"وہیں آجاؤں، کچھ دیر تمہارے پاس بیٹھوں گا۔"

سعادت نے سر جھکا کر مان لیا۔

حبیب دیوار پھاند کر سعادت کے گھر میں آگیا۔ سعادت نے کٹوری میں دال اور تشتری میں روٹی لاکر حبیب کے سامنے رکھ دی۔ حبیب نے لقمہ منہ میں رکھا ہی تھا کہ لالٹین کی روشنی میں سعادت کے ماتھے پر چوٹ دیکھ کر اس نے پوچھا۔۔ "یہ کیا؟"

سعادت خاموش رہ گئی۔

"میاں نے مارا ہے؟"

سعادت رونے لگی۔

حبیب نے کھانا چھوڑ دیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ سعادت اپنے ہاتھوں سے لقمے بنا کر اسے کھلانے لگی، لیکن حبیب کو محسوس ہو رہا تھا جیسے ریت چبا رہا ہے۔

دونوں چارپائی پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے، پھر لیٹ گئے۔ انہیں پتہ نہیں چلا کہ وقت کب اور کہاں بیت گیا۔ زینے میں نور حسن کی لکڑی کی آہٹ محسوس کر کے حبیب اٹھ کر بھاگ گیا۔

سعادت کی حالت اور انداز دیکھ کر نور حسن کو کچھ شبہ ہوا۔ اس نے پوچھا۔۔ "حبیب آیا تھا؟"

سعادت رونے لگی۔ نور حسن دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر بیٹھ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا، کیا کرے؟ عورت کو مارنے سے کیا فائدہ؟ اس نے زندگی میں ایک ہی بار سعادت کو پیٹا تھا اور وہی آخری بار تھا۔ وہ در اصل سعادت سے پیار کرتا تھا۔ بیوی کی سچائی اسے قائل کر دیتی تھی لیکن ذلت کی زندگی!

"تو ہی بتا میں کیا کروں سعادت؟" نور حسن نے پوچھا۔

آنکھیں فرش کی طرف جھکا کر سعادت نے جواب دیا۔۔ "یہ زندگی کا روگ ہے، زندگی کے ساتھ جائے گا۔ میں مر جاؤں، میں نے کئی دفعہ سوچا کہ میں کچھ کھا کر

سور ہوں۔ خودکشی سے ڈرتی ہوں، دوزخ کی آگ میں جلوں گی!"

"تو پھر؟" نور حسن نے پوچھا۔

نور حسن کے پیر پکڑ کر سعادت بولی۔۔۔ تم کلمہ پڑھ کر مجھے ذبح کردو! میں بہشت میں چلی جاؤں گی۔ وہاں تمہارا انتظار کروں گی۔"

ایک لمبی سانس لے کر نور حسن چارپائی پر لیٹ گیا۔ وہ چھت کی طرف تکتا رہا۔ رات بیت گئی۔ صبح کی سفیدی آسمان پر چھانے لگی لیکن دن نہیں نکلا تھا۔ وہ انتظار میں تھا۔ اونچے مکانوں کی چھتوں پر سورج کی کرنیں پھیل جانے پر وہ ایک لمبی سانس لے کر اٹھا۔ اس کی آنکھیں پتھر کی طرح ساکت تھیں۔ اس کی آواز دھیمی لیکن پر اعتماد تھی۔ اس نے سعادت کی طرف دیکھے بغیر ہی کہا۔۔۔ "تو نہا دھو کر پاک صاف ہو جا، میں بازار سے ہو کر آتا ہوں۔" وہ زینے سے اتر گیا۔

سعادت بھی آخری فیصلہ کر چکی تھی۔ اٹھ کر نہائی اور عید کے دن کے صاف کپڑے پہنے۔ پھر چھت پر دیوار کے پاس جا کر اس نے حبیب کو پکارا۔ اس کی آواز بے خوف تھی اور آنکھوں میں فتح کی دیوانی مسرت۔

"پیارے آؤ، مل لو!" اس نے خود حبیب کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا، "گھبراؤ نہیں، پھر نہیں ملیں گے۔ ہم جاتے ہیں۔"

"کہاں؟" حبیب نے حیرت سے پوچھا۔

"اسی دنیا میں... جہاں حسد نہیں ہوتا!" حبیب کے سر کو سینے پر رکھ کر اس نے پیار کیا، چوما اور پھر کہا، "آخری سلام!"

سعادت چلی گئی۔ حبیب کچھ دیر سوچتا رہا، پھر گھبرا کر نیچے گلی میں دوڑا۔

نور حسن لوٹ آیا۔ سعادت نے دیوار کے پاس چارپائی پر دھلی ہوئی چادر بچھا دی تھی۔ قرآن شریف سرہانے رکھ کر وہ لیٹ گئی۔ نور حسن نے جیب سے استرہ نکالا۔ وہ کلام پاک پڑھتا جا رہا تھا اور کانپتے ہاتھ سے استرے کی دھار سعادت کے گلے پر پھیرتا جا رہا تھا۔ سعادت کی آنکھیں بند تھیں۔

خون کی دھار بہتی دیکھ کر سعادت نے اپنی انگلی تر کر کے دیوار پر ٹیڑھے میڑھے حروف میں لکھ دیا۔۔۔ حبیب!' اور دوسری بانہہ نور حسن کے گلے میں ڈال کر اس کا

سر جھکا کر ماتھا چوم لیا۔

نیچے زینے میں زور سے کنڈی کھٹکھٹانے کی آواز سنائی دی اور پھر دھکے کے ساتھ کنڈی اکھڑ گئی۔ لمحے بھر میں پولیس اور حبیب سعادت کی چارپائی کے پاس پہنچ گئے۔

سعادت نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ پولیس پوچھ رہی تھی۔۔۔ خون کس نے کیا؟

نور حسن ہاتھ میں استرہ لیے ایک طرف کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ بالکل پیلا پڑ گیا تھا۔

سعادت انگلی سینے پر رکھ کر اپنی طرف اشارہ کیا۔

خون آلود استرہ نور حسن کے ہاتھ میں تھا۔ اس طرف اشارہ کرکے پولیس انسپکٹر نے پوچھا۔۔۔ "استرہ اس کے ہاتھ میں کیسے ہے؟"

سعادت کے ہونٹ ہلے لیکن آواز نہ نکل سکی۔ انسپکٹر نے پوچھا۔۔۔ "کیا استرہ تم سے چھین لیا؟"

سعادت نے آنکھیں جھکا کر ہامی بھری۔ اس کی آنکھیں پھر نہیں کھلیں۔

مکریل

گرمی کا موسم تھا۔ مکریل کی سہانی پہاڑی۔ آب وہوا کی تبدیلی اور چھٹی کے دن گذارنے کے لئے آئے مہذب اور اعلیٰ طبقے کے لوگ چاروں طرف سے کھینچ کر موٹروں کے اڈے پر جمع ہو رہے تھے، جہاں پنجاب سے آنے والی سڑک پر چلنے والی گاڑیاں ٹھہرتی ہیں۔ سورج مغرب میں دیوداروں سے بھری پہاڑی کی چوٹی کے پیچھے سرک گیا تھا۔ سورج کی باقی ماندہ روشنی چوٹی پر اگے ہوئے دیواروں سے ڈھکی آگ کی دیوار کی مانند معلوم ہو رہی تھی۔

اوپر آسمان میں مور کی دم کی شکل میں دور دور تک سندور جیسا رنگ پھیل رہا تھا۔ اس گہرے رنگ کے پردے پر اونچی، کالی چوٹیاں ساکت، خاموش اور سنجیدہ کھڑی تھیں۔ شام کے ملگجے اندھیرے میں پہاڑیوں کے پیچھے کے جنگلوں سے پرندوں کے چہچہانے کا شور گونج رہا تھا۔ ہوا میں چیڑ کی تیکھی بو آرہی تھی۔ ہر طرف جوش تھا، امنگ اور چہل پہل تھی۔ مہذب عورتوں اور مردوں کا ہجوم اپنے ملک کو سربلند کرنے والے شاعر کے استقبال کے لئے بیتاب ہو رہا تھا۔

یوروپ اور امریکہ نے جس کی ذہانت کا لوہا مان لیا، جو ملک کے لئے مایہ ناز ہے، وہی شاعر مکریل، میں صحت بحال کرنے کے لئے آرہا ہے۔ مکریل میں موجود اپنے ملک پر ناز کرنے والے عوام، پلکیں بچھا کر اس کے استقبال کے لئے بے قرار ہو رہے ہیں۔

پہاڑیوں کے سینے پر دھوئیں کی لکیر کی مانند دور سڑک پر دھول کا ایک بادل سا دکھائی دیا۔ عوام کی مضطرب نظریں اور انگلیاں اس طرف اٹھ گئیں۔ لمحے بھر میں دھول کے بادل کو چیرتی ہوئی کالے رنگ کی ایک تیز رفتار چیز دکھائی دی۔ وہ ایک موٹر تھی۔ خوشی کی ترنگ میں عوام کا ہجوم رقص کرنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے موٹر آپہنچی۔

عوام کے جوش وخروش کی وجہ سے موٹر کو دس قدم پیچھے ہی رک جانا پڑا۔۔۔

دیس کے سرتاج کی جے! سرسوتی کے ورد پتر کی جے!' راشٹر کے مکٹ منی کے جے! کے نعروں سے پہاڑیاں گونج اٹھیں۔

موٹر پھولوں سے بھر گئی۔ کافی چہل پہل کے بعد عوام سے گھرا ہوا' گجروں کے بوجھ سے گردن جھکائے' آہستہ آہستہ قدم رکھتا ہوا مکریل کا مہمان موٹر کے اڈے سے چلا۔

جوش سے سرشار عوام استقبالیہ نعروں کے ساتھ شاعر کے آگے پیچھے چل رہے تھے۔ ان خوش قسمت لوگوں کی تعداد بہت کم تھی جو شاعر کا دیدار کرپائے تھے۔ دھول گری' ہوٹل میں دوسری منزل پر شاعر کے ٹھہرنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ وہاں اسے پہنچا کر اور بہت دیر تک اس کے آرام میں رکاوٹ بنے رہنے کے بعد لوگ وہاں سے رخصت ہوئے۔

کنوار کی تیرہویں رات کا چاند پہاڑی علاقے کے صاف ستھرے آسمان میں اٹھ کر اپنی ٹھنڈی روشنی سے آسمان اور زمین کو یکجا کیے ہوئے تھا۔ اس دودھ کی بوچھار میں دھول گری کی سفید برف نما دومنزلہ عمارت چاندی کی دیوار کی طرح چمک رہی تھی۔ ہوٹل کے آنگن کی پھلواری میں خوب چاندنی تھی لیکن شمالی مشرقی حصے میں عمارت کے بازو کی پرچھائیں پڑنے سے اندھیرا تھا۔ بجلی کی روشنی سے چمکتی کھڑکیوں کے شیشوں اور پردوں کے پیچھے سے آنے والی ہلکی آوازوں اور نوکروں کے چلنے پھرنے کی آواز کے علاوہ مکمل خاموشی تھی۔

اس وقت اس تاریک حصے کے نیچے کے کمرے میں رہنے والی ایک دوشیزہ' پھلواری کے اندھیرے حصے میں ایک سرو کے درخت کے قریب کھڑی تھی۔ وہ دوسری منزل کی پھولوں کی جھالر سے آراستہ ان روشن کھڑکیوں پر نظر جمائے ہوئے تھی' جن میں معزز شاعر کو ٹھہرایا گیا تھا۔

وہ دوشیزہ بھی اس کے پرجوش استقبال میں شامل تھی۔ خوش ہو کر اس نے بھی شاعر پر پھول پھینکے تھے' تعریفی نعرے بھی لگائے تھے۔ لیکن بے شمار لوگوں کی بھیڑ میں شاعر کو ایک بار بھی قریب سے دیکھ لینے کا موقع اسے نہیں ملا تھا۔ اسی آرزو کو دل میں لیے وہ اس کھڑکی کی طرف ٹکٹکی لگائے کھڑی تھی۔ شیشوں پر شاعر کے جسم کی

پر چھائیں اسے کبھی کبھی دکھائی دے جاتی تھی۔

صحت بخش غذا کھانے کے بعد شاعر نے برآمدے میں آکر کالے پہاڑوں کے اوپر چاند کی دلکش روشنی کو دیکھا۔ سامنے دھندلی وادی میں بجلی کی روشنی کی طرح پھیلی ہوئی مکریل ندی کی طرف اس کی نظر گئی۔ ندی کے بہاؤ کے شور کو سن کر اس کے جسم میں سنسنی پیدا ہوگئی۔ کئی لمحے تک وہ منہ اٹھائے مبہوت کھڑا رہا۔ مکریل ندی کے بہاؤ کو اس روشن چاندنی میں دیکھنے کی خواہش سے شاعر کی روح بے قرار ہوگئی۔ وہ حسن کے اس دلکش پہلو کو نظرانداز نہیں کرسکا۔

سرو کے درخت کے قریب کھڑی خوشی سے سرشار، دوشیزہ ملک کی اس مشہور اور نامور شخصیت کو امنگ بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ چاند کی دھندلی روشنی میں اتنی دور سے وہ جو کچھ بھی دیکھ پائی، اسی سے مطمئن ہو کر اس نے اپنا سر عقیدت سے جھکا دیا۔ اسی کو اپنی خوش قسمتی سمجھ کر وہ چلنے ہی والی تھی کہ شاعر لمبا اوورکوٹ پہنے، ہاتھ میں چھڑی لیے، دائیں طرف کے زینے سے نیچے آتا ہوا دکھائی دیا۔ لمحے بھر میں شاعر پھلواری میں پہنچ گیا۔

پھلواری میں پہنچنے کے بعد شاعر کو خیال آیا کہ مشہور مکریل ندی کا راستہ تو وہ جانتا ہی نہیں۔ اس لاعلمی کے احساس کے ساتھ شاعر نے دائیں اور بائیں جانب مدد کی امید سے دیکھا۔ قریب ہی کھڑی ایک نوجوان لڑکی کو دیکھ کر مہذب انداز میں ٹوپی کو چھوتے ہوئے، اس نے پوچھا۔۔ "آپ بھی اسی ہوٹل میں ٹھہری ہیں؟"

احترام کے ساتھ سر جھکا کر نوجوان لڑکی نے جواب دیا۔۔ "جی ہاں۔"

شاعر نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ "مکریل ندی کا سب سے قریب راستہ کس طرف سے ہے، یہ شاید آپ جانتی ہوں گی؟"

جوشیلے انداز میں قدم بڑھاتے ہوئے نوجوان لڑکی بولی۔۔ "جی ہاں، یہیں سو قدم پر ندی کا پل ہے۔" اور وہ راستہ دکھانے کے لئے تیار ہوگئی۔

نوجوان لڑکی کے چہرے پر چاند کی روشنی پڑ رہی تھی۔ پتلی بھنوؤں کے نیچے بڑی بڑی آنکھوں میں مکریل کی رونق جھلک رہی تھی۔

شاعر نے جھجکتے ہوئے کہا۔۔ "نہیں نہیں، آپ کو بلاوجہ تکلیف ہوگی۔"

عزت واحترام سے نوجوان لڑکی بولی۔۔۔ "کچھ بھی نہیں۔ یہی تو ہے سامنے!"

اجلی چاندنی میں۔۔۔ سنگ مرمر سے تراشا گیا' خوبصورت' زندہ مجسمہ' وہ نوجوان لڑکی۔۔۔۔ ہمت والی' پراعتماد انداز میں راستہ دکھانے کے لئے چل پڑی۔ حسن کے پرستار شاعر کی نظم کی دنیا کے نازک تاروں میں ارتعاش پیدا ہوگیا۔ خوبصورتی خود بخود اپنا تعارف کرانے لگی۔۔۔ کائنات کی خوبصورتی کی ایک لہر اسے دوسری لہر سے ملانے لے جارہی ہے۔ شاعر نے سوچا۔

سو قدم پر نکریل کا پل تھا۔ دو پہاڑیوں کے تنگ درے میں سے برقی رفتار اور زبردست شور کے ساتھ بہتے پانی کے اوپر تاروں کے رسوں میں جھولتا ہوا ہلکا سا پل لٹک رہا تھا۔ وہ دونوں پل کے اوپر جاکر کھڑے ہوگئے۔ نیچے تیز رفتار کے ساتھ لاکھوں کروڑوں پگھلے ہوئے چاند بہتے چلے جارہے تھے' پہلو کی چٹانوں سے ٹکرا کر وہ جھاگ کی شکل اختیار کرلیتے تھے۔ جھاگوں کے ڈھیر سے نظر ہٹائے بغیر شاعر نے کہا۔۔۔ "خوبصورتی سرشار ہو اٹھی ہے۔" لڑکی کو محسوس ہوا کہ جیسے قدرت بولنے لگی ہے۔

کچھ لمحے بعد شاعر بولا۔۔۔ "جوش کی حالت میں حسن اپنے عروج پر پہنچ جاتا ہے۔ جوش ختم ہوجانے پر صرف کیچڑ باقی رہ جاتی ہے۔"

نوجوان لڑکی محویت کے عالم میں ان الفاظ کو پی رہی تھی۔ شاعر نے کہا۔۔۔ "اپنے مقام آغاز پر نکریل میں نہ اتنی روانی ہوگی اور نہ اتنی تیزی۔ چھوٹے بچے کی طرح بے ہنگم انداز میں وہ چلتی ہوگی' سمندر میں پہنچ کر وہ ضعیفانہ انداز میں سستی اور سنجیدگی اختیار کرلے گی۔"

"اری نکریل! تیرا وقت یہی ہے۔ پھول نہ تو کھلنے سے پہلے اتنا خوبصورت ہوتا ہے اور نہ تب جب اس کی پنکھڑیاں لٹک جاتی ہیں۔ اس کا اصلی وقت وہی ہوتا ہے' جب وہ شگفتہ ہو۔ شہد کی مکھی اسی قوت اس پر نچھاور ہونے کے لئے متوالی ہوجاتی ہے۔" ایک لمبی سانس چھوڑ کر اور آنکھیں جھکا کر شاعر خاموش ہوگیا۔

لمحہ بہ لمحہ وقت گذرنے لگا۔ سرد پہاڑی ہوا کے جھونکے سے شاعر کے ضعیف جسم کو وقت کا خیال آگیا۔ اس نے دیکھا' نکریل کے جھاگوں کی سفیدی' نوجوان لڑکی کے حسن کو نکھار رہی ہے۔ ایک لمحے کے لئے شاعر اس خوش گفتار اور خوش مزاج

نوجوان لڑکی کو بھول کر خاموش لڑکی کی خوبصورتی کو دیکھنے لگا۔ "آج تیرھویں شب کو یہ رونق ہے۔ کل اور بھی چاندنی ہوگی۔ اگر پریشانی نہ ہو تو کل بھی راہ دکھانے آؤ گی؟" اور پھر خود ہی جھجک کر وہ ہنس پڑا۔

نوجوان لڑکی نے پُراعتماد لہجے میں جواب دیا۔۔ "ضرور۔"

سرد ہوا سے شاعر کا جسم ٹھٹھر گیا تھا۔ کمرے کی آرام دہ حرارت سے اس کی جان میں جان آئی۔ بھاری کپڑے اتارنے کے لئے وہ سنگار میز کے سامنے گیا۔ سر سے ٹوپی اتار کر اس نے جیسے ہی نوکر کے ہاتھ میں دی، بجلی کی تیز روشنی کے سامنے آئینے میں دکھائی دیا جیسے کسی معمار نے اس کے سر کے بالوں کو چونے سے بھرے برش سے پوت دیا ہو۔ اس کا چہرہ جھریوں سے بھرا دھوپ میں سکھائے ہوئے پھل کی طرح لگ رہا تھا۔

نوکر کو ہاتھ کے اشارے سے چلے جانے کے لئے کہہ کر وہ دونوں ہاتھوں سے منھ ڈھک کر کرسی پر نڈھال ہو کر گر پڑا۔ بند پلکوں سے اسے دکھائی دیا۔ چاندنی میں سنگ مرمر کی روشن مورتی کا حسین چہرہ جس پر بھرپور جوانی جھلک رہی تھی، مکریل کا پرجوش بہاؤ! شاعر کی روح چیخ اٹھی۔ شباب! شباب!

پشیمانی کی راکھ کے نیچے بجھتی ہوئی چنگاریوں کو امنگ کے پنکھے سے ہوا دے کر شاعر چودھویں کی چاندنی میں مکریل کا رقص دیکھنے کے لئے تیار ہوا۔ گرج دار، مکریل کو شاعر کی جوانی سے کوئی مطلب نہیں تھا۔ اور خاموش، مکریل نے پوجا کے دھوپ دیپ کے دھوئیں میں شاعر کو سر سے پاؤں تک دیکھا ہی نہیں تھا اس لئے وہ دن میں دنیا کی نظر سے بچ کر اپنے کمرے میں ہی پڑا رہا۔ چاندنی زیادہ ہوجانے پر مکریل کے پل پر جانے کے لئے وہ دل میں اندیشے لیے پھلواری میں آیا۔ نوجوان لڑکی انتظار میں کھڑی تھی۔

شاعر نے دھڑکتے دل سے اس کی طرف دیکھا۔ آج شال کے بدلے وہ شتری رنگ کا اوورکوٹ پہنے ہوئی تھی، لیکن اس گورے، خوبصورت خدوخال کو پہچاننے میں غلطی کیسے ہو سکتی تھی!

شاعر نے مسرت بھرے لہجے میں کہا۔۔ "اوہو! آپ نے اپنی بات رکھ لی لیکن

اس سردی میں شاید ایسا نہ کرنے میں ہی زیادہ عقل مندی ہوتی۔ بلاوجہ تکلیف کیوں کیجئے گا؟... آپ آرام کیجئے!"

نوجوان لڑکی نے سر جھکا کر جواب دیا۔۔ "میری خوش قسمتی ہے، آپ کی نیک صحبت حاصل کر رہی ہوں۔"

ہچکچاہٹ کے انداز میں شاعر بولا۔ "وہ کچھ نہیں، وہ کچھ نہیں۔"

پل کے قریب پہنچ کر شاعر نے کہا۔۔ "آپ کی مہربانی ہے کہ آپ میرا ساتھ دے رہی ہیں۔ ۔ ۔ دنیا میں ساتھی بہت بڑی چیز ہے۔ ٹمریل کی طرف اشارہ کرکے بولا "یہ دیکھئے، اس کا کوئی ساتھی نہیں، اس لئے شور مچاتی ہوئی ساتھی کی تلاش میں دوڑتی چلی جارہی ہے۔

خود اپنے انداز گفتگو سے جھینپ کر اور ہنسنے کی ناکام کوشش کرکے اس نے ندی کے بہاؤ پر نظریں جمادیں۔ پھر آنکھیں اوپر اٹھائے بغیر وہ آہستہ آہستہ کہنے لگا۔۔۔ "دنیا کا چکر لگا چکا ہوں۔ ۔ ۔ تصور میں سکون کی تخلیق کرکے جب میں گاتا ہوں، دنیا خوش ہو اٹھتی ہے۔ فرضی غم سے بھری میری روداد کو سن کر دنیا رونے لگتی ہے لیکن میرے ذاتی سکھ دکھ سے دنیا کو کوئی سروکار نہیں۔ میں اکیلا ہوں، میرے سکھ کو بانٹنے والا کوئی نہیں، اس لئے وہ وسیع نہ ہوکر شدید آگ بن جاتا ہے۔ میرے دکھ کی شدت جب ناقابل برداشت ہوجاتی ہے، تب بھی دنیا اسے تفریح کا ہی وسیلہ سمجھتی رہتی ہے۔ میں پنجرے میں بند بلبل ہوں۔ میرا چہکنا ہی دنیا سننا چاہتی ہے۔ میں سکھ سے خوش ہوکر گاتا ہوں یا دکھ سے روتا ہوں اس کی فکر کسی کو نہیں۔ ۔ ۔"

"کاش! زندگی میں میرے سکھ دکھ کا ایک سہارا ہوتا۔ میرا کوئی ساتھی ہوتا! میں اپنے سکھ دکھ کا ایک حصہ اسے دے کر، اس کے تصورات کا حصہ بن سکتا! میں اپنی اس بے مقصد شہرت کو دور پھینک کر دنیا کا ایک ذی روح عنصر بن جاتا۔

شاعر خاموش ہوگیا۔ وقت گذرتا رہا۔ ٹھنڈی ہوا سے جب شاعر کا ضعیف جسم لرزنے لگا تو گہری سانس لے کر اس نے کہا۔۔ "اچھا چلیں۔"

تیزی سے بہتے پانی کی طرف دیکھتے ہوئے نوجوان لڑکی نے لرزتی آواز میں کہا۔۔ "مجھے اپنا ساتھی بنالیجئے۔"

مکرپل کی سنجیدہ گرج میں اپنی طنز بھری ہنسی کو شامل کرتے ہوئے شاعر بولا' "تمہیں؟" اور خاموش ہو گیا۔

جسم لرزنے کی وجہ سے پل کی ریلنگ کا سہارا لیتے ہوئے نوجوان لڑکی نے شرمسار لہجے میں کہا' "میں اگرچہ حقیر سی چیز ہوں۔۔۔"

"نہ' نہ یہ بات نہیں" شاعر اچانک رک کر بولا' "الٹی بات۔۔۔ ہاں' اب چلیں۔"

پھلواری میں پہنچ کر شاعر نے کہا۔ "کل۔۔۔" لیکن بات پوری کیے بغیر ہی وہ چلا گیا۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر آئینے کے سامنے نظر نہ کرنے کی وہ جتنی کوشش کرنے لگا' اس کے چہرے کا عکس اتنا ہی صاف اس کے سامنے آجاتا تھا۔ بڑی بے چینی سے شاعر نے وہ دن کاٹا۔ اس نے صبح ہی ایک تولیہ آئینے پر ڈال دیا اور دن بھر کہیں نہیں نکلا۔

دن بھر سوچ کر اور نہ جانے کیا فیصلہ کر کے شام کے وقت شاعر پھر سے تیار ہو کر پھلواری میں گیا۔ شطرنجی رنگ کے کوٹ میں سنگ مرمر کی وہ خوبصورت مورتی سامنے کھڑی تھی۔ شاعر کے دل کی تمام الجھنیں لمحہ بھر میں غائب ہو گئیں۔ شاعر نے ہنس کر کہا۔ "اس سردی میں۔۔۔؟ ملک' وقت اور کردار دیکھ کر ہی وعدے کی تکمیل کی جاتی ہے۔" پورنیما کی روشنی میں شاعر نے دیکھا' اس کی بات کے جواب میں نوجوان لڑکی کے چہرے پر اطمینان اور خود اعتمادی کی مسکراہٹ آگئی۔ پل پر پہنچ کر ہنستے ہوئے شاعر بولا' "تو ساتھ دینے کی بات سچ مچ ٹھیک تھی؟"

نوجوان لڑکی نے جواب دیا۔ "اس میں مذاق کی تو کوئی بات نہیں۔"

شاعر نے نوجوان لڑکی کی طرف دیکھ کر ہمت کر کے پوچھا۔ "تو ضرور ساتھ دو گی؟"

"ہاں۔" نوجوان لڑکی نے بغیر سر اٹھائے ہامی بھری۔

"ہر حالت میں' ہمیشہ؟"

سر جھکا کر لڑکی نے اعتماد کے ساتھ جواب دیا--- "ہاں"

شاعر بے یقینی سے ہنس پڑا۔ "تو آؤ" اس نے کہا۔ "یہیں ساتھ دو مکریل کے بطن میں؟"

"ہاں' یہیں سہی۔" نوجوان لڑکی نے بے خوف انداز میں نظر اٹھا کر کہا۔

ہنسی روک کر شاعر نے کہا۔ "اچھا تو تیار ہو جاؤ۔ ایک دو تین!" ہنس کر شاعر اپنا ہاتھ نوجوان لڑکی کے کندھے پر رکھنا چاہتا تھا۔ اس نے دیکھا' پل کی ریلنگ کے اوپر سے لڑکی کا جسم نیچے مکریل کے تیز رفتار بہاؤ کی طرف جا رہا تھا۔

خوف سے اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ ہاتھ پھیلا کر اسے پکڑنے کی ناکام کوشش میں وہ بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھال سکا۔

مکریل کی زوردار گرج میں ایک دفعہ سنائی دیا--- چھپ' اور پھر صرف ندی کی سنجیدہ گرج.....

شاعر کو ایسا محسوس ہوا۔ جیسے مکریل کی لہریں مسلسل اسے آؤ! آؤ!' کہہ کر بلا رہی ہیں۔ وہ بے ہوشی کے عالم میں پل کی ریلنگ پکڑے کھڑا رہا۔ جب اس کی پشت سے چل کر چاند کی روشنی اس کے چہرے پر پڑنے لگی تو پاگلوں کی طرح لڑکھڑاتا ہوا وہ اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

کافی دیر تک وہ آئینے کے سامنے ساکت کھڑا رہا۔ پھر ہاتھ کی لکڑی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اس نے تڑاتڑ آئینے پر متعدد ضرب لگائیں اور پھر سانس پھولنے کی وجہ سے وہ ہانپتا ہوا آئینے کے سامنے رکھی کرسی پر دھم سے گر پڑا۔

صبح کو حجامت کے لئے گرم پانی لانے والے نوکر نے دیکھا۔ شاعر آئینے کے سامنے کرسی پر بے حرکت بیٹھا ہے لیکن آئینہ چور چور ہو گیا ہے اور اس کے بیچ کا حصہ غائب ہے۔ چوکھٹے میں پھنسے آئینے کے لمبے لمبے بھالے نما ٹکڑے جیسے دانت نکال کر شاعر کے بے جان جسم کو ڈرا رہے ہیں۔

شاعر کا چہرہ کاغذ کی طرح پیلا اور جسم کاٹھ کی طرح اکڑ گیا تھا۔ اس کی آنکھیں اب بھی کھلی تھیں لیکن ان میں سے زندگی نہیں بلکہ موت جھانک رہی تھی۔ بعد میں

معلوم ہوا، رات کے پچھلے پہر میں شاعر کے کمرے سے کئی بار "آتا ہوں، آتا ہوں" کی آواز سنائی دی تھی۔

محبت کا صلہ

ان دنوں پیشاور سے چرس کی آمد خفیہ طور پر اتنی خطرناک مقدار میں ہو رہی تھی کہ ایکسائز کے ساتھ پولیس والے بھی پریشان تھے۔ نہ دن میں آرام تھا' نہ رات میں چین۔ خفیہ طور پر نشیلی اشیاء کی تجارت کرنے والوں کو پکڑنے میں عقل کے استعمال کی جتنی گنجائش ہے اتنی دوسرے جرائم میں نہیں۔ کس چیز کے اندر کس شکل میں چرس ہے یا نہیں' یہ نہیں کہا جاسکتا۔

میں اس روز لاہور کے بڑے اسٹیشن کے سامنے ٹہلتا ہوا تیز نظر سے پیشاور ایکسپریس کے مسافروں کا جائزہ لے رہا تھا۔ لمبی چادر میں سر سے پیر تک لپٹی ہوئی ایک بڑھیا' سڑک کے بیچوں بیچ بھیڑ کو چیرتی ہوئی کچھ پریشان حالت میں میرے سامنے سے گذری۔ اس عورت کو دیکھ کر مجھے کچھ شک ہوا۔

اتنے دن پولیس میں کام کرکے یہی سیکھا تھا کہ جہاں شک کے لئے بظاہر کوئی وجہ نہ بھی ہو' وہاں بھی شک کرنا چاہئے۔ کتنی ہی برقع پوش' مہذب گھرانوں کی عورتوں کے اسباب سے متعدد بار سیروں چرس نکال چکا تھا۔ کسی گھاگھ نے اسی بڑھیا کے ذریعہ دو چار سیر چرس نکالنے کی ترکیب سوچی ہو' کیا پتہ!

"اے مائی! او بڑھیا! ادھر آؤ!" میں نے اسے پکارا۔

ایک ہاتھ میں چھوٹی سی گٹھری کو سینے سے لگائے اور دوسرے ہاتھ سے چادر سنبھالتے ہوئے ایک بار میری طرف دیکھ کر' میری آواز کو ان سنی کرکے' وہ اپنی راہ چلتی گئی۔

شک پختہ ہونے کی وجہ تھی۔ میں نے ذرا ڈانٹ کر کہا۔ "ادھر آؤ۔" ایسا جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہیں۔ صرف ایک دفعہ میری طرف دیکھ کر وہ چلتی رہی۔ میرے ساتھ موجود کانسٹیبل نے آگے بڑھ کر اسے روک لیا۔

اس کے ہاتھ میں موجود چھوٹی پوٹلی کی طرف اشارہ کر کے میں نے پوچھا۔۔ "اس میں کیا ہے؟" بے چینی میں اپنی انگلیاں نچا کر غیر واضح الفاظ میں اس نے کچھ کہا' جو میری سمجھ میں نہیں آسکا۔ اس کی چالاکی کا اندازہ لگاتے ہوئے میں نے پشتو میں اپنا سوال دہرایا۔ گھبراہٹ کی حالت میں اس نے گڑگڑا کر جو جواب دیا' میں اسے سمجھ نہیں سکا۔۔

پریشان تھا' یہ عورت پاگل بن رہی ہے یا واقعی پشتو اور پنجابی نہیں جانتی۔ ہو سکتا ہے اور کوئی تیسری ہی زبان بولتی یا سمجھتی ہو۔ میرے ساتھ والے سپاہی نے اسے زبردستی سمجھانے کی غرض سے کافی اونچی آواز میں ڈانٹ کر پوچھا۔۔ "اس میں کیا ہے؟" لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

آخر یہ عورت اگر اتنی ہی کم عقل ہے تو اکیلی لاہور جیسی جگہ میں پیشاور ایکسپریس سے اور پھر رات کے وقت آئی کیسے؟ یہاں اس کا کیا کام ہے؟ میں اسی کشمکش میں پھنس گیا تھا۔ اس وقت قاسم۔۔ ساتھ والے سپاہی' نے دونوں ہاتھوں سے اشارہ کر کے کہا۔۔ "ہتی کشمیر ہتی؟"

عورت نے لمبی سانس لے کر ہامی بھری۔ یہ تو سمجھ میں آیا کہ یہ عورت کشمیری ہے لیکن پھر اس کی گٹھری میں چرس ہو سکتی ہے یا اس کے پیچھے کوئی اور راز ہے۔ اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ یہ عورت دن رات لاہور آنے جانے والے بردہ فروش کشمیریوں کے گروں میں سے نہیں ہے۔ جس طرح وہ اپنی گٹھری کو چھونے نہیں دے رہی تھی' شک کے علاوہ کوئی راستہ نہیں تھا۔ قاسم نے کشمیریوں کے علامتی انداز کی نقل کرتے ہوئے پوچھا۔۔ "کتھے جاندا؟" (کہاں جا رہی ہو؟) پھر جواب ندارد۔

قاسم نے کہا۔۔ "حضور' یہ عورت بدمعاش ہے' مکاری کر رہی ہے۔"

کچھ سوچ کر میں نے حکم دیا۔۔ "ایک تانگے پر بیٹھا کر اسے بڑی کوتوالی لے چلو۔"

بڑی ہائے توبہ کے بعد وہ تانگے میں بیٹھی۔

پیر حسین کانسٹیبل کشمیری ہے۔ سید ہونے کی وجہ سے اس کے روحانی اثر کی انتہا نہیں ہے۔ اسے بلا کر میں نے اس عورت سے بات کرنے کو کہا۔ پیر حسین نے

قریب جاکر تسلی دینے کے انداز میں عورت کو مخاطب کرکے اپنی مشکل زبان میں دو جملے کہے۔ عورت کا خوف دور ہوگیا۔ وہ اس کے نزدیک آگئی اور آنکھوں پر اپنی میلی چادر کا کونا رکھ کر سسکتے ہوئے بہت کچھ کہہ گئی۔

پیر حسین نے بتایا کہ وہ اپنے شوہر کا پتہ پوچھ رہی ہے۔ اسی کو ڈھونڈنے لاہور آئی ہے۔ کئی برس ہوئے وہ کمائی کرنے لاہور آیا تھا لیکن لوٹا نہیں۔ کئی دفعہ خط لکھنے پر بھی وہ نہیں لوٹا۔ اسی کو واپس لے جانے کے لئے وہ آئی ہے اور لے کر ہی جائے گی۔

میں نے پوچھا۔ "اس کا مرد تو دیکھا جائے گا' پہلے اس کی گٹھری کھلواؤ!"

پیر حسین کے کہنے پر اس نے کچھ جھجکتے ہوئے گٹھری کھول دی۔ پیوند لگی چادر کے ایک کونے میں دو ایک میلے کپڑوں کے ٹکڑوں میں کئی دن کی باسی مکا کی روٹی کا چورا تھا۔ کشمیری طرز کی ایک پرانی مردانی واسکٹ بھی تھی' جس میں جگہ جگہ بے ڈھنگے پھول پتی کی کشمیری صنعت کی توہین کرنے والی سوزن کاری تھی۔ کانچ کے گول گول ٹکڑے اس میں جڑے تھے۔ اس واسکٹ کی تہیں اس نے بڑی عاجزی سے کھولیں جسے وہ اسے کسی کو دکھانا نہیں چاہتی تھی۔ اس کے علاوہ ایک چھرا بھی تھا جو اس نے پیر حسین کے بہت اطمینان دلانے پر اپنے کپڑوں کے اندر سے نکالا۔ چھرا اس کے پاس کیوں ہے' کافی پوچھنے پر بھی اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ منہ موڑ کر کہہ دیا۔ "ایسے ہی۔"

ایک کشمیرن جس نے کبھی اپنے گاؤں سے باہر قدم نہیں رکھا' اکیلی لاہور آتی ہے۔ وہ کہتی ہے' اپنے آدمی کو ڈھونڈنے آئی ہے لیکن کسی بھی آدمی یا جگہ کا پتہ وہ نہیں جانتی۔ ایک مردانی واسکٹ اس کے پاس ہے' جسے وہ چھپانا چاہتی ہے اور اس کے پاس ہے ایک چھرا۔ معاملے کے پیچیدہ ہونے میں شک ہی کیا تھا؟

پیر حسین سے میں نے کہا۔ "عورت چالاک معلوم ہوتی ہے اور تعجب نہیں اگر یہ کسی سنگین معاملے میں ملوث ہو۔ اس سے اس کا راز معلوم کرو۔"

عورت کو پیر حسین کے سپرد کرکے میں دوسرے کاغذات دیکھنے لگا۔ بیچ بیچ میں اس کی طرف بھی دیکھ لیتا تھا۔ پیر حسین کے کافی دیر تک سمجھانے کے بعد عورت نے

آنسو پونچھتے ہوئے آہستہ آہستہ اپنی بات کہنی شروع کی۔ کچھ دیر بعد وہ خوب سسک سسک کر رونے لگی۔ پیر حسین اسے تسلی دیتا رہا۔ ایسی حالت میں بیچ میں دخل دینا میں نے مناسب نہیں سمجھا۔ پیر حسین نے آکر معاملہ سمجھایا۔

سری نگر سے تیس پینتیس میل دور' بیری ناگ کے آس پاس' اس عورت کا گھر ہے۔ وہاں سے سوا دو سو میل پیدل چل کر وہ جموں پہنچی اور اسٹیشن بھٹکتی ہوئی وہ آخر اپنے شوہر کی تلاش میں پیشاور ایکسپریس سے لاہور پہنچی ہے۔ شوہر کے بارے میں پوچھنے پر وہ کہتی ہے کہ وہ لاہور میں ہے لیکن اس کا ٹھکانا نہیں جانتی۔

"پتہ نہیں جانتی تو کیا مرد کو اپنے سر میں ڈھونڈے گی!" میں نے کہا' "یا تو وہ اپنے شوہر کا پتہ جانتی ہے یا اسے ڈھونڈنے نہیں آئی ہے۔" پیر حسین کے ذریعہ اپنی ہمدردی کا یقین دلا کر' ڈیڑھ گھنٹے تک اس سے معلومات کرنے کے بعد جو سمجھ پایا' اس کا خلاصہ یہ ہے۔۔

تیس برس ہو گئے' میرا شوہر فجا گاؤں کے دوسرے جوان مردوں کے ساتھ مزدوری کر کے روپیہ کمانے لاہور آیا تھا۔ اسی وقت میں نے کہا تھا۔۔ ہمارے یہاں جو کچھ بھی ہے' پیر فقیر کا دیا بہت ہے۔ آٹھ دس بھینسیں ہیں' دس بارہ گھماؤ زمین ہے۔ سیب' اخروٹ اور شہتوت کے پیڑ ہیں۔ محنت کرنے سے اسی میں سب کچھ ہو سکتا ہے۔ میری ساس۔ اس کی ماں نے بھی سمجھایا۔ میں اس وقت چھوٹی تھی۔ میری عمر بیس سال سے بھی کم تھی۔ اس نے ڈانٹ ڈپٹ کر چپ کرا دیا اور کہا۔۔ سات مہینے میں سیبوں میں پھر سے پھول آتے آتے وہ لوٹ آئے گا۔ لاہور میں چاندی پیروں تلے روندی جاتی ہے۔ سب لوگ جاتے ہیں' میں کیوں نہیں جاؤں! میں روتی رہی' وہ چلا گیا۔ ساس اور میں سب کام کرتے تھے' کھیت میں ہل ہمیں ہی چلانا پڑتا تھا۔ ساس ناراض ہوتی تو کہتی تھی۔ "ناکارہ لڑکے سے لڑکا نہ ہونا اچھا۔"

ایک سال گذر گیا' دو گذرے' تین گذرے۔ میں روزانہ روتی تھی۔ پردیس گئے لوگ برف گلنے پگھلنے پر گھر واپس آجاتے تھے لیکن میرا مرد نہیں آیا۔ دو برس اور گذر گئے۔ ہابلا کا مالک رحمان لاہور سے واپس آیا۔ وہ فجا کا ایک خط لایا۔ لکھا تھا۔۔ "مجھے پولیس نے جھوٹ موٹ پکڑ لیا ہے۔ تھوڑا روپیہ بھیج دو تو میں لوٹ آؤں۔"

"ساس اور میں بہت روئے۔ دو بھینسیں بیچ کر ہم نے چالیس روپے بھیج دیے۔ ساس سے چھپ کر ڈاک خانے کے منشی سے ایک خط میں نے لکھوادیا کہ جلدی آجا' ماں سخت ناراض ہے اور سخت بیمار ہے۔ میں روتی رہتی ہوں۔ مجھے بہت ڈر لگتا ہے تو جلدی آجا۔ مجھے ساس گالی دیتی ہے کہ میں نے تجھے بھیج دیا ہے یا تو مجھ سے لڑ کر چلا گیا اور اب اکیلے کام نہیں ہوتا۔ تیری ماں تھک گئی ہے اور تیرے بغیر تکلیف ہے۔"

"میں نے پوچھا۔۔ "روپے رسید اور خط کا جواب آیا؟"

اس نے بتایا۔۔ "روپے کی رسید آئی تھی' خط کا جواب نہیں آیا۔"

مجھے یقین دلانے کے لئے اس نے مردانی واسکٹ کی جیب سے تین رسیدیں نکالیں۔ تاریخ کے حساب سے ان میں پہلی رسید پر اکتوبر ۱۹۰۶ء' بھاٹی دروازہ' لاہور کے ڈاک خانے کی مہر تھی۔ یہ چالیس روپے کا منی آرڈر تھا۔ پیچھے ایک انگوٹھے کا نشان تھا۔ اس کے قریب اردو میں لکھا تھا۔۔ فجا' گواہ کے بھی دستخط تھے۔ رسیدیں دے کر اس نے پھر قصہ شروع کیا۔

"سال پر سال گذرنے لگے' فجا نہیں لوٹا۔ جو لوگ لاہور' امرتسر کمائی کرنے جاتے تھے۔' ان سے کبھی کبھی فجا کی خبر ملتی تھی۔ کبھی سنتی تھی' پولیس نے پکڑ لیا ہے۔ کبھی سنتی نوکر ہوگیا ہے کبھی سنتی دکان کرکے امیر ہوگیا ہے۔ ساس بیمار ہوکر مرگئی۔ میں اکیلی رہ گئی۔

"فارو کا بیاہ مجھ سے پیچھے ہوا تھا۔ اس کے دو پٹھورے جیسے بیٹے ہوگئے اور لڑکی گھر کا کام کاج کرنے لائق ہوگئی۔ ہابلا کی دونوں لڑکیوں کے یہاں بچے ہوگئے۔ ماچو' کی گھر والی مرگئی۔ اس سے بھی ایک تگڑا لڑکا اور ایک لڑکی ہوگئی تھی۔"

"نو برس بعد لاہور سے ایک آدمی خط لایا' لکھا تھا۔۔ میں بیمار ہوگیا ہوں۔ خرچ پاس نہیں' بڑی تکلیف ہے۔ کسی طرح خرچ بھیج دو' میں آجاؤں گا۔ میں نے پھر ایک بھینس بیچ دی' دو اخروٹ کے پیڑ پاگسو کو آدھے دام میں دئے اور اسے پھر چالیس روپے' ڈاک کے منشی سے بھجوائے اور خط بھی لکھوا دیا کہ اب میں اکیلی رہ گئی ہوں (تیری ماں بھی مرگئی ہے۔ سارا گاؤں میرا دشمن ہورہا ہے۔ جس کا مرد نہیں' اس کا کیا

سہارا؟ کوئی کھیت کاٹ کر لے جاتا ہے، کوئی اخروٹ جھاڑ کر لے جاتا ہے۔ ہابلا نے شہتوتوں پر سے سب کیڑے چرا لیے ہیں۔ اور دیکھو، سب کے دو دو تین تین بچے ہیں، گھر آتے جاتے ہیں، کام کرتے ہیں۔ میرا کوئی نہیں۔ اب مجھے ڈر لگتا ہے۔ میں بیمار ہو جاؤں گی۔ مجھے تیری کمائی نہیں چاہیے۔ بس تو آجا، ضرور آجا۔"

"پھر خط آیا کہ تو گھبرا مت، میں ضرور آؤں گا اور لاہور میں سکونت اختیار کروں گا۔ تجھے بھی لاہور لے آؤں گا، یہاں بڑا آرام ہے۔ تو فکر مت کرنا۔ تجھے گہنے نبوا دوں گا۔ میں نے پھر لکھوایا کہ تو آجا۔ اپنے گھر میں بسنا ٹھیک ہے۔ پرائی جگہ کے پیر نہیں ہوتے۔ کھیتی اور جانوروں کا بہت نقصان ہو گیا لیکن تو آئے گا تو سب ہو جائے گا۔ میں ابھی جوان ہوں، ابھی ہاتھ پیر چلتے ہیں۔ تیرے لڑکے ہوں گے تو سب ہو گا۔ کوئی نہیں آیا، پھر خط بھی نہیں آیا۔"

"میں کئی دفعہ بیمار پڑی۔ گھر میں کوئی نہیں تھا۔ تب ماچو پانی بھر کر دے جاتا تھا اور بھینسوں کا دودھ نکال کر لے جاتا تھا۔ چھ برس اور گذر گئے تو ماچو نے کہا۔۔ "تو بوڑھی ہو گئی، جوانی میں ہاتھ پیر چلتے تھے، کام کاج کر لیتی تھی۔ اب پانچ سات برس کی اور بات ہے، پھر تو ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ جائیں گے تو کیا کرے گی؟ میرے ساتھ نکاح کر لے۔ میرا لڑکا ہے، دونوں کو کما کر کھلائے گا۔ تیرے بھی بال بچہ ہو جائے گا تو اچھا ہے نہیں تو کیا کرے گی؟۔۔۔ میں رونے لگی۔" وہ اس وقت بھی رو رہی تھی۔

"میں نے کہا۔۔ نہیں فجا میرا مرد ہے، وہ آئے گا تب ہی میرا گھر بسے گا۔ اب وہ آجائے گا۔"

"تین برس بعد پھر فجا کا خط آیا کہ کسی مہاجن کا قرض نہیں دیا، قید ہو گیا ہے۔ تیس روپے بھیج دو، فوراً آجائے گا۔ اس بار میں نے ایک بیگھ زمین پر قرض لے کر ڈاک خانے سے روپیہ بھیج دیا اور لکھوایا کہ تیرے بغیر سب برباد ہو رہا ہے اور یہ کہ تمام عمر پردیس میں بتائی، اب تو آکر گھر کرو۔ اور سب لوگوں کے لڑکے گھر پر کما رہے ہیں اور میں بوڑھی اکیلی مر رہی ہوں۔"

"کوئی نہیں آیا۔ خط بھی نہیں آیا۔ سنا ہے کہ اس نے اور بیاہ کر لیا۔ میں نے اسے خط لکھوایا۔۔۔ تو نے برا کیا، خیر تو نے اچھا کیا۔ تو آجا اور اس کو بھی لے آ۔ میں

دونوں کی خدمت کروں گی۔ روٹی کا ٹکڑا دو وقت مجھے دے دینا۔ فورا آجا۔"

"کوئی نہیں آیا۔ میں تھک گئی۔ چوپایوں اور کھیت کا کام اب نہیں ہوتا۔ میرا کیا ہے، میں تو ختم ہو گئی۔ جس کے لئے اتنا سہا، اسے لینے آئی ہوں۔ اسے ڈھونڈ کر پوچھوں گی۔ بتا تو گھر کیوں نہیں آیا؟ گھر کو برباد کیا، اب تو چل اور کچھ نہیں، ہمارے بال بچے نہ سہی، ہم چار دن ساتھ رہیں گے۔ جو پہلے ختم ہو گا، دوسرا اس کو مٹی دے گا۔"

وہ پھپھک پھپھک کر رونے لگی۔ میں اس کی زندگی کے ساتھ تقدیر کے اس مذاق کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس سے پوچھا۔۔ "کیا یہ واسکٹ فجا کی ہے؟ اس نے سر ہلا کر ہامی بھری۔ اتنے بڑے فریب کے بعد بھی وہ اس کی واسکٹ ساتھ لیے ہوئے تھی۔ شاید بڑے چاؤ سے اپنے دولہا کو سجا کر ساتھ لے جانا چاہتی ہے۔

میں نے پوچھا۔۔ "یہ چھرا کس کا ہے؟"

آنکھیں پونچھ کر اس نے کہا۔۔ "میرا۔"

میرے پوچھنے پر کہ چھرے کا وہ کیا کرے گی، وہ خاموش ہو گئی۔

کچھ دیر ٹھہر کر پیر حسین نے تسلی دیتے ہوئے سوال کو دہرایا۔

اس نے بگڑ کر جواب دیا۔۔۔ "اس نے میری تمام عمر برباد کر دی، میں نے اس کے لئے سب کچھ کیا، اس کے لئے میں بانجھ بنی۔ اب وہ میرے ساتھ نہیں جائے گا تو میں اسے قتل کر دوں گی!۔۔۔"

یہ سن کر میں کانپ گیا لیکن غصہ یا نفرت کا اظہار نہیں کر سکا۔ پولیس اسٹیشن میں بیٹھ کر جو شخص خون کرنے کا ارادہ ظاہر کرے...

پیر حسین نے وہ چھرا اٹھا کر صندوق میں بند کر دیا۔

فجا کی تلاش شروع ہوئی۔ شہر کے دس نمبری بدمعاشوں کا رجسٹر دیکھا گیا۔ اس میں کئی فجا کئی شکل میں موجود تھے۔ فجا، فیضو، فضلو، فضلے خان۔ ان میں رفیعہ کا فجا کون ہے، یہ معلوم کرنے کے لئے اس سے اس کے شوہر کا حلیہ پوچھا گیا۔ اس نے بتایا۔

دیکھنے میں بڑا اچھا ہے، جوان ہے، بھلی بھلی داڑھی، مونچھ ہے، ایک چوٹ کا

نشان دائیں نتھنے پر ہے۔"

دائیں نتھنے پر چوٹ کا نشان! رجسٹر سے معلوم ہوا' وہ ہیرا منڈی والا فجا ہے۔ تلاش کرنے پر معلوم ہوا۔ وہ ضمانت نہ دے پانے کی وجہ سے دفعہ ۱۰۹ میں لاہور سینٹرل جیل میں سزا کاٹ رہا ہے۔ یہ بات رفیعہ سے کہنے کی نہیں تھی۔

شاہ صاحب سے مل کر سفارش کرا کے میاں یعقوب خان سے فجا کا مچلکا داخل کروا دیا۔ فجا کو الگ بلا کر اور ڈانٹ پھٹکار کر گھر جا کر آرام سے رہنے کے لئے تیار کرلیا۔

جب اسے لاکر رفیعہ کے سامنے کھڑا کیا تو وہ دونوں ایک دوسرے کو پہچان نہ سکے۔

غالباً رفیعہ تیئس چوبیس برس کے ہٹے کٹے جوان فجا کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ پیر حسین نے جب دونوں کا تعارف کرایا تو کافی دیر تک رفیعہ کسی مجروح شخص کی طرح دانتوں تلے انگلی دبائے فجا کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکل سکا۔

فجا کے سفید بال' جھریوں سے بھرے چہرے' بے نور آنکھیں اور بغیر دانتوں کے چہرے کو دیکھ کر وہ یقین نہیں کر سکی کہ وہی اس کا فجا ہے' جس کے لئے اس نے عمر بھر تپسیا کی ہے۔

کافی گہری سانس لے کر' منہ سے کوئی بھی لفظ بولے بغیر' سر ہلا کر ایک طرف ہٹ گئی اور چادر میں منہ چھپا کر وہ نہ جانے کتنی دیر تک روتی رہی۔

کسی کو اس سے کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ شام کو پیر حسین نے اسے سمجھایا کہ فجا کو لے کر گھر چلی جا۔

اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ پھنکار کر اس نے کہا۔۔ "اس دھوکے باز' دغاباز' ظالم نے مجھے مٹی میں ملا دیا۔ میں اس کا منہ بھی نہیں دیکھوں گی۔"

وہ اس واسکٹ کو وہیں چھوڑ کر' اپنی چادر اٹھا کر' اسٹیشن کی طرف چل دی۔ اس وقت کچھ کہنے کا موقع نہیں تھا' لیکن ایک احساس ضرور تھا۔ یہ ہے پیار کی خاطر تیس برس کی ریاضت کا صلہ۔۔۔ محبت کا صلہ!

دکھ

جسے انسان سب سے زیادہ اپنا سمجھ کر بھروسا کرتا ہے اگر اسی کی طرف سے فریب اور توہین کا سامنا کرنا پڑے تو دل پژمردہ ہوجاتا ہے۔ یکایک مرجانے کی خواہش ہونے لگتی ہے۔ اس کیفیت کو الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں۔

دلیپ نے ہیما کو مکمل آزادی دی تھی۔ وہ اس کی کتنی عزت کرتا تھا۔ دل کی گہرائیوں سے اس کو چاہتا تھا۔ بہت سے لوگ اسے حد سے تجاوز، کہیں گے۔ اس پر بھی ہیما کو مطمئن نہ کرسکا اور ہیما صرف دلیپ کے، اس کی سہیلی کے ساتھ دوسرے شو میں سینما دیکھ آنے کی وجہ سے، رات بھر ناراض رہ کر، صبح اٹھتے ہی ماں کے گھر چلی گئی، تب دلیپ کے غم وغصہ کی انتہا نہ رہی۔

ستمبر کا آخری ہفتہ تھا۔ برسات کا موسم بیت جانے کے بعد بھی دن بھر بارش ہوتی رہی۔ دلیپ بیٹھک کی کھڑکی اور دروازوں پر پردے ڈالے بیٹھا رہا۔ پژمردگی اور مایوسی کی وجہ سے وقت خود تکلیف دہ بن جاتا ہے۔ ایک ایک منٹ گذارنا مشکل ہوجاتا ہے۔ وقت گذرتا نہ دیکھ کر دلیپ جھنجلا کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی وقت زینے پر چھوٹے بھائی کے دھم دھم کرکے اترنے کی آواز سنائی دی۔ خواب آلود آنکھوں کو ذرا کھول کر اس نے دروازے کی طرف دیکھا۔

چھوٹے بھائی نے پردے کو ہٹا کر پوچھا۔ "بھائی جی، آپ کو کہیں جانا نہ ہو تو میں موٹر سائیکل لے جاؤں؟"

اس مداخلت سے جلدی چھٹکارا پانے کے لئے دلیپ نے ہاتھ کے اشارے سے اسے اجازت دے دی اور آنکھیں بند کرلیں۔

دیوار پر ٹنگے کلاک نے کمرے میں گونج پیدا کرتے ہوئے چھ بجنے کی اطلاع دی۔ دلیپ نے سوچا۔۔ کیا وہ یوں ہی قید میں پڑا رہے گا؟ اٹھ کر کھڑکی کا پردہ ہٹا کر دیکھا،

بارش رک گئی تھی۔ اب اسے دوسرا ڈر محسوس ہوا کہ کوئی آکر بیٹھ جائے گا اور ناپسندیدہ ذکر شروع کردے گا۔

وہ اٹھا۔ بھائی کی سائیکل لے کر گلی کی کیچڑ سے بچتا ہوا بلکہ اس سے بھی زیادہ لوگوں کی نگاہوں سے بچتا ہوا پچھلے دروازے سے باہر نکل کر، شہر کی پرانی فصیل کے باغ سے ہوتا ہوا منٹوپارک پہنچ گیا۔ اس لمبے چوڑے میدان میں پانی سے بھری گھاس پر ہوا کے تیز جھونکوں میں ٹھہرنے کے لئے اس وقت کون آتا؟

اس تنہائی میں ایک بینچ کے سہارے سائیکل کھڑی کرکے وہ بیٹھ گیا۔ سر سے ٹوپی اتار کر بینچ پر رکھ دی۔ ٹھنڈک کی وجہ سے دماغ کی بے چینی کچھ کم ہوگئی۔

خیال آیا کہ اگر سردی لگ جانے سے وہ بیمار ہوجائے اور اس کی حالت خراب ہوجائے تو وہ خاموش شہید کی طرح اپنی تکلیف کو اکیلا ہی سہے گا۔ کسی کو اپنی تکلیف کا حصہ دار بننے کے لئے نہیں بلائے گا۔ جو اس پر یقین نہیں کرسکتا، اسے کیا حق ہے کہ اس کی تکلیف میں شریک ہونے آئے۔ ایک دن موت دبے پاؤں آئے گی، اس کے دکھ کی وجہ، دل کی حالت اور بیماری کو لے کر اس کے سر پر تسلی کا ہاتھ رکھ کر اسے پرسکون کرکے چلی جائے گی۔ اس دن جو لوگ رونے کے لئے بیٹھیں گے، ان میں ہیما بھی ہوگی۔ اس دن اسے کھوکر اپنے نقصان کا اندازہ لگاکر ہیما اپنے برتاؤ کے لئے پچھتائے گی۔ یہی بدلہ ہوگا دلیپ کے خاموشی سے برداشت کرنے کا۔ یہ فیصلہ کرکے اس نے اطمینان سے گہری سانس لی۔ وہ پہلو بدل کر ٹھنڈی ہوا کھانے کے لئے بیٹھ گیا۔

قریب ہی تین فرلانگ کے فاصلے پر مین ریلوے لائن سے کئی گاڑیاں گذر چکی تھیں۔ اس طرف دلیپ کا دھیان نہیں گیا تھا۔ جب فرنٹیر میل طوفانی رفتار سے، زور دار شور مچاتی ہوئی گذری تو دلیپ نے اس طرف دیکھا۔ لگاتار فرسٹ اور سیکنڈ کلاس کے ڈبوں سے نکلنے والی تیز روشنی سے وہ سمجھ گیا۔۔ فرنٹیر میل جارہی ہے۔ ساڑھے نو بج گئے۔

اپنے اوپر ظلم کے انتقام کا ایک امکان دیکھ کر اس کا دل کچھ ہلکا ہوگیا تھا۔ وہ واپس جانے کے لئے اٹھا۔ جسم میں سستی باقی رہنے کی وجہ سے سائیکل پر بیٹھنے کے

بجائے وہ پیدل ہی باغوں سے گذرتا بادشاہی مسجد سے ٹکسالی دروازے اور ٹکسالی دروازے سے بھاٹی دروازہ پہنچا۔ راستے میں شاید ہی کوئی شخص دکھائی دیا ہو۔ سڑک کے کنارے ساکت کھڑے بجلی کے لیمپ پوسٹ خلوص اور غیر جانبداری کے ساتھ اپنی روشنی سڑک پر ڈال رہے تھے۔ انسانوں کی پریشانیوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے' لاکھوں پتنگے دائرے کی شکل میں' ان لیمپوں کے چاروں طرف ناچ رہے تھے۔ نظام شمسی کے یہ انوکھے نمونے تھے۔ ہر پتنگا ایک سیارے کی طرح اپنے مدار میں چکر کاٹ رہا تھا۔ کوئی چھوٹا اور کوئی بڑا دائرہ بنا رہا تھا۔ کوئی دائیں کوئی بائیں مختلف رفتار سے لگاتار چکر لگا رہے تھے۔ کوئی کسی سے ٹکراتا نہیں۔ درختوں کے بھیگے پتے بجلی کی روشنی میں چمچما رہے تھے۔

ایک لیمپ کے نیچے سے آگے بڑھنے پر اس کی چھوٹی پرچھائیں اس کے آگے پھیلتی جاتی تھی۔ جیسے جیسے وہ لیمپ سے آگے بڑھتا' پرچھائیں پلٹ کر پیچھے ہوجاتی تھی۔ بیچ بیچ میں درختوں کی ٹہنیوں کی پرچھائیں اس کے اوپر سے ہو کر نکل جاتی تھی۔ سڑک پر پڑا ہر بھیگا پتا لیمپ کی کرنوں کا جواب دے رہا تھا۔ دلیپ سوچ رہا تھا۔۔۔ انسان کے بغیر دنیا کتنی مصروف اور دلچسپ ہے!

کچھ قدم آگے بڑھنے پر سڑک کے کنارے لیموں کے درختوں کی پرچھائیں میں کوئی سفید سی چیز دکھائی دی کچھ اور آگے بڑھنے پر معلوم ہوا' کوئی چھوٹا سا لڑکا سفید کرتا پاجامہ پہنے ایک تھالی سامنے رکھ کر کچھ بیچ رہا تھا۔

بچپن میں گلی محلے کے لڑکوں کے ساتھ وہ اکثر خوانچے والوں سے کچھ نہ کچھ خرید کر کھاتا رہتا تھا۔ اب وہ ان باتوں کو بھول چکا تھا لیکن اس سردی میں سنسان سڑک پر' جہاں کوئی آنے جانے والا نہیں' یہ خوانچے والا کیوں بیٹھا ہے؟

خوانچے والے کے چھوٹے جسم اور عمر نے اس کا دھیان کھینچا۔ اس نے دیکھا' رات میں سودا بیچنے کے لئے نکلے اس سوداگر کے پاس مٹی کے تیل کا دیا تک نہیں تھا۔ قریب آکر اس نے دیکھا' وہ لڑکا سرد ہوا میں سکڑ کر بیٹھا تھا۔ دلیپ کے قریب آنے پر' اس نے امید بھری نظر اس پر ڈالی' اور پھر آنکھیں جھکالیں۔

دلیپ نے غور سے دیکھا' لڑکے کے چہرے پر خونچے والوں کی سی چالاکی نہیں

تھی، بلکہ اس کی جگہ ایک عاجزی سی تھی۔ اس کی تھالی بھی خوانچے کا تھال ہونے کے بجائے گھریلو استعمال میں آنے والی ایک معمولی ہلکی مراد آبادی تھالی تھی۔ ترازو بھی نہیں تھی۔ تھالی میں کاغذ کے آٹھ ٹکروں پر پکوڑوں کے برابر حصے لگاکر رکھ دیے گئے تھے۔

دلیپ نے سوچا کہ اس سرد رات میں ہم ہی دو شخص باہر ہیں۔ وہ اس کے پاس جاکر ٹھنک گیا۔ انسان انسان میں کتنا فرق ہوتا ہے لیکن انسانیت ایک ایسی چیز ہے جو کبھی کبھی تفریق کی سب دیواروں کو پار کرجاتی ہے۔ دلیپ کو قریب آتے ہوئے دیکھ کر لڑکے نے کہا۔۔ "ایک ایک پیسے میں ایک ایک ڈھیری۔

ایک لمحہ خاموش رہ کر دلیپ نے پوچھا۔۔ "سب کے کتنے پیسے ہوں گے؟"

بچے نے انگلی سے ڈھیریاں گن کر جواب دیا۔۔ "آٹھ پیسے۔"

دلیپ نے صرف بات آگے بڑھانے کے لئے پوچھا۔ "کچھ کم نہیں لے گا؟"

سودا بک جانے کی امید سے جو مسرت لڑکے کے چہرے پر آئی تھی، وہ دلیپ کے اس سوال سے غائب ہوگئی۔ اس نے جواب دیا۔۔ "ماں بگڑے گی۔"

اس جواب سے دلیپ پگھل گیا اور بولا۔۔ "کیا پیسے ماں کو دے گا؟" بچے نے ہامی بھری۔

دلیپ نے کہا۔۔ "اچھا سب دے دو۔"

لڑکے کی مصروفیت دیکھ کر دلیپ نے اپنا رومال نکال کر دے دیا اور پکوڑے اس میں بندھوالیے۔ سوچ کر دلیپ لرز گیا۔ اس نے جیب سے ایک روپیہ نکال کر لڑکے کی تھالی میں ڈال دیا۔ روپے کی کھنک سے وہ سنسان رات گونج اٹھی۔ روپے کو دیکھ کر لڑکے نے کہا۔ "میرے پاس تو پیسے نہیں ہیں۔"

دلیپ نے پوچھا۔۔ تیرا گھر کہاں ہے؟"

"پاس ہی گلی میں ہے" لڑکے نے جواب دیا۔

دلیپ کے دل میں اس کا گھر دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ بولا۔۔ "چلو مجھے بھی ادھر سے ہی جانا ہے۔ راستے میں تمہارے گھر سے پیسے لے لوں گا۔"

بچے نے گھبرا کر کہا۔۔ "پیسے تو گھر پر بھی نہیں ہوں گے۔"

دلیپ یہ سن کر لرز گیا، لیکن جواب دیا۔۔ "ہوں گے، تم چلو۔"

لڑکا خالی تھالی کو سینے سے لگاکر آگے آگے چلا اور اس کے پیچھے سائیکل تھامے ہوئے دلیپ۔

دلیپ نے پوچھا۔۔ تیرا باپ کیا کرتا ہے؟"

لڑکے نے جواب دیا۔۔۔ "باپ مرگیا ہے۔"

دلیپ خاموش ہوگیا۔ کچھ اور دور جاکر، اس نے پوچھا۔۔ "تمہاری ماں کیا کرتی ہے؟"

لڑکے نے جواب دیا۔۔ "ماں ایک بابو کے یہاں چوکا برتن کرتی تھی، اب بابو نے ہٹا دیا ہے۔"

دلیپ نے پوچھا۔۔ "کیوں ہٹا دیا بابو نے؟"

لڑکے نے جواب دیا۔۔۔ "ماں ڈھائی روپیہ مہینہ لیتی تھی، جگتو کی ماں نے بابو سے کہا کہ وہ دو روپے میں سب کام کردے گی، اس لئے بابو کی گھر والی نے ماں کو ہٹا کر جگتو کی ماں کو رکھ لیا ہے۔"

دلیپ پھر خاموش ہوگیا۔ لڑکا ننگے پاؤں گلی کے کیچڑ میں چھپ چھپ کرتا چلا جارہا تھا۔ دلیپ کو کیچڑ سے بچ کر چلنے میں پریشانی ہورہی تھی۔ لڑکے کی رفتار کو کم کرنے کے لئے، دلیپ نے پھر سوال کیا۔۔ تمہیں جاڑا نہیں لگتا؟"

لڑکے نے جسم کو گرمانے کے لئے چال اور تیز کرتے ہوئے جواب دیا۔۔ "نہیں۔"

دلیپ نے پھر سوال کیا۔۔ "جگتو کی ماں کیا کرتی تھی؟"

لڑکے نے جواب دیا۔۔ "جگتو کی ماں اسکول میں لڑکیوں کو گھر سے بلا کر لاتی تھی۔ اسکول والوں نے لڑکیوں کو گھر سے لانے کے لئے موٹر رکھ لی ہے اور اسے نکال دیا ہے۔"

گلی کے موڑ پر کمیٹی کا بجلی کا لیمپ جل رہا تھا۔ اوپر کی منزل کی کھڑکیوں سے بھی گلی میں کچھ روشنی پڑ رہی تھی۔ اس سے گلی کی کیچڑ چمک کر کسی قدر راستہ دکھا رہی تھی۔

سنکری گلی میں ایک بڑی کھڑکی کی شکل کا دروازہ کھلا تھا۔ اس کی دھندلی لال سی روشنی سامنے پرانی اینٹوں کی دیوار پر پڑ رہی تھی۔ اسی دروازے میں لڑکا چلا گیا۔

دلیپ نے جھانک کر دیکھا۔ مشکل سے آدمی کے قد کی اونچائی والی کوٹھری میں۔ جیسی عموماً شہروں میں ایندھن رکھنے کے لئے بنی ہوتی ہے۔۔ دھواں اگلتا مٹی کے تیل کا ایک چراغ اپنی لال روشنی پھیلا رہا تھا۔ ایک چھوٹی چارپائی جیسی شرادھ میں بڑے بڑے برہمنوں کو دان دی جاتی ہے' کالی دیوار کے سہارے کھڑی تھی۔ اس کے پائے پر دو میلے کپڑے لٹک رہے تھے۔ ایک دبلی پتلی ادھیڑ عمر کی عورت میلی سی دھوتی میں جسم لپیٹے ہوئی تھی۔

بیٹے کو دیکھ کر عورت نے پوچھا۔۔ "سودا بک گیا بیٹا؟"

لڑکے نے جواب دیا۔۔ "ہاں ماں" اور روپیہ ماں کے ہاتھ میں دے کر کہا' "باقی پیسے بابو کو دینے ہیں۔"

روپیہ ہاتھ میں لے کر ماں نے حیرت سے پوچھا۔۔ "کون بابو بیٹا؟"

بچے نے پرجوش انداز میں کہا۔۔ سائیکل والے بابو نے سب سودا لے لیا ہے۔ اس کے پاس کھلے پیسے نہیں تھے۔ بابو گلی میں کھڑا ہے۔"

گھبرا کر ماں بولی۔۔ "روپئے کے پیسے کہاں ملیں گے بچے؟" سر کے کپڑے کو سنبھال کر دلیپ کو سنانے کے مقصد سے ماں نے کہا۔۔ "بیٹا" روپیہ بابو جی کو لوٹا کر گھر کا پتہ پوچھ لے۔ پیسے کل لے آنا۔"

لڑکا روپیہ لے کر دلیپ کو لوٹانے آیا۔ دلیپ نے اونچی آواز میں کہا تاکہ ماں سن لے۔۔ رہنے دو روپیہ' کوئی بات نہیں پھر آجائے گا۔"

سر کے کپڑے کو آگے کھینچ کر عورت نے کہا۔۔ "نہیں جی' آپ روپیہ لیتے جائیے' بچہ کل پیسے لے آئے گا۔"

دلیپ نے جھجکتے ہوئے کہا۔۔ رہنے دیجئے' یہ پیسے میری طرف سے بچے کو مٹھائی کھانے کے لئے دے دیجئے۔"

عورت "نہیں نہیں" کرتی رہ گئی۔ دلیپ اندھیرے میں پیچھے ہٹ گیا۔

عورت کے مرجھائے' کمہلائے پیلے چہرے پر احسان مندی اور خوشی کی جھلک

دوڑ گئی۔ اس نے روپیہ اپنی چادر کے کونے میں باندھ لیا پھر ایک اینٹ پر رکھے پیتل کے لوٹے سے بازو کے سہارے پانی لے کر اس نے ہاتھ دھوئے اور پیتل کے ایک برتن کے نیچے رکھے میلے انگوچھے میں لپٹی دو روٹیاں نکال کر بیٹے کے ہاتھ دھلا کر اسے کھانے کو دیں۔

بیٹا اس اچانک کی کمائی سے بہت خوش ہو رہا تھا۔ منہ بنا کر بولا۔ اوں، اوں روکھی روٹی!"

ماں نے پچکار کر کہا۔۔ "نمک ڈالا ہوا ہے، بیٹا۔"

بچے نے روٹی زمین پر ڈال دی اور اینٹھ گیا۔ "صبح بھی روکھی روٹی۔۔۔ ہاں روز روز روکھی!"

ہاتھ آنکھوں پر رکھ کر بچہ منہ پھیلا کر رونا ہی چاہتا تھا کہ ماں نے اسے گود میں لے لیا اور کہا۔۔ "میرا راجہ بیٹا، صبح ضرور دال کھلاؤں گی۔ دیکھ بابو تیرے لئے روپیہ دے گئے ہیں۔ شاباش!"

"صبح کو میں تجھے خوب سودا بنادوں گی، پھر تو روز دال کھانا۔"

بیٹا خوش ہو گیا۔ اس نے پوچھا۔۔ "ماں، تو نے روٹی کھالی؟"

بھوکی ماں کا بیٹا بچپن کی وجہ سے روٹھا تھا لیکن ماں کے کہنے کے باوجود گھر کی حالت سے واقف تھا۔ اس نے بے دلی سے ایک روٹی ماں کی طرف بڑھا کر کہا۔۔ "ایک روٹی تو کھالے۔"

ماں نے پیار سے پچکار کر کہا۔۔ "نہ بیٹا، میں نے صبح دیر سے کھائی تھی، مجھے ابھی بھوک نہیں، تو کھا۔"

دلیپ کے لئے اور دیکھ پانا ممکن نہیں تھا۔ دانتوں سے ہونٹ دبا کر وہ پیچھے ہٹ گیا۔

گھر آکر وہ بیٹھا ہی تھا کہ نوکر نے آکر دو اعلیٰ طبقے کے لوگوں کے نام بتا کر کہا کہ وہ لوگ آئے تھے اور بیٹھ کر چلے گئے۔ پھر اس نے کھانا تیار ہونے کی اطلاع دی۔ دلیپ نے اس کی طرف دیکھے بغیر ہی کہا۔۔ "بھوک نہیں ہے۔" اسی وقت اسے لڑکے کی ماں کا بھوک نہیں، کہنا یاد آگیا۔

نوکر نے نرمی سے پوچھا۔۔ "تھوڑا دودھ لے آؤں؟"

دلیپ کو غصہ آگیا۔ اس نے طنز سے کہا۔۔ "کیوں بھوک نہ ہو تو دودھ پیا جاتا ہے؟ دودھ ایسی فالتو چیز ہے؟"

نوکر کچھ نہ سمجھ کر حیرت زدہ کھڑا رہا۔

دلیپ نے جھنجلا کر کہا۔۔ "جاؤ جی۔"

مٹی کے تیل کے چراغ کی روشنی میں دیکھا ہوا وہ منظر اس کی آنکھوں کے سامنے سے نہیں ہٹتا تھا۔

چھوٹے بھائی نے آکر کہا۔۔ "بھائی نے یہ خط بھیجا ہے۔" اور لفافہ دلیپ کی طرف بڑھادیا۔

دلیپ نے خط کھولا۔ خط کی پہلی لائن میں لکھا تھا۔۔

"میں اس زندگی میں دکھ ہی دیکھنے کے لئے پیدا ہوئی ہوں۔۔۔۔"

دلیپ نے آگے پڑھے بغیر خط پھاڑ کر پھینک دیا۔ اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ اس کے منہ سے نکلا۔۔

"کاش تم جانتیں دکھ کسے کہتے ہیں!۔۔۔ تمہارا یہ رسیلا دکھ تمہیں نہ ملے تو زندگی دوبھر ہو جائے۔"

نقلی مال

وکرم کی زبردست خواہش تھی کہ پہلے مقدمے کی فیس چاہے نہ ملے لیکن مقدمہ ایسا ہو کہ اخباروں میں دھوم مچ جائے۔ وکیل کی شہرت ہی تو اس کی دولت اور ساکھ ہے۔ لوگ پہچانیں اور یہ سمجھیں کہ وہ ایک لائق وکیل ہے۔ نئی اور اجنبی جگہ میں اچھے وکیلوں کی صف میں جگہ پانے کا دوسرا ڈھنگ بھی کیا ہو سکتا تھا۔ راولپنڈی میں وکالت شروع کرنا اور بات ہوتی۔ وہاں وکرم کے خاندان کا اپنا کافی بڑا کاروبار تھا' اثر تھا' شہرت تھی۔ ضلع میں اس کے متعدد رشتے داروں کا لین دین کا کام چلتا تھا' زمینیں تھیں۔ عدالتی معاملات بنتے ہی رہتے تھے۔

وکرم نے لاہور سے وکالت پاس کر کے راولپنڈی کے سب سے بڑے وکیل خاں صاحب کے ساتھ عدالت میں شاگردی کا ایک ہی برس پورا کیا تھا کہ ملک کا ہندوستان اور پاکستان کے نام سے بٹوارہ ہوگیا۔ وکرم کو اپنی اچھی خاصی غیر منقولہ جایداد' کاروبار' خاندان کا اثر راولپنڈی میں چھوڑ کر دہلی آنا پڑا۔ خاندان بٹ گیا۔ رشتے دار بھی ہندوستان کے مختلف حصوں میں بکھر گئے۔ وکرم پر دہلی میں زندگی اور معاش کا نیا حلقہ بنانے کی مجبوری آن پڑی۔ عمر کا ایک چوتھائی حصہ وکیل بننے کی تیاری میں لگادیا تھا۔ وکالت کرنے کے علاوہ وکرم اور دوسری کوشش کرتا بھی کیا۔

وکرم جس طرح کے مقدمے کے انتظار میں تھا وہ اسے ملا ہے' لیکن سخت جھگڑا بھی کھڑا ہوگیا۔ کتنے ہی بھلے لوگ آکر میرے پیچھے پڑگئے کہ میں وکرم سے اس معاملے میں نہ پڑنے کے لئے کہوں۔ مجھے بھروسا تھا کہ وکرم میری بات نہیں ٹالے گا۔ میں پریشانی میں پھنس گیا۔ وکرم نے اپنے کاروباری مفاد کی دہائی دے کر ایک اخلاقی پریشانی کھڑی کردی۔

مقدمہ تھا' وینس ڈین' (Venus Den) ریستوران کے مالک پر۔ کوتوال صاحب

پر کئی بااثر لوگوں کے دباؤ اور کافی بڑی رقم کے وعدے کے تحت یہ مقدمہ ونیس ڈین' کے مالک پر دائر کیا گیا تھا۔ ان لوگوں میں پڑوس کے حریف ریستوران کے مالک بھی تھے۔ کوتوال صاحب کو بہت کوشش اور متعدد دلیلوں سے سمجھایا گیا تھا کہ ایسے رستوران اور ہوٹل اخلاقی اور سماجی لحاظ سے مضر ہیں' ان سے سماج میں بدکاری پھیلے گی۔ اخلاقی کردار ہی تو سماج کی روح ہے۔

وکرم کو بھی ایسی بہت سی دلیلوں سے سمجھانے کی کوشش کی گئی کہ وہ ریستوران کے بدکردار مالک کی وکالت نہ کرے۔ ایسے معاملے میں وکیل بن کر وہ شہرت کی بجائے بدنامی ہی پائے گا۔ وکرم نے فرض کی خاطر قربان ہوجانے کے لئے بے قرار شہید کی طرح بے خوف ہوکر جواب دیا۔۔ "عدالت اخلاقی معاملات پر فیصلے کی جگہ نہیں' قانونی مسائل کے فیصلے کی جگہ ہے... آپ لوگ ونیس ڈین' کے مالک کے خلاف اخلاقی طاقت کا نہیں بلکہ قانونی طاقت کا استعمال کررہے ہیں۔ قانون صرف آپ لوگوں کے لئے نہیں' ونیس ڈین کے مالک کے لئے بھی ہے۔ میں اس کی مدد کیوں نہ کروں؟" کچھ لوگوں کی مشترک تحریک یا اتفاق رائے کوئی قانون نہیں ہے۔ قانون انتظامیہ کی حفاظت کے لئے مقرر کیے گئے اصول ہیں۔ آپ تو حکومت اور قانون کی طاقت سے اس پر حملہ کریں اور ونیس ڈین' کا مالک اس طاقت سے اپنی حفاظت نہ کرسکے' یہ کیا انصاف ہے یا سماج کبھی اشتعال یا غلط فہمی کی وجہ سے کسی شخص کے خلاف ناانصافی کرنے پر بھی آمادہ ہوسکتا ہے۔

وکیل کا فرض ہے کہ قانون کی بنیاد پر لوگوں کے حقوق کی حفاظت کرے' سماج کے ضابطوں کا استعمال غلط طریقے سے نہ ہونے دے۔ قانونی پریشانی میں پڑے کسی بھی ملزم کی قانونی مدد سے منھ موڑنا وکیل کا اپنے فرض سے منحرف ہونا ہے۔

وکرم کو سمجھایا گیا۔ اصولاً تمہاری بات صحیح ہے لیکن ونیس ڈین' کا معاملہ کے نہیں معلوم؟ تم شہر بھر سے بگاڑ کرنے پر کیوں تلے ہو!"

وکرم مشتعل ہو اٹھا۔۔ "ونیس ڈین' کا مالک قصوروار ہے یا نہیں' یہ تو عدالت بتائے گی۔ مشتعل بھیڑ کی رائے یہ فیصلہ نہیں کرسکتی۔ مجھے یا آپ کو چاہے جو معلوم ہو' اہمیت تو اس بات کی ہے کہ عدالت میں ثابت کیا ہوتا ہے... عدالت میں فیصلے

سے پہلے ہی ونس ڈین' کے مالک کو مجرم یا بدکردار کہہ دینا قانوناً اس کی ہتک عزت ہے۔••• یوں تو ہر مقدمے میں ایک فریق ظالم' مجرم یا بدکردار ہوتا ہے۔ کیا وکیل ایک ہی فریق کی حمایت کرتے ہیں؟ اگر عدالت وکیل کی مدد کے بغیر خود ہی ہمیشہ انصاف کرسکے تو وکیلوں کی ضرورت کیا ہے اور قابل یا ناقابل وکیل کی کسوٹی کیا؟•••• ونس ڈین' کے مالک کو قانونی مدد سے محروم کرکے خواہ مخواہ مجرم بنا دینا بھی بے انصافی ہے۔ - - ہمارے سماج میں کتنے لوگ انصاف پاسکتے ہیں؟ جو اپنی بات ثابت نہیں کرسکتا' انصاف نہیں پاسکتا۔ آپ چاہتے ہیں کہ قانون کی قربان گاہ پر ایک اور غریب قربان ہوجائے••••"

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وکرم مجھے جج مان کر مقدمے کے ڈرامے کی مشق کر رہا ہے۔

واقعہ کچھ اس طرح سے تھا۔۔ ونس ڈین' کے مالک بھی اپنے رفیوجی بھائی ہی ہیں۔ وہ بھی پیشاور میں اپنا مستحکم کاروبار چھوڑ کر آئے تھے۔ ایسا روزگار جس میں ان کے یہاں تیئس کارندے تھے۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ان کا کاروبار ایسا تھا کہ تیئس آدمی ان کے لئے محنت کرکے کماتے تھے یا تیئس آدمی صرف گذر کے قابل لے کر اپنی محنت کا پھل انہیں سونپ دیتے تھے۔ پرانے زمانے کا کوئی شاعر شاید یہ کہہ دیتا کہ ان کے تیئس سر اور چھیالیس ہاتھ تھے۔ ایسے کاروبار سے گذارا کرنے کی انہیں مشق تھی۔ اب ڈھلتی عمر میں ہتھوڑا یا پھاوڑا چلا کر یا سر پر بوجھ ڈھو کر گذارا نہیں کرسکتے تھے۔ ہمارے رفیوجی بھائیوں کے ساتھ یہی پریشانی تھی۔ وہ سب کاروبار کرنا چاہتے ہیں۔ رفیوجیوں کے آنے سے مال کی پیداوار نہیں بڑھی' مال کھپانے والوں کی تعداد بھی کوئی خاص نہیں بڑھی تو تاجروں کے لئے جگہ کہاں سے بڑھ جائے؟ وہ کاروبار ہی کریں گے۔ پہلے سے کاروبار کرنے والوں کو ڈھکیل کر ان کی جگہ لیں گے لیکن کاروبار کریں گے۔

ہاں تو ونس ڈین' کے مالک کاروبار کی فکر میں تھے۔ تھوڑا بہت سرمایہ ان کے پاس تھا۔ سرمایے سے کاروبار نہ کرکے ایسے ہی کھانے لگتے تو سرمایہ کتنے دن چل سکتا تھا؟ کاروبار بھی کرتے تو کیا۔ اتنا سرمایہ بھی تو نہیں تھا کہ بازار سے دوسرے

کاروباریوں کو دھکیل کر باہر کرسکتے۔ انہیں ریستوران چلانے کا خیال ہی مناسب معلوم ہوا۔ ان کا ارادہ تھا کہ دوسروں کے مقابلے میں کوئی نئی بات یا کچھ زیادہ کشش پیدا کریں۔ یہ بھی کم ہمت کی بات نہیں تھی۔ شاید کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں تھا۔ کاروبار کی دنیا میں گاہکوں کو کھینچ پانا ہی تو کامیابی کا راز ہے۔

وینس ڈین' ریستوران کی کچھ جھلک تو اس کے نام (وینس کی گپھا) سے ہی مل جاتی ہے۔ ریستوران کے کھلنے پر ایک ہی دن میں اس کی دھوم مچ گئی۔ "وینس ڈین" میں ہمیشہ رات ہی رہتی تھی۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر گہرے رنگ کے بھاری پردے تھے' جنہیں پار کرکے سورج کی کرنیں بھی اندر نہیں جاسکتی تھیں۔ اندر بلبوں پر عنابی لال رنگ کے ریشم کے شیڈ پڑے رہتے تھے۔ فرش پر قالین' گدیاں اور اندر کے پردے بھی لال رنگ کے شیڈس کے تھے۔ فرنیچر پر کالی مہوگنی کی پالش تھی۔ پراسرار اور گلابی نشے کا ملا جلا سا ماحول۔ سب سے زیادہ کشش یا ریستوان کی جان تھیں--- سروس کرنے والی چار لڑکیاں۔ ریستوران کے مالک نہ جانے کہاں سے ایسی سڈول جسم کی اور شوخ لڑکیاں لائے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے پلاسٹک سے بنی ماڈل' جو درزیوں اور جوہریوں کی دکانوں پر نظر آتی ہیں ان میں جان پڑ گئی ہو۔ ایک کونے میں پردے کے پیچھے لڑکیوں کے لئے ڈریسنگ اور میک اپ کا بھی انتظام تھا۔ لڑکیاں جب چاہتیں' پردے کے پیچھے جاکر بال بناتیں' چہرے پر پاؤڈر یا ہونٹوں پر لپ اسٹک لگالیتیں اور بھنویں سنوار کر آجاتی تھیں۔

وینس کے ریٹ دوسرے ریستورانوں سے الگ تھے۔ عام چائے کے دام فی کس ڈیڑھ روپیہ۔ کھانے یا ناشتے کی چیزیں تعداد میں زیادہ نہیں تھیں۔ جو تھیں معمولی ہی تھیں۔ معمولی سموسے یا دال موٹھ کی پلیٹ کا بھی کم سے کم ایک روپیہ دام تھا۔ پردوں کے پیچھے پرائیویٹ کیبن تھے۔ وہاں بیٹھنے کے دام کم سے کم پانچ روپیہ فی گھنٹہ اور ہر گھنٹے بعد اسی حساب سے۔ ٹپ' کے طور پر لوگ لڑکیوں کی چولی میں جو ایک روپیہ یا دو روپیہ ڈال دیتے تھے' وہ لڑکیوں کا ہوتا تھا۔ وینس ڈین' میں زیادہ دام چائے یا ناشتے کے نہیں بلکہ اندر جاکر بیٹھنے کے تھے۔ وینس ڈین میں ملنے والا سکون دوسرے ریستورانوں میں کہاں تھا۔

ایرے غیرے کی زیادہ بھیڑ تو مالک بھی نہیں چاہتے تھے۔ احتیاط کے طور پر موٹے الفاظ میں دروازے پر ہی لکھا تھا Right Of Admission Reserved' یعنی جسے چاہیں اندر نہ جانے دیں۔ ہاں' سمجھنے بوجھنے والے گاہک بھرے ہی رہتے تھے۔ سروس کرنے والی لڑکیوں سے ہنسنے بولنے کے لئے گاہک کافی دیر تک بیٹھے رہتے تھے۔ لڑکیوں کے چائے' شربت یا کوئی پلیٹ لے کر آنے پر گاہک ان کا ہاتھ پکڑ کر بات کرلیتے یا پردوں کے پیچھے ایک دو منٹ کے لئے بٹھا لیتے تو کوئی شکایت نہیں کی جاتی تھی' لیکن لڑکیاں کام کا بہانہ کرکے مسکرا کر جلدی ہی اٹھ جاتی تھیں۔ انہیں دوبارہ بلانے کے لئے گاہکوں کو اور آرڈر دینے پڑتے تھے۔ زیادہ پیسہ خرچ کرنے والے یا اکثر آنے والے گاہکوں کی بے باکی بھی لڑکیاں برداشت کرجاتی تھیں اور کبھی کبھی جھجک اور شکایت کا اظہار بھی کردیتی تھیں۔ ان کی جھجک اور شکایت ایسی ہی تھی جیسے کھیرے پر نمک مرچ۔ شکایت کا انداز' کند کرنے والی مخالفت کا نہیں بلکہ دعوت کی مٹھاس والا ہوتا تھا۔ بے باکی کی حد بھی تھی یعنی گاہکوں کے ہاتھ کپڑوں کے اندر نہیں جاسکتے تھے۔ اس پابندی پر عمل کرانے کے لئے مالک کی طرف سے خونخوار نظر آنے والے دو کارندے بھی موجود رہتے تھے۔

وینس ڈین' کی پچاس دن کی مختصر زندگی میں' وہاں بہت زیادہ آنے والے گاہکوں میں سے ایک تھے۔۔ مہتاب رائے۔ مہتاب کی ذاتی اور عوامی زندگی الگ الگ تھی۔ وناسپتی گھی کی کافی بڑی ایجنسی تھی۔ سیاسی کاموں کے لئے بھی کافی وقت صرف کرتے تھے۔ مہتاب رائے کا دل ریستوران میں کام کرنے والی موہنی پر آگیا تھا۔ ہر شام وینس ڈین' ریستوران میں دو ڈھائی گھنٹے بیٹھے رہتے تھے۔ موہنی آرڈر کی ہوئی چیزیں لاتی تھی۔ ہاتھ پکڑ کر پاس بٹھائے جانے پر جھجک کر ذرا مسکراتی تھی۔ کچھ لمحے اپنے ہاتھ کے لمس کا لطف پہنچا کر' کام کی مجبوری ظاہر کرکے وہ مہتاب رائے کے کندھے کا سہارا لے کر اٹھ جاتی تھی۔ مہتاب رائے کو پھر آرڈر دینا پڑتا تھا۔ اس چکر میں مہتاب رائے تین ساڑھے تین سو روپے صرف کرچکے تھے۔ انہوں نے ریستوران کے مالک سے موہنی کو گھر پر بلانے کی بات کی۔ یہ اطمینان بھی دلایا کہ اس بات کے لئے معقول رقم خرچ کرنے میں بھی انہیں ہچکچاہٹ نہیں ہے۔

مالک نے تیور چڑھا کر جواب دیا۔۔ "دیکھئے' پھر ایسی بات زبان پر نہ لایئے گا! یہ شریف خاندانی لڑکیاں ہیں۔ بیچاری مصیبت کی ماری کسی طرح عزت سے اپنے دن کاٹ رہی ہیں۔"

موہنی کے خاندان کے شریف لیکن نادار ہونے کی بات نے مہتاب رائے کے دل کی آگ کو اور بھڑکادیا۔ ٹکے ٹکے بکنے والی بازارو لڑکیوں کی انہیں پرواہ نہیں تھی۔ انہوں نے مالک کی پرواہ نہ کرتے ہوئے موہنی سے' اسے خوش کردینے کا وعدہ کرکے باہر ملنے کے لئے کہا۔ موہنی ظالم مالک کا ڈر اور اپنی عاجزی دکھاکر کترا گئی۔ مہتاب رائے کی تڑپ اور بھی بڑھ گئی۔

وینس ڈین' کے مالک کے روکھے پن سے اور موہنی کے فریب سے تنگ آکر مہتاب رائے نے کئی دن موہنی کے ریستوران سے نکلنے اور آنے کے وقت کا اندازہ لگانے کے لئے باہر انتظار کیا۔ موہنی یا سروس کرنے والی کسی بھی لڑکی کو کبھی بھی ریستوران میں آتے جاتے نہیں دیکھا گیا تھا۔ ریستوران میں آتے جاتے صرف مردوں اور لڑکوں کو ہی دیکھا گیا تھا۔ ان لڑکیوں کا پیچھا کرنے کے لئے بے قرار لوگوں کی سمجھ میں یہ راز نہیں آتا تھا کہ ریستوران بند ہونے کے وقت یہ لڑکیاں کہاں غائب ہوجاتی تھیں۔

پریشان ہوکر' ایک دن مہتاب رائے نے فیصلہ کرلیا کہ موہنی کو ریستوران میں ہی سبق سکھائیں گے۔ مدد کے لئے وہ اپنے ایسے کاموں میں ساتھ دینے والے اپنے داہنے ہاتھ' نرسنگھ کو بھی ساتھ لے گئے تھے۔ موہنی آرڈر کی ہوئی چیزیں لائی۔ مہتاب رائے نے اسے ہاتھ سے پکڑ کر اپنے اور نرسنگھ کے بیچ میں بٹھالیا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ موہنی نے جھجک دکھائی اور بیٹھ گئی۔

کچھ لمحے بیٹھ کر موہنی اٹھنے لگی۔

مہتاب رائے نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے روکتے ہوئے کہا۔۔ "بیٹھو' تمہارا نقصان ہم بھر دیں گے۔" اور اس کے ساتھ ہی بے باک ہوگئے۔ موہنی نے شرما کر اور جھجک کر ہمیشہ کی طرح' ان کے ہاتھوں کو روکر شکایت کی' "ہائے' نہیں' نہیں۔"

اس دن مہتاب رائے نخروں کی دیوار گرا دینے کا فیصلہ کر کے آیا تھا۔ اس نے موہنی کو اور سختی سے پکڑلیا۔

موہنی بگڑ گئی۔۔ "چھوڑ مجھے!" اس نے ڈانٹا اور ہاتھا پائی پر آگئی۔ مہتاب رائے نے موہنی کی بانہوں میں جتنی طاقت کا اندازہ لگا کر اسے پکڑا تھا' اس سے کہیں زیادہ طاقت سے دھکا پایا۔

بے عزت ہو کر مہتاب رائے کی چاہت غصے میں بدل گئی۔ نرسنگھ نے موہنی کے ہاتھ پکڑلیے اور مہتاب رائے نے موہنی کو بے بس کرنے کے لئے اس کی چولی میں ہاتھ ڈال دیا۔

موہنی چلا کر لات اور گھونسے چلانے لگی۔

نرسنگھ نے گالی دے کر اس کی چوٹی کھینچی۔ موہنی کی چولی اور چٹیا کھینچ جانے پر مہتاب رائے اور نرسنگھ ہکا بکا کھڑے رہ گئے۔ تب تک ریستوران کے پٹھان کارندے بھی "کیا ہے؟ کیا ہے؟" کہتے ہوئے آگئے۔

پٹھان کارندے مہتاب رائے اور نرسنگھ کو پکڑ کر مالک کے پاس لے گئے۔ مہتاب رائے اور نرسنگھ موہنی کی چٹیا اور چولی ہاتھ میں لیے' موہنی کو بانہوں سے کھینچتے ہوئے اور بھیانک گالیاں بکتے ہوئے' ریستوران کے مالک کے سامنے چیخ پڑے۔ "لونڈوں کے چھاتیاں باندھ کر دنیا کو ٹھگتے ہو۔۔۔!"

ریستوران میں کہرام مچ گیا۔ باقی تینوں لڑکیاں نہ جانے کہاں غائب ہو گئیں۔ رنگین مزاج لوگ ٹھگے جانے کا علم ہونے پر مالک پر برس پڑے۔

مہتاب رائے نے بہت سی گالیاں دیں اور کہا۔۔ "ہم نے پانچ سو روپیہ گلا دیا۔ تمہارے یہاں سے ہم اپنی پائی پائی لے کر جائیں گے۔ نہیں تو تمہارے اس بدمعاشی کے اڈے کی اینٹ سے اینٹ بجا کر تمہاری ہڈی پسلی ایک کر ڈالیں گے! اس دھوکے کے اتنے دام لگا رکھے ہیں۔ نقلی چھاتیوں سے دنیا کو الو بناتے ہو!"

دور اندیش مالک نے ایسے ہنگاموں سے مغلوب نہ ہونے کا طریقہ پہلے ہی سوچ رکھا تھا۔ دونوں نے پشتو میں غرا کر چھرے نکال لیے۔ اس لئے ریستوران کے مالک کے دھوکے اور ناانصافی کے خلاف مہتاب رائے اور دوسرے لوگوں کی مخالفت

کامیاب نہ ہو سکی۔ اپنی دھمکیوں کا کوئی اثر نہ دیکھ کر ان لوگوں نے ریستوران کے مالک کے خلاف سرکاری طاقت کا استعمال کرنے کے لئے کوتوال کی پناہ لی۔

کوتوال صاحب کو تعزیرات ہند میں ایسی کوئی دفعہ نہ ملی جس کے مطابق لڑکوں کو لڑکی بنا دینے کے لئے ریستوران کے مالک کا چالان کیا جاسکتا لیکن کچھ لوگوں کے پیسے کا اور دوسرے لوگوں کا اخلاقی دباؤ کوتوال پر پڑا۔ اس بدکرداری کی دھوم اخباروں میں بھی مچ گئی۔ وینس ڈین میں دھوکا دیئے جانے کے لئے مالک کا چالان کوتوال کو کرنا ہی پڑا۔ ریستوران کے مالک کو وکیل ملا، وکرم۔۔۔ وکرم تو ایسے معاملے کے انتظار میں ہی تھا۔

وکرم کو جب بدکرداری، دھوکے اور فریب کے معاملے میں مدد دینے کے لئے شرمندہ کیا گیا تو اس کا بے دھڑک جواب تھا۔۔۔

"۔۔۔ وینس ڈین میں بدکردار کیا تھا؟ یہی شکایت تھی نہ کہ گاہکوں کو کھینچنے کے لئے راس لیلا کے لونڈوں کو نقلی چھاتیاں باندھ کر لڑکیاں بنالیا گیا تھا! بازار میں "اصل چھاتیاں بیچنا تو دھوکا نہیں ہے، کیا ان کا استعمال لڑکیاں کرتی ہیں، لڑکے نہیں؟ مطلب یہ کہ اگر گاہکوں کو تفریح کے لئے سچ مچ لڑکیاں ملتیں تو بدکاری نہ ہوتی؟ کچھ لڑکیوں کو ہوٹل میں لاکر بگاڑنا جرم ہوتا، مذموم شوق رکھنے والے لوگوں کو کھلونوں سے بہلا دینا دھوکا ہوگیا؟۔۔۔ اصلی گھی کی جگہ وناسپتی گھی بیچنا سن کو ریشم بنا کر بیچنا، جوتوں میں دفتی بھرنا، گیہوں کے آٹے میں جو، بیسن میں مکا ملانا، نقلی دوائیاں بیچنا، کالے چہرے کو گورا، پیلے ہونٹوں کو لال بنانا، راس لیلا اور رام لیلا میں لڑکوں کو کرشن کی سکھیاں اور سیتا ماتا بنانا دھوکا نہیں ہے، سیٹھوں کے مفاد کو جمہوریت کہنا بھی دھوکا نہیں ہے، بس لڑکے کو لڑکی بنا کر آپ کا دل بہلا دینا ہی دھوکا ہے۔۔۔"

وکرم کی یہ بکواس سن کر دل میں آیا کہ اب اس سے کبھی بات نہ کروں لیکن تب ہی کچھ بھلے آدمی بیچ میں بول پڑے۔۔۔ "بھائی کیوں زیادتی کرتے ہو، یہ تو اس کا بزنس ہے۔۔۔ اپنا اپنا بزنس ہے۔ کسی کا بزنس بگاڑنا ٹھیک نہیں۔"

مجھے خاموش ہی رہنا پڑا۔

ہولی نہیں کھیلتا

بیجل نے کہا، "میں ہولی نہیں کھیلتا۔"

پوچھا، "کیوں نہیں کھیلتا؟"

اس نے جواب دیا، "بس، نہیں کھیلتا!" اس کے انداز میں جھنجلاہٹ بھری جذباتیت اتنی عیاں تھی کہ ہمدردی بھی ہوئی اور تجسس بھی پیدا ہوا۔ کچھ اس سے پوچھ کر اور کچھ ادھر ادھر سے معلوم کیا۔۔۔

مسٹر کپور بینک میں اکاؤنٹینٹ ہیں۔ دن بھر بینک کے کھاتوں میں سر مار کر تھکے ہوئے واپس آتے ہیں تو چاہتے ہیں کہ بینک کی باتیں بالکل بھول جائیں۔ ناشتہ کرتے وقت وہ ریڈیو سننے لگتے۔ کچھ ہی دن میں ریڈیو کی کرخت آواز سے بھی دل اکتا نے لگا۔ مسز جیوتسنا کپور سے وہ کچھ گا کر سنانے کے لئے کہہ دیتے تھے۔ بیوی کو نئی طرز میں، پھڑکتے ہوئے گیت اور گانے سکھانے کے لئے ہفتے میں ایک دوبار سنیما بھی ضرور لے جاتے تھے۔ بینک میں تقریباً سبھی سنیماؤں سے فری پاس آتے تھے۔ ان کے دن بھر کے تھکے دماغ کو فلم دیکھتے ہوئے نیند آجاتی تھی۔ جیوتسنا کا گلا اچھا ہے، گانے کا شوق بھی ہے لیکن وہ امنگ کے ساتھ نہیں گاسکتی۔ ایک شخص کا روز گانا اور وہ بھی ایسے آدمی کے لئے جو خود کبھی نہ گائے بلکہ منہ کی طرف گھورتا رہے، گانے والے کے دل میں جوش پیدا نہیں کرتا۔

جیوتسنا جیسی پڑھی لکھی اور خوبصورت بیوی حاصل کرنے پر انہیں فخر تھا۔ وہ چاہتے تھے، جیوتسنا موسیقی کی اچھی معلومات حاصل کرکے اور آزادی سے سماج میں گھلے ملے۔ کپور کے گھر میں مردانی بیٹھک اور زنانہ الگ الگ نہیں ہے۔ ملنے جلنے والوں کا تعارف وہ بیوی سے بھی کراتے ہیں۔ مجلس اور محفل ان کے یہاں عموماً ہوتی

رہتی ہے۔

مسٹر کپور کا ایک دن بینک میں ایک عجیب آدمی سے واسطہ پڑ گیا۔ کالج کے ٹیچر میبل نے اپنے سیونگ بینک اکاؤنٹ سے کچھ روپیہ نکلوانے کے لئے ایک چیک بھیجا تھا۔ کالج کا چپراسی چیک لوٹا لایا تھا۔

میبل خود بینک پہنچا۔ وہ بہت ناراض تھا۔ بینک میں اس نے اکاؤنٹینٹ مسٹر کپور سے شکایت کی۔ چیک کا روپیہ نہ دیے جانے کا سبب اس کے دستخط میں کچھ فرق ہونا بتایا گیا۔

میبل نے اکاؤنٹینٹ سے سوال کیا، "ایک بات بتائیے، تین برس سے آپ کے بینک میں میرا اکاؤنٹ ہے۔ روپیہ نکلوانے کی کبھی ضرورت نہیں پڑی۔ اس دوران اگر میرے دستخط میں کچھ فرق آجائے تو تعجب کی کیا بات ہے؟ کیا یہ بے انصافی نہیں کہ آپ میرا بھیجا ہوا روپیہ تو جمع کرتے جائیں اور واپس دینے سے انکار کردیں۔"

میبل نے کہا، "ایک اور عرض ہے، اگر آپ کو میری طرح لگاتار تین برس تک اپنے گاؤں سے دور رہنا پڑے اور تین برس بعد گھر لوٹنے پر آپ کے نوکر آپ کے کسی پرانے فوٹو سے آپ کا چہرہ ملا کر کہیں کہ آپ کی شکل میں کچھ فرق ہے اور آپ کو آپ کی بیوی کے پاس نہ جانے دیں تو آپ کیا کریں گے؟"

مسٹر کپور کو دلیل پسند آئی۔ بات چیت کے دوران معلوم ہوا کہ میبل کالج میں فلسفہ کا ٹیچر ہے۔ عالم باغ میں کپور کے مکان سے زیادہ دور نہیں رہتا۔ چیک کا روپیہ تو مل ہی گیا، اس کے ساتھ ہی تکلیف کے لئے معافی مانگ کر، مسٹر کپور نے تعارف بڑھانے کے لئے میبل کو شام کے وقت ان دنوں دکھائی جارہی ایک مقبول فلم دیکھنے کی دعوت بھی دے دی۔

کپور نے پوچھ لیا۔ "کہئے مسٹر میبل، فلم پسند آرہی ہے؟"

"کوئی خاص نہیں۔" میبل نے جواب دیا، "سنیما میں جہاں دیکھئے، عورتیں عشق کرتی ہیں صرف خوبرو مردوں سے، ایسے مردوں سے جنہیں گانا آتا ہو۔ بدصورت مرد کے لئے صرف ناامیدی ہی رہ جاتی ہے۔ اس بات سے مجھے خوشی نہیں ہوتی۔"

اس درد بھرے طنز پر مسٹر کپور بہت ہنسے۔ انہوں نے دوسری طرف بیٹھی جیوتسنا

کو میبل کی رائے سنادی۔ جیوتسنا نے مسکرا کر ہونٹ دبا لیے لیکن دل میں ایک دبی ہوئی سی ہمدردی بھی محسوس کی۔ میبل کا گہرا سانولا' مہاسوں کے داغوں سے بھرا چہرہ اس کی نظروں کے سامنے پھر گیا۔

میبل نے سمجھ لیا تھا کہ اس کی بات' اپنے اوپر طنز کا اشارہ کرتی ہوئی مسز کپور کے کانوں تک پہنچ گئی تھی۔ اسے اس غیر دلچسپ فلم کے پردے پر کچھ لمحے کے لئے دکھائی دے گیا۔ جیوتسنا کا صاف گندمی چہرہ' اس کی بڑی بڑی آنکھیں' رس بھری نارنگی کی پھانک کے مانند ہونٹ اور اپنی بات سے جیوسنا کے چہرے پر پھیل جانے والی مسکراہٹ کی ہلکی سی جھلک' عمدہ ساڑی میں لپٹا ہوا اس کا چھریرا بدن اور اس کے مقابلے اپنا بے کشش حلیہ۔ یہ موازنہ' اس کے تصور میں بس گیا۔ اسے یاد آیا' گاؤں میں رہنے والی اپنی بیوی کا چہرہ۔ میبل نے پہلی ملاقات میں ہی بیوی کے چہرے پر ایک داسی کا مضطرب انداز دیکھا تھا۔ وہ صرف حکم بجالانے کے لئے تیار رہتی تھی۔ اس کا اپنا تشخص کچھ بھی نہیں تھا۔

میبل کی باتیں کچھ چبھتیں ہوئی اور دلچسپ ہوتی تھیں۔ سماج کے عام اعتقاد اور رسم ورواج کی مخالفت کرنا اور مذاق اڑانا اس کی عادت تھی۔

کپور کہتے تھے' "وہ ٹھوس عملی دنیا میں نہیں بلکہ کتابوں کی دنیا میں رہتا ہے۔"

کپور کے یہاں میبل کی آمدورفت عام بات ہوگئی۔ سنیما جانے پر اب کپور نہیں بلکہ جیوسنا بیچ میں بیٹھتی تھی! پاپ کا پھل' فلم میں نیک چلنی کے موضوع پر کی گئی تقریر کی تھیم تھی---- "عورت گناہ اور زوال کی جڑ ہے۔"

جیوتسنا نے پوچھ لیا' "کیوں میبل صاحب' کیا یہ بات ٹھیک ہے؟"

میبل نے جواب دیا' "اگر گناہ اور زوال صرف مرد کا ہوتا تو بات ٹھیک ہوسکتی ہے۔"

میبل کا انداز کچھ سنکی آدمی کا سا تھا۔ سماج کے سخت گیر ضابطوں کی وہ بے بنیاد مخالفت کرتا تھا لیکن جب جیوسنا عورتوں کی آزادی اور مردوں کے ساتھ برابری کی بات کرتی تھی تب بھی وہ مخالفت کرتا تھا۔

میبل کہتا تھا' "جب تک عورتیں مردوں کے کندھے کا بوجھ ہیں' ان کی کمائی

کھاتی ہیں، انہیں مردوں کی ضرورت پوری کرنے کی چیز بن کر رہنا ہوگا۔ ان کے گڑگڑاتے اور منمناتے رہنے سے کچھ نہیں ہوگا۔"

اس نے کہا، "عورتوں کو کیسی آزادی چاہئے؟ میری بیوی گھر پر بیٹھی ہے، میں اسے مکمل آزادی دیتا ہوں۔ کیوں وہ میرے گلے میں چکی کے پاٹ کی طرح پڑی ہے؟"

جیوتسنا کو یہ بات عورت ذات کی توہین معلوم ہوئی۔ اس نے جواب دیا، "یہ آپ کا کام ہے کہ انہیں پڑھایئے، لکھایئے، انہیں لائق بنایئے۔"

مبجل چڑ گیا، "جی ہاں، میرا کام ہے کہ جو شخص میری حکومت کی مخالفت کر کے میری برابری کرنا چاہے میں اس کی مدد کروں؟ اپنے پیر پر کلہاڑی ماروں؟ میرا مکان شکارپور میں نہیں ہے!"

جیوتسنا کو اس بات پر فخر تھا کہ وہ آزاد تھی، شوہر کی طرح اس کے بھی حقوق تھے لیکن اس سے بھی زیادہ فخر جیوتسنا کو نیک چلن اور شوہر پرست ہونے پر تھا۔ مردوں کے خلاف اسے شکایت تھی کہ وہ نہ صرف عورتوں پر غیرمناسب دباؤ رکھتے ہیں بلکہ قدرتی طور پر آوارہ بھی ہوتے ہیں۔ وہ تانگے پر جب بھی اکیلی بازار جاتی تھی، ضرور کوئی نہ کوئی مرد اس کی طرف گھورنے لگتا تھا۔ اس معاملے پر متعدد بار بحث اور نوک جھونک ہو چکی تھی۔ مبجل کے دل میں جیوسنا کے بے جھجک قرب سے جو کچھ ہمت پیدا ہوتی تھی، وہ ایسے ذکر سے کافور ہو جاتی تھی۔

کپور کی بیٹھک کے کونے میں دیوار گیر پر جیوسنا کا ایک چھوٹا سا فوٹو فریم کیا ہوا رکھا تھا۔ مبجل جب بیٹھک میں اکیلا ہوتا تھا تو اس فوٹو کی طرف دیکھتا تھا۔ ایک دن کپور کے چھوٹے لڑکے ننو کی شرارت سے فوٹو فرش پر گر گیا اور شیشہ ٹوٹ گیا۔ کئی دن لاپرواہی میں بیت گئے۔ ایک دن جیوسنا نے بے اعتنائی سے کہا۔ "اور سب کام ہو سکتے ہیں، اس فوٹو کا فریم نہیں بن سکتا۔"

مبجل نے فوٹو جیوتسنا کے ہاتھ سے لے لیا اور کہہ دیا کہ فریم بن جائے گا۔ مبجل فوٹو لے گیا لیکن لوٹا کر نہیں لایا۔ کپور اور جیوتسنا کو بھی یاد نہیں رہا۔ ایک دن

کپور اور جیوتسنا مینجل کے یہاں چائے پی کر گپ شپ میں مصروف تھے تو ان کی نظر اندر کے کمرے میں چلی گئی۔۔۔ انہوں نے دیکھا کہ جیوتسنا کا فوٹو' مینجل کی چارپائی کے سرہانے چھوٹی میز پر تانبے کے ایک بھاری منقش فریم میں رکھا تھا۔ کچھ دن پہلے تک اس فریم میں کسی اخبار سے کاٹا ہوا مینجل کا فوٹو تھا' جو اس کے مضمون کے ساتھ چھپا تھا۔

جیوتسنا نے پوچھا' واہ' فوٹو میں فریم کہاں سے لگوایا؟"

"فوٹو! یہ کیا فریم میں نہیں ہے؟" مینجل نے جواب میں پوچھا۔

"فریم میں جو تصویر پہلے تھی' وہ کہاں گئی؟" اور جیوتسنا' مینجل کی تصویر کو میز پر پڑی کتابوں میں تلاش کرنے لگی۔ وہ تصویر بھی مل گئی۔ جیوتسنا نے اس تصویر کو اپنے بٹوے میں رکھتے ہوئے کہا' "یہ بدلے میں!"

جیوتسنا مینجل کی تصویر لے گئی تو مینجل کے پیر جیسے زمین سے کچھ اوپر اٹھ گئے۔ اس کے دن اور رات حسین اور دلکش تصورات میں بیتنے لگے۔ وہ رات میں اپنے تکیے کو جیوتسنا سمجھ کر مسکرائے ہوئے میٹھی نیند کی آغوش میں چلا جاتا تھا۔ لیکن پھر بھی اسے کبھی سواری پر بھی جیوتسنا کے ساتھ بیٹھنے کا موقع ملتا تو دونوں کے بیچ نہر سوئز کی مانند فاصلہ قائم رہتا تھا' جس میں نیک چلنی کی دھار محفوظ ڈھنگ سے بہتی رہتی تھی۔

محرم کی چھٹی کی وجہ سے بینک اور کالج دونوں ہی بند تھے۔ عموماً چھٹی سے پہلی رات کو مینجل کی کپور کے یہاں کھانے کی دعوت ہوتی تھی اور کافی رات تک محفل جمتی تھی۔ شام کو جب مینجل' کپور کے یہاں پہنچا تو کپور اور جیوتسنا دونوں ہی نہیں تھے۔ مینجل بیٹھک میں بیٹھ گیا اور ایک انگریزی دکان کی فہرست دیکھنے لگا۔ کچھ دیر میں تانگا آیا۔ تانگے سے جیوتسنا بہت پھرتی سے اتری۔ گھر پر موجود نہ ہونے پر معذرت کرتے ہوئے اس نے بتایا' "راستے میں بینک کے منیجر صاحب مل گئے تھے۔ انہوں نے انہیں روک لیا۔ ابھی آتے ہوں گے۔" جیوتسنا نے فہرست مینجل کے ہاتھ سے لے کر پوچھا' "اس میں کیا دیکھ رہے ہیں؟"

"کچھ نہیں" مینجل نے جواب دیا' "بہت سی چیزیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں

خریدنے یا حاصل کرپانے کا اختیار نہیں ہوتا' ان کی تصویریں دیکھ کر یا انہیں یاد کرکے ہی دل بہلا لینا ہوتا ہے۔"

جیوتسنا میبل کو اندر آنگن میں لے گئی۔ آنگن میں چھڑکاؤ کرکے اور گملے دھوکر آنگن کو ٹھنڈا کر دیا گیا تھا۔ جیوتسنا نے میبل کو آنگن میں کرسی رکھوا کر بیٹھا دیا۔

میبل نے پوچھا' "آپ لوگ کہاں گئے تھے؟"

جیوتسنا میبل کے سامنے کرسی کا سہارا لیے کھڑی تھی۔ اس نے جواب دیا۔ "امام باڑے میں محرم کی روشنی ہوتی ہے نہ' بے چارے ہمیشہ پاس بھیج دیتے ہیں۔ یہ کبھی جاتے ہی نہیں۔ آج وہیں گئے تھے۔ سوچا تھا' آپ کو ساتھ لے کر جائیں گے لیکن ڈاکٹر رشید گاڑی لے کر آگئے تھے۔ وہ ہمیں دوسرے ہی راستے سے لے گئے۔"

"آپ کھڑی ہی رہیں گی؟" میبل نے پوچھا۔

"نہیں تو۔" جواب دے کر جیوتسنا سامنے کی کرسی پر بیٹھ گئی۔ جوگیا رنگ کی ساڑی کے زری دار کنارے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے' اس نے پوچھا۔ "یہ ساڑی آپ کو پسند آئی!"

"آپ کا مطلب ہے کنارہ!" انگوٹھے کو دانت سے کاٹتے ہوئے میبل نے کہا' "اچھا ہے۔"

"میں کہہ رہی ہوں' ساڑی!" جیوتسنا نے جھنجلاہٹ ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"صرف ساڑی کی مجھے کوئی پہچان نہیں۔"

"آپ تو ہمیشہ ٹیڑھی بات کہتے ہیں۔" جیوتسنا نے کہا اور کرسی سے پیٹھ لگاکر' موضوع بدلتے ہوئے پوچھا' "اچھا یہ بتائیے' مردوں کو یوں گھورنے سے کیا ملتا ہے؟ امام باڑے سے امین آباد ہوکر ہم تانگے پر واپس آرہے تھے۔ بینک منیجر نے انہیں روک لیا۔ تانگے میں' میں اکیلی رہ گئی۔ بس ایک جنٹلمین نے سائیکل پیچھے لگادی۔ ناکہ ہنڈولے کے چوراہے پر دونوں طرف سے موٹریں آگئیں۔ بابو صاحب بچتے بچتے ایک دکان کے تختے سے ٹکرائے۔ پتلون پھٹ گئی' خوب مزہ آیا۔ میں حیران ہوں' یوں دیکھنے سے مردوں کو ملتا کیا ہے؟"

میبل نے انگوٹھے کو دانت سے کاٹتے ہوئے جواب دیا' "آپ روشنی دیکھنے گئی

تھیں نہ! اسے دیکھنے سے کیا ملتا ہے؟ آپ کو امام باڑے کی روشنی اچھی لگتی ہے۔ کسی کو آپ کے چہرے پر ہی روشنی دکھائی دیتی ہے۔"

جیوتسنا نے شرم سے مندتی ہوئی آنکھوں سے مبجل کو سرزنش کی' "بڑے وہ ہیں آپ!"

"وہ کون؟" چونک کر مبجل نے پوچھا' "تانگے کے پیچھے سائیکل لگاکر چوٹ کھانے والا یا امام باڑے کی روشنی پر فریفتہ ہونے ولا؟ بے جان پر فریفتہ ہونے کی میری عمر نہیں اور اگر میں کسی کے پیچھے جاؤں اور وہ میرے چوٹ کھانے اور میری پینٹ پھٹنے پر خوش ہو تو میں سمجھوں کہ ایسے مغرور شخص سے بات نہیں کرنی چاہئے۔"

جیوتسنا نے غرور کے الزام پر چونک کر پوچھا' "غرور کی اس میں کیا بات ہے؟"

"مردوں کو متوجہ کرسکنے کی طاقت پر ہی عورتوں کی زندگی کا دارومدار ہوتا ہے۔ مردوں کے متوجہ ہوجانے کی کمزوری پر ہی عورتیں ان کو بدنام کرتی ہیں۔" فرش کی طرف نظریں کیے ہوئے' مبجل نے جواب دیا اور جیوتسنا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا' "فرض کیجئے' امام باڑے والے خوب عمدہ رنگ برنگی روشنی کریں اور پھر دیکھنے والوں کو گالیاں اور دھکے دیں؟"

"کیا مطلب؟" تیوری چڑھا کر جیوتسنا نے پوچھا۔

"مطلب نہ سمجھنے کا بھی غرور ہوتا ہے۔" ہچکچاتے ہوئے دھیمی آواز میں مبجل نے جواب دیا۔

اس غیرواضح جواب کا مطلب بہت گہرائی تک سمجھ کر' گلابی ہوتی ہوئی آنکھوں کو نیچے جھکا کر جیوتسنا نے کہا' "ہم تو ایسی جگہ کبھی نہ جائیں! ہمیں تو انہوں نے خود پاس بھیجے ہیں..."

جیوتسنا کو ٹوک کر مبجل بولا' "اور آپ پاس دینا پسند نہیں کرتیں۔"

جیوتسنا نے مبجل کے مذاق سے پیدا شدہ لرزش کو چھپانے کے لئے ساڑی کا آنچل کھینچ کر نظریں گملوں کی طرف مرکوز کردیں۔ مبجل کے اشارے کی پہنچ سے ایک سیڑھی اور اوپر چڑھ جانے کے لئے اس نے کہا' "آپ کی تو باتوں کا مطلب سمجھنا بڑا

مشکل ہے!"

بیجل نے پوچھا' "کیا نامناسب بات کہہ دی' میں نے؟"

نظریں سامنے کرکے جیوتسنا نے پوچھا' "یہ میں نے کب کہا لیکن مردوں کا عورتوں کو تنگ کرنا کیا مناسب ہے؟"

نہ سمجھنے کی جو مضبوط دیوار جیوتسنا اپنے چاروں طرف کھڑی کر لینا چاہتی تھی' بیجل اس پر ضرب لگانے کے لئے اپنی پوری ہمت یکجا کرکے بولا' "سڑک کے کنارے کے پیڑوں کو تو مرد تنگ نہیں کرتے' نہ وہ بجلی کے کھمبوں کو گھورتے ہیں۔ مردوں کو متوجہ کرنے کی کوشش کرکے' ان پر تنگ کرنے کا الزام لگانا کتنی بڑی بے انصافی ہے؟" جیوتسنا اس بات کو سمجھنے سے یقیناً انکار کردے گی' یہ سوچ کر بے قراری سے بیجل بولا' "یہ تو آپ کو ماننا ہی پڑے گا کہ عورت اور مرد کی باہمی کشش میں عورت کا کام' چاہنے کے لائق چیز بن کر مرد کو دعوت دینا ہے اور مرد کا کام' اسے پانے کے لئے کوشش کرنا!"

بیجل کی صاف گوئی سے جیوتسنا کے جسم میں سنسنی سی پیدا ہوگئی۔ نسوانی وقار کو برقرار رکھتے مرد کے اضطراب سے لطف اندوز ہونے کے لئے اس نے کہا' "لیکن عورتیں تو مردوں کو تنگ نہیں کرتیں۔"

بیجل نے اپنی کرسی پر آگے جھک کر پوچھا' "کیا عورتیں مردوں کی طرف متوجہ نہیں ہوتیں؟"

جیوتسنا نے سنجیدگی سے غیر جانبدارانہ انداز میں کہا' "عورتیں مردوں کے پیچھے کب بھاگتی ہیں؟"

بیجل ہنس پڑا' "معاف کیجئے گا' عورتوں کا تو دعوا ہے کہ عورتیں جس طرح محبت کرتی ہیں اور محبت کی خاطر جس طرح قربانی دے سکتی ہیں وہ مرد کبھی نہیں کرسکتے۔"

"ہاں' یہ بات بالکل ٹھیک ہے" جیوتسنا نے اس دعوے کی تائید کی۔

بیجل نے مسکراہٹ روکنے کے لئے ہونٹ دباتے ہوئے کہا' "محبت کرتی ہیں' محبت میں قربانی دے سکتی ہیں لیکن متوجہ نہیں ہوتیں۔ بغیر کشش محبت کیسی ہوتی

ہے؟"

جیوتسنا نے اپنی جھینپ چھپانے کے لئے فوراً جواب دیا' "عورتیں مردوں کی طرح ہر جگہ محبت کرنے کے لئے باولی نہیں ہوتیں۔ انہیں جہاں محبت کرنی چاہئے' وہیں محبت کرتی ہیں۔" جیوتسنا کہنے کو تو کہہ گئی لیکن پھر خیال آیا کہ میجل کے جذبات کو ٹھیس نہ پہنچے' کہیں وہ اس بات کو ذاتی سمجھ کر ناراض نہ ہوجائے۔ اس نے میجل کی طرف اپنائیت بھری لیکن مشکوک نظر سے دیکھا۔

میجل نے جیوتسنا کی اس کیفیت کو نظر انداز کرکے تیکھے طنز سے جواب دیا' "ضرور' محبت کہاں کرنی چاہیے کہاں نہیں' بھگوان کے یہاں سے اس بات کا حکم عورتوں کے پاس آتا ہوگا اور مردوں کے پاس ایسا کوئی پیغام نہیں آپاتا۔ یہ کہئے' عورتوں کو جہاں دھکیل دیا جاتا ہے' اپنی مجبوری کی وجہ سے وہیں محبت کا ڈراما کرنے لگتی ہیں۔ مردوں میں تھوڑی بہت آزادی یا بے باکی ہے اس لئے وہ اپنی خواہش سے محبت کرنے کی کوشش کرکے آوارہ بن جاتے ہیں۔ کیوں صاحب' محبت اجازت لے کر کی جاتی ہے یا خواہش سے؟ اجازت لے کر کی جانے والی محبت کو محبت نہیں غلامی کہنا ہی مناسب ہوگا۔ میری رائے میں مجبور ہوکر عمر بھر محبت کرنے کے مقابلے میں اپنی خواہش سے لمحے بھر محبت کرلینا زیادہ اچھا ہے۔"

وہ کیا کہے جارہا ہے' یہ خیال آتے ہی میجل خاموش ہوگیا۔

جیوتسنا کے چہرے پر دوران خون کی حرارت چھاگئی۔ نہ سمجھنے کی بات اب وہ کس طرح کہے؟ سراسیمگی کی حالت میں اس کا سر گھومنے لگا۔ اسی وقت چھوٹا لڑکا نو دوڑتا ہوا آیا۔ جیوتسنا کے گھٹنے سے لپٹ کر ٹھنکتے ہوئے اس نے شکایت کی' "ماں' چاچاجی ہمیں جھنیمانی لے گئے۔"

میجل کے پرزور حملے سے پناہ حاصل کرنے کے لئے جیوسنا کسی بے سہارا کی طرح نو سے لپٹ گئی۔ بیٹے کو دل سے لگالینے کے لئے اٹھا کر گود میں کھڑا کرلیا۔ گیلی مٹی سے سنے بچے کے جوتوں سے زری دار ساڑی خراب ہوجانے کا بھی خیال نہیں رہا۔

جیوتسنا نے بچے کے گال سے گال ملا کر کہا۔۔ "چھوٹے چھوٹے راجہ بیٹے

کہیں گھما جاتے ہیں۔"

نو نے ماں کی شفقت بھری پناہ سے چھوٹنے کے لئے چھٹپٹاتے ہوئے کہا'
"ہاں' رجو بھیا کو چاچاجی گھمالے جاتے ہیں۔"

جیوتسنا نے میجل سے آڑ قائم رکھنے کے لئے نو کو بانہوں میں سمیٹ کر سمجھایا'
"رجو بھیا تو اسکول جاتے ہیں۔ جب نو بابو اسکول جائیں گے تو چاچاجی سنیما بھی لے جائیں گے۔" اس نے میجل کی طرف دیکھے بغیر ہی پوچھ لیا' "کیوں میجل صاحب' آپ نو کو بھی سنیما لے جائیں گے نہ؟"

میجل جواب نہیں دے سکا۔ وہ اپنے اضطراب کو خاموش رہ کر ہی ظاہر کر سکتا تھا۔ شاید اس لئے کہ اسے موزوں الفاظ نہیں مل سکتے تھے۔ جیوتسنا نے میجل کے سامنے سپر انداز دل کو قابو میں کرنے کے لئے نو کے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے اپنی آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا' آپ بیٹھئے' میں آتی ہوں۔" اور اٹھ کر اندر چلی گئی۔

میجل کو محسوس ہوا' جیوتسنا اس کے جذبات کو کچل دینے کے لئے ہی چلی گئی ہے۔ وہ کچھ نہ بول سکا لیکن اس چوٹ پر ردعمل ظاہر نہ کرنا بھی ممکن نہیں تھا۔ اس نے نوکر کو بلا کر کہا۔۔ صاحب سے کہہ دینا' ہم جا رہے ہیں' ہم نے بہت انتظار کیا۔'

نوکر اس گھر میں میجل کے مقام سے واقف تھا۔ اس نے التجا کی۔۔ "صاحب ابھی آتے ہوں گے' بیٹھئے کھانا تیار ہے۔"

اسے رکتے ہوئے نہ دیکھ کر نوکر نے پھر کہا' "بی بی ابھی آتی ہیں... ان سے کہہ دوں' آپ جا رہے ہیں۔"

جیوتسنا جارجٹ کی سفید ساڑی پہن کر آئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ سفید ساڑی میجل کو پسند ہے۔ میجل کے چلے جانے کی بات سن کر اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ یہ ضرب میجل کے دلخراش الفاظ کے تیروں سے کہیں زیادہ تکلیف دہ تھی۔ وہ اپنے مضطرب دل کو سنبھال کر بڑی مشکل سے آنسو روک کر نوکر پر برس پڑی' "تم نے کیوں جانے دیا؟" وہ یہ بھی بھول گئی کہ نوکر ہاتھ پکڑ کر مہمان کو روک نہیں سکتا تھا۔

جیوتسنا بہت بے چین تھی۔ اسی وقت گھر کے دروازے پر منیجر کی موٹر کا ہارن

سنائی دیا۔ کپور اتاولے قدموں سے اندر داخل ہوئے۔ حیرت سے انہوں نے پوچھا،
"میبل نہیں آیا؟"

کپور کو جب یہ معلوم ہوا کہ میبل آیا تھا لیکن چلا گیا تو وہ بیوی پر بگڑے بغیر نہ رہ سکے۔ غصے میں اونچی آواز سے انہوں نے کہا، "آخر تمہیں پہلے سے کس لئے بھیج دیا تھا؟ تم اسے پندرہ منٹ نہیں روک سکیں؟ کسی سے بات کرنے کی تمیز بھی تم میں نہیں••• اسے کھانے پر بلایا تھا۔ اس کے نوکر نے کھانا بھی نہیں پکایا ہوگا۔ اتنی بھی عقل تم میں نہیں۔ تم دس منٹ ٹھہر کر ہی کپڑے بدل لیتیں••• کون سا طوفان آجاتا؟"

جیوتسنا کی آنکھوں اور دل سے اُمڈتے بادل برس پڑے۔ آنچل میں منھ لپیٹ کر وہ پلنگ پر جاکر لیٹ گئی اور زور زور سے رونے لگی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ شوہر، اسے پھٹکارے اور وہ جی بھر کر رو سکے۔ اس رونے کی وجہ کپور کے سخت الفاظ نہیں بلکہ میبل کا روٹھ کر چلا جانا تھا اور اسے ناراض کردینے والی اس کی اپنی لاچاری تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ دھول میں مل جائے، زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائے! بہت دنوں سے دبے ہوئے تشنہ جذبات اور ذہنی آلام ابھرے چلے آرہے تھے۔ کپور نے نوکر سے فوراً سائیکل نکالنے کے لئے کہا اور پیر پٹختے ہوئے میبل کو بلانے کے لئے چلے گئے۔ جیوتسنا آنچل میں منھ لپیٹے ہوئے روتی رہی۔

کپور کو میبل گھر پر نہیں ملا۔ واپسی پر کپور اور بھی بگڑے۔ کچھ دیر بعد وہ ایک بار پھر میبل کے گھر جانے کو تیار ہوئے لیکن سوچا، نہ جانے وہ ابھی واپس آیا ہے یا نہیں! شاید کسی ہوٹل میں چلا گیا ہو۔ یا کسی دوست کے گھر! ہوسکتا ہے چڑیا گھر کی سونی، اندھیری سڑکوں پر ہی گھوم رہا ہو! اس وقت جانا بے کار سمجھ کر کپور چپ بیٹھے رہے۔ جیوتسنا اس دوران روتی رہی۔

کپور نے رات میں دیر سے کھانا کھایا۔ کھانا پیٹ میں پہنچنے سے ان کا غصہ دب گیا۔ وہ جیوتسنا کو منانے لگے۔ الفاظ سے ناکام ہونے پر دوسرے طریقے استعمال کیے۔ پہلے بھی ایسا ہوچکا تھا۔ جس حد پر پہنچ کر جیوتسنا کی ضد ختم ہوجاتی تھی، وہاں آج کپور کی جدوجہد ناکام رہی۔ جیوتسنا کا جسم سبھی اشاروں کے لئے ست اور ساکن بنا رہا۔ وہ

غصے کی حالت میں سسکیاں لیتی رہی۔ جیوتسنا کو بہت زیادہ ڈانٹنے کے لئے کپور کو پچھتاوا ہونے لگا۔ انہوں نے فیصلہ کیا، صبح جلدی اٹھ کر نیبل کو بلا لائیں گے۔

جیوتسنا سسکیاں لیتی ہوئی سوچتی رہی کہ کیا کرے؟ اس نے تمام فرائض کے ساتھ محبت کا فرض بھی پورا کیا تھا لیکن یہ کشش خود ہی اٹھ رہی تھی؟... اس محبت کو کیا وہ روک سکتی تھی؟

کپور بہت دیر سے سوئے تھے۔ صبح آنکھ بھی دیر سے کھلی۔ جب تک حتی الامکان جلدی جلدی شیو کرکے اور کپڑے بدل کر بینک کے راستے میں واقع نیبل کے گھر پہنچے، تب تک وہ کالج جا چکا تھا۔

جیوتسنا نے رونے کی وجہ سے سوجی ہوئی آنکھوں کو گلاب کے عرق سے دھویا۔ وہ گھر کے متعدد کاموں میں مصروف ہونے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اسے ہر بات میں ہر کام میں اور ہر جگہ نیبل کی ناراضگی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ کرتی تو کیا کرتی؟ محبت اور کشش کی جو تفسیر نیبل اس کے سامنے کر گیا تھا، اس کے الفاظ مسلسل کانوں میں گونج کر بے مروتی، تحقیر اور غلامی کا الزام اس پر لگا رہے تھے۔ جیوتسنا کے لئے وہ سائیکالوجی نہیں بلکہ نیبل کی ہیجان انگیز خود سپردگی تھی اور وہ بے بس تھی، قبول کر لینے میں اور انکار کر دینے میں بھی... اتنی عمر تک محبت کا فرض نبھانے کے بعد اب محبت خود دل میں اٹھ کر اسے خوف زدہ بے قرار کر رہی تھی۔

کپور نے چار دن میں تین بار جیوتسنا کو لے کر اور ایک بار اکیلے ہی نیبل کے گھر چکر لگائے۔ اتفاق سے نیبل نہیں ملا۔ ہولی سے پہلے کی شام کو کپور اور جیوتسنا بہت دیر تک اس کے گھر میں بیٹھے رہے۔ رات ساڑھے گیارہ بجے تک بھی نیبل گھر نہیں لوٹا۔ کپور نے سمجھا، سنیما کے دوسرے شو میں چلا گیا ہوگا۔ گھر لوٹنے کے لئے اٹھتے ہوئے انہوں نے کہا، "سنیما میں جانا تھا تو کمبخت پاس کیوں نہیں لے گیا؟" جیوتسنا نے شوہر کی لاعلمی پر مایوسی کے ساتھ سوچا، ہاں، اگر ناراضگی کی قیمت دو چار روپے ہوتی!"

جیوتسنا کو گھر واپس آتے ہوئے کچھ دن پہلے یک بات یاد آ رہی تھی۔ ہولی کے آنے والے شور شرابے کا ذکر ہونے پر اس نے نیبل سے پوچھا تھا۔۔ "کیا آپ بھی

ہولی کھیلتے ہیں؟" میجل نے گہری معنی خیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا تھا۔۔
"واہ، میں تو اس دن کا انتظار کب سے کر رہا ہوں۔ اس دن تو سب قصور معاف ہوں گے۔" اس جواب پر جیوتسنا کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ سرہلا کر اور ہونٹ دبا کر وہ مسکرادی تھی۔ میجل کی اس بات کو یاد کرتے ہوئے دل منھ کو آنے لگا۔۔ کل ہولی ہے۔ معافی کا حق جتا کر قصور کرنے کی دھونس دینے والا کہاں ہے؟... دانتوں سے ہونٹ دبا کر جیوتسنا نے اُمڈتے ہوئے آنسوؤں کا گھونٹ بھر لیا۔

کپور نے ارادہ کیا کہ صبح اٹھتے ہی بہت سارنگ لے کر میجل کے یہاں جائیں گے، اس کا منھ لال اور ہاتھ پیر نیلے کر کے، کان پکڑ کر گھر لائیں گے اور اچھی طرح اس کی خبر لی جائے گی۔ جب صبح نو کے اولی۔ اولی، چلانے اور رجو کے بالٹی پٹخنے کی آواز سے کپور کی آنکھ کھلی تو پڑوس کے لوگ رنگ اور پچکاری لے کر ان کے آنگن میں آگئے تھے۔ کپور کو سب سے پہلے میجل کا خیال آیا لیکن خوشی کے اس کہرام میں وہ خیال دب گیا۔ پڑوس کے لوگوں کے بعد، بینک کے لوگ اور اس کے بعد ڈاکٹر ساہنی، وکیل نگم اور لالہ رام پرساد آگئے۔ نہ جانے کتنی بار مٹھائی آئی اور کتنی بار پان دان میں چونا اور کتھا ختم ہوا۔ ایک بج گیا اور وہ لوگ میجل کے یہاں نہ جاسکے۔

لکھنؤ میں ہولی کا رنگ ایک بجے تک بند ہو جاتا ہے۔ ایک بجے کے بعد لال ہرے رنگ میں شرابور کپڑوں سے میجل کے گھر کیسے جانا ہوتا! نہا دھو کر کپور نے تانگا منگوایا اور میجل سے ملنے کے لئے چل دیے۔ سوکھا رنگ ساتھ لے لیا تھا۔ میجل کے گھر پہنچ کر دیکھا، ہولی کے پاگل پن کا کوئی نشان نہیں تھا۔ نوکر چادر اوڑھ کر باورچی خانے میں سو رہا تھا۔ میجل اپنے سونے کے کمرے میں شب خوابی کا دھاری دار لباس پہنے، سڑک کی سمت والی کھڑکی کی طرف منھ کیے، سگریٹ پیتے ہوئے گا رہا تھا:

"عشق میں یوں ہی بے سکوں کٹتی ہیں زندگانیاں!"

کپور نے رنگ کی پڑیا کھولتے ہوئے کہا، "واہ رے شیطان! بیس دفعہ تمہارے یہاں چکر لگائے اور تم ہولی کے دن بھی نہ آسکے!" اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہہ سکے، کپور نے رنگ اس کے منھ اور بالوں میں بھر دیا۔ جیوتسنا محسوس کر رہی تھی کہ میجل نے وہ سارا دن سگریٹ پیتے ہوئے اور عشق کی بے سکونی کا رونا روتے ہوئے گذارا

تھا- اور اسے یاد آرہا تھا' اس کا ہولی کے دن معافی کے حق سے قصور کرنے کا ارمان!

"ہولی کے دن تو سب ناراضگیاں ختم ہوجاتی ہیں-" جیوتسنا مسکراتی آنکھوں سے آگے بڑھ گئی- دلکش قصور کی معافی جبراً لے کر اور مبجل کی بے سکونی کو سکون بخشنے کے لئے اس نے اپنے ہاتھوں سے مبجل کے چہرے پر گلال مل کر ایک ہلکا سا چپت بھی لگا دیا-

مبجل نے بھی مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے دونوں کے چہرے پر رنگ ملا اور پھر اس دوران ناگہانی اڑچن آجانے کی وجہ سے ان کے یہاں نہ آنے کی صفائی پیش کی-

کپور' جیوتسنا اور مبجل بیٹھ کر باتیں کر رہے تھے- جیوتسنا محسوس کر رہی تھی کہ مبجل اس سے نگاہیں بچا رہا ہے- مبجل کی اس ناراضگی سے اس کے دل میں گدگدی ہو رہی تھی- وہ مسکرا رہی تھی کہ یہ ناراضگی ابھی دور ہوجائے گی- کپور نے تھک کر ایک سگریٹ سلگایا اور چہرے کی جلد پر سوکھے رنگ کی رگڑ سے محسوس ہونے والی چنچناہٹ دور کرنے کے لئے کہا' "نہائیں گے!"

مبجل کے نوکر نے کپور کے لئے مالک کے بکس سے قمیص' دھوتی اور تولیہ نکال دیا- حکم پاکر وہ کپور کے گھر سے جیوتسنا کے لئے ساڑی لینے چلا گیا-

کپور کے نہا چکنے کے انتظار میں مبجل سگریٹ پیتا ہوا' کمرے میں ٹہلنے لگا- جیوتسنا اس کی باقی ماندہ ناراضگی کو دیکھ کر مسکرا رہی تھی- قریب آکر' اس کے کندھے سے سر لگا کر نظریں اوپر کرکے اس نے پوچھا' کہئے' ہولی کے دن کون سا قصور کرنے کا ارمان تھا! اتنی ناراضگی؟"

مبجل نے جذبات سے عاری چہرے اور آواز میں جواب دیا' "میں سمجھا نہیں-"

اس نے اپنا سر مبجل کے سینے سے لگا کر انگلیوں کو دباتے ہوئے ڈیکھے ہوئے انداز میں کہا' "اب ناراضگی ختم کرو! کہتے ہیں' آج کے دن سب قصور معاف ہوتے ہیں- زندگی میں کسی لمحے سے... سکون؟" اس کا گلا رونده گیا-

مبجل دسہرے کے روان کی طرح ساکت رہا- اس نے ادھ کھلی آنکھوں کی درشت نظر جیوتسنا کے چہرے پر ڈال کر دھیمے لیکن روکھے انداز میں کہا' "سکون اپنی

ہی چیز سے ہونا چاہئے' پرائی چیز سے نہیں۔"

جیوتسنا کا چہرہ لال ہوگیا' "عورت مرد کی ملکیت ہوتی ہے؟' اس نے گھور کر پوچھا۔

"ہوتی ہے۔" ایک لحہ ساکت رہ کر میجل نے جواب دیا' "مردوں کو آپس میں ایک دوسرے کے حق ملکیت کی حفاظت کرنی چاہیے!"

جیوتسنا کو محسوس ہوا جیسے سر چکرانے سے وہ گر پڑے گی۔ جلدی جلدی سانس لیتے ہوئے وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے سر کرسی کی پشت سے ٹکادیا۔ میجل سگریٹ پیتا ہوا باہر برآمدے میں ٹہلنے لگا۔

کپور نے غسل خانے سے نکل کر آواز دی' "ارے کنگھی کہاں ہے" اور جیوتسنا کی طرف دیکھ کر کہا' "تمہاری ساڑی آگئی؟ نہالو!"

تیکھی آواز میں جیوتسنا نے جواب دیا' "نہیں' تانگا منگوایئے۔"

حیرت سے کپور نے پہلے ایک کی طرف اور پھر دوسرے کی طرف دیکھ کر پوچھا' "کیا پھر لڑائی ہو گئی؟"

جیوتسنا نے فرش کی طرف نظریں جھکا کر غصے میں جواب دیا' "کیا میں تمہارے دوستوں کی جوتیاں کھانے کے لئے ہوں؟" آنسوؤں کے طوفان کی وجہ سے وہ ساڑی کے آنچل میں منھ لپیٹ کر سسک سسک کر رونے لگی۔ کپور نے پریشان ہو کر میجل کی طرف دیکھا۔ "ہوا کیا؟"

"میں نے کچھ نہیں کہا۔" میجل نے سگریٹ کا ٹکڑا پھینک کر جواب دیا اور غسل خانے میں جاکر دروازہ بند کرلیا۔ میجل نہاکر نکلا تو کپور اور جیوتسنا جاچکے تھے۔ جیوتسنا کے گھر سے آئی ساڑی اور بلاؤز میز پر پڑے تھے۔ نوکر حیرت اور سراسیمگی کی حالت میں ایک طرف کھڑا تھا۔

تب سے میجل ہولی نہیں کھیلتا۔

زبان

جوان مرد چاہے جتنا بھلا یا نیک کردار ہو' اس کے ساتھ بیوی یا بہن نہ ہو تو اس کی نیک چلنی کا بھروسا نہیں کیا جاسکتا۔ گلی محلے میں اسے مکان کرائے پر نہیں مل سکتا۔ ٹیچر ہربنس لال بھی عورت کی شکل میں نیک چلنی کی ضمانت ساتھ نہ ہونے کی وجہ سے ایسی ہی مصیبت میں مبتلا تھا۔ پنجابی ہونے کے وجہ سے اسے ایک پنجابی خاندان میں دو کمرے کرایے پر مل گئے تھے۔ ایک نوکر رکھ کر وہ وہاں رہتا تھا۔

قسمت کی بات' پنجابی دوست کا تبادلہ ہوگیا۔ وہ اپنے کنبے کو ساتھ لے کر بنارس چلے گئے۔ اس بڑے سے مکان کا سارا کرایہ اکیلے ٹیچر کے سر پر پڑ گیا۔ اگر مکان چھوڑ دیتا تو دوسرا ملنا مشکل تھا۔ ان دنوں خاص مصیبت یہ تھی کہ برما میں جاپانیوں کے حملے کی وجہ سے ہزاروں کی تعداد میں لوگ ملک کے مشرقی علاقوں میں چلے آرہے تھے۔ ان لوگوں کی مہربانی سے جہاں ایندھن' ترکاری اور دودھ مہنگا ہوگیا تھا' وہاں مکانوں کے کرایے بھی بڑھ گئے تھے۔ ایسی حالت میں مکان بدلنا آسان کام نہیں تھا۔

لال نے خط لکھنے کے پیڈ کی دفتی پھاڑ کر لال پنسل سے اس پر لکھا --- روم ٹو لیٹ' اور کھڑکی کی چوکھٹ سے سڑک کی طرف لٹکا دیا۔ چوتھے پہر' وہ کالج سے واپس آکر بیٹھا ہی تھا کہ ناک کی نوک پر چشمہ لگائے' کندھے پر شال' دائیں ہاتھ میں چھڑی اور بائیں ہاتھ میں دھوتی کا کونا تھامے ہوئے' ایک بھلے مانس بنگالی نے خالی کمرے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔

لال سمجھا کہ مکان مہاشے کو پسند ہے۔ اپنے حصے کا بھی کچھ کرایہ ان پر لاد کر' مکان کا بڑا حصہ کرایے پر دے دیا۔ ایسا کرنا کچھ اچھا محسوس نہیں ہوا لیکن پندرہ دن کا کرایہ تو اس کو بھی فالتو ہی دینا پڑا تھا۔

بنگالی خاندان آکر بس گیا۔ بوڑھے موشائے کے ساتھ اس کی بوڑھی بیوی تھی'

جس کے سر پر سہاگ سندور کی لال سڑک شاید عمر کے حساب سے چوڑی ہوتی چلی گئی تھی۔ ناریل کے تیل سے چکنے، ان کے ادھ پکے کالے سفید بالوں میں سندور کی اہمیت ہی سب سے زیادہ تھی۔ ساتھ میں تھی، ایک بیس اکیس برس کی نوجوان لڑکی۔ شرم وحیا سے آنکھیں جھکا کر چلنے والی، کچھ دبی ہوئی سی۔ ماں کی طرح اس کے سر پر سندور کی لال جھنڈی نہیں چمکتی تھی، جس کا مطلب ہوتا تھا۔۔۔ ادھر راستہ بند ہے۔ بڑھاپے کے سہاگ سے لڑکی کے بیراگ کا مقابلہ کر کے لال کے دل میں لڑکی کے لئے پہلے ہی دن سے ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔

لال کو اس کمرے سے اس کمرے میں، باورچی خانے او غسل خانے میں آتی جاتی لڑکی دکھائی دیتی رہتی تھی۔ لال نے دیکھا، اس کی آنکھیں بڑی بڑی تھیں، کسی کو جگہ دینے کے لئے پھیلی پھیلی سی۔ سامنے پڑ جانے پر وہ ایک بار آنکھ اٹھا کر دیکھ لیتی کہ کون آ رہا ہے۔ پھر آنکھیں جھک جاتیں۔

لال کی آنکھیں لڑکی پر رک سی جاتی تھیں۔ اس کا رنگ پنجابی لڑکیوں کی طرح گورا نہیں بلکہ گندمی تھا، جسے بنگلہ میں فرشا کہتے ہیں۔ کیلے کے نئے پتے جیسا رنگ۔ چہرہ ذرا لمبا تھا۔ ناک ابھرے ہوئے ماتھے کے نیچے اٹھی ہوئی اور سیدھی تھی۔ ہونٹ پتلے اور چھوٹے تھے جو عموماً بند رہتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ اگر وہ کھل جائیں تو امرت برس پڑے لیکن وہ بند ہی رہتے تھے۔ ماں باپ کی کسی بات پر کبھی وہ مسکرا دیتی تھی تو دل چاہتا تھا کہ اس کی یہ مسکراہٹ اسی طرح قائم رہے۔ گردن کے پیچھے کافی بڑا اور بھاری سا جوڑا تھا۔ بال کھل جانے پر لہراتے ہوئے، گھٹنوں تک لٹک جاتے تھے جیسے کالے رنگ کی پہاڑی ندی امڈ پڑی ہو۔ جسم کی ساخت میں جہاں جتنا ابھار ہونا چاہیے، اس سے کم یا زیادہ کہیں نہیں تھا۔ ماں باپ اسے پرمیلا کہہ کر پکارتے تھے۔

لال علی الصبح حجامت کے لئے روشنی کی سہولت کے لئے کھڑکی کے سامنے بیٹھ جاتا تھا۔ اس وقت ماں یا باپ کے بلانے پر اگر پرمیلا سامنے جنگلے پر نکل آجاتی تو سیفٹی ریزر لال کے ہاتھ میں رہ جاتا تھا۔ اس کی آنکھیں جنگلے کی طرف لگ جاتی تھیں۔ یہ سب کرتے ہوئے لال کا تردد بھی کم نہیں ہوتا تھا۔

کالج میں ٹیچر ہونے کی وجہ سے اسے اپنی حیثیت کا احساس تھا۔ اس سے زیادہ

اس بات کا خیال تھا کہ جو بات ٹھیک نہیں' اسے کرنے میں خود ہی شرم ہونی چاہیے۔ پھر بھی نظریں ادھر چلی جاتی تھیں۔ وہ دل کو سمجھا لیتا تھا کہ وہ کسی دوسرے کا کچھ نقصان نہیں کر رہا ہے۔ اپنی آنکھوں پر اس کا حق تھا' چاہے جس چیز کو دیکھے لیکن پرمیلا سے نظریں ملنے پر' جب لڑکی کی خوف زدہ نظر سمٹ کر جھک جاتی تھی تو وہ سوچنے لگتا تھا کہ وہ کیوں بیچاری کو تکلیف دیتا ہے؟ اپنی نگاہوں کی آسودگی کے لئے پرمیلا کو تکلیف پہنچانے میں' اسے شرمندگی سی ہوتی تھی۔ کبھی پرمیلا کی آنکھیں اپنی طرف اٹھی ہوئی دیکھ لیتا تھا تو اس کے دل میں امنگ بھی پیدا ہو جاتی تھی۔

پرمیلا کی نظر لال پر پڑ جاتی تھی تو وہ بھی دیکھتی تھی کہ نوجوان مرد ہے۔ مرد کی مردانگی اس کے صحت مند جسم میں ہے۔ چہرے پر تہذیب کی سنجیدگی بھی ہے۔ دیکھنے میں بھلا معلوم ہوتا ہے۔ دیکھ کر اطمینان ہوتا تھا لیکن لال کی نظر اپنی طرف ہونے پر اس کی آنکھیں جھک جاتی تھیں۔

وہ سمجھتی تھی' اسے آڑ میں ہو جانا چاہیے۔ وہ کچھ شرما جاتی تھی لیکن اسے کوئی افسوس نہیں ہوتا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ لال بے شک اسے دیکھے لیکن کسی کو معلوم نہ ہو' خود اسے بھی معلوم نہ ہو۔ وہ بالوں کو اچھی طرح سے سنوارتی تھی۔ اور اپنی سادہ ساڑی بڑے سلیقے سے باندھتی تھی' خاص کر لال کی کھڑکی کے سامنے سے آتے جاتے وقت۔ اسے معلوم تھا کہ صبح دس بجے سے پہلے اور شام کے چار بجے کے بعد لال' کمرے میں ہی رہتا تھا۔ اس لئے ان اوقات میں اس کی نظر ادھر گھوم جاتی تھی۔

پرمیلا مشرقی بنگال کی پڑھی لکھی اور مہذب لڑکی تھی۔ اسکول میں انگریزی نہیں پڑھی تھی پھر بھی اچھی تعلیم پائی تھی۔ زندگی کی کتاب کے بھی کچھ ورق اس نے پڑھے تھے۔ اس کے معزز باپ بڑی مشکل سے دو بیٹیوں کی شادی کا فرض پورا کر کے تیسری بیٹی کی شادی کی فکر میں تھے۔ پرمیلا نے شادی شدہ عورتوں اور مردوں کی زندگی اپنے خاندان اور پڑوس میں دیکھی تھی۔ اس کا شعور بیدار تھا۔ اس نے دنیا اور انسان کو اپنی بنگلہ زبان کے ذریعے جانا تھا۔ اپنے مستقبل کی زندگی اور دور پھیلی ہوئی دنیا کا تصور بھی اس نے اپنی ہی زبان کے ذریعے حاصل کیا تھا۔ اپنی زبان کی حدود سے

نکل کر اس نے دیکھا تھا کہ اس کے تجربے اور زبان کی پوشیدہ حدوں سے آگے بھی ایک بہت بڑی دنیا تھی۔ لال اسی دنیا کا ایک بے انتہا پرکشش فرد تھا۔ وہ اسے اپنی پہنچ کی حد سے آگے دیکھتی تھی۔ کبھی اس کی آواز بھی کانوں میں گونجتی تھی لیکن اس کی حد کے باہر۔ ندی کے اس کنارے پر وہ خود تھی اور دوسرے کنارے پر لال تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ ندی کی رکاوٹ دور ہو جائے۔ دونوں دنیاؤں میں رابطہ پیدا ہو جائے۔

ایک دن لال غسل خانے سے نہا کر نکل رہا تھا۔ بھیگے بال ماتھے پر بکھرے ہوئے تھے۔ ہاتھوں میں صابن، تیل، ٹوتھ برش لیے اور کندھے پر تولیا ڈالے، سر جھکائے وہ اپنے کمرے کے زینے کی طرف جا رہا تھا۔ باورچی خانے کی طرف سے آتی ہوئی پرمیلا سے اس کی ٹکر ہو گئی۔ دونوں ٹھٹک کر فوراً پیچھے ہٹ گئے۔ اس وقت لال کے منھ سے صرف دو الفاظ انگریزی میں نکل پائے—— ویری سوری، کھلے ہوئے بالوں میں پرمیلا کا گندمی چہرہ بالکل سرخ ہو گیا تھا۔ ایک لمحے کے چھوٹے سے حصے میں ہی یہ سب ہو گیا لیکن اس کے اثر سے دونوں کے جسم میں دن بھر سنسنی پیدا ہوتی رہی۔ ان کے تصور میں ہلچل ہوتی رہی۔

لال دن بھر سوچتا رہا کہ جو کچھ بھی ہوا، اس میں اس کا قصور کچھ بھی نہیں تھا، پھر پرمیلا اس بات سے ناراض کیوں ہوئی ہو گی؟••• اسے محسوس ہوا جیسے پرمیلا کے جسم کے لمس سے اس کے اپنے جسم میں ایک عجیب سی برقی رو دوڑی تھی۔ کیا پرمیلا کو بھی ایسا ہی محسوس ہوا ہو گا؟••• شاید وہ پہلے کے مقابلے اب اور بھی زیادہ شرم محسوس کرے گی!

لال کا دل چاہتا تھا کہ وہ ہمت کر کے پرمیلا کے سامنے جا کر کھڑا ہو جائے۔ اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہہ دے—— میں تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔ لیکن تصور میں ہی اسے دکھائی دیتا کہ پرمیلا اس کی جسارت سے خوف زدہ ہو کر ایسے سکڑ گئی جیسے برسات کی سیلن میں چلتا ہوا کیچوا، کسی چیز کے چھو جانے سے سمٹ جاتا ہے۔ جو بھی ہو، وہ فیصلہ کر لینا چاہتا تھا کہ پرمیلا کا اس کے لئے کیا جذبہ ہے؟

لال نے ایک کاغذ پر دو سطریں لکھ کر اپنی صفائی پیش کرنے کی ضرورت محسوس

کی، لیکن سمجھ میں نہیں آیا کہ لکھے کس زبان میں؟ بنگلہ وہ جانتا نہیں اور ہندی پرمیلا شاید ہی جانتی ہو! انگریزی بھی وہ جانتی ہے یا نہیں؟ کیا کسی بنگلہ جاننے والے سے لکھوا لائے؟ وہ صرف اتنا لکھوانا چاہتا تھا۔۔ ''امید ہے کہ میں آپ کی نظر میں قصور وار نہیں ہوں۔''

غسل کے بعد، جنگلے پر ٹکر ہوجانا ایسی خطرناک بات نہیں تھی، وہ ناگہانی واقعہ تھا۔ قصور ہو سکتا تھا، پرمیلا کے سامنے نظروں سے محبت ظاہر کرنا۔ کسی خوبصورت لڑکی یا عورت کے سامنے مرد کا محبت ظاہر کرنا، عورت کی توہین ہے؟۔۔۔ کیوں؟

اتوار کے دن، لال اپنی کھڑکی کے سامنے بیٹھا ایک کتاب پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن دل اچاٹ تھا۔ اس کی نظر بار بار بھٹک کر پرمیلا کے کمرے کے دروازے کی طرف چلی جاتی تھی۔ دو سطریں لکھ کر اپنے دل کی پریشانی دور کر لینے کی خواہش بار بار پیدا ہوتی تھی۔

سڑک کے پار، سامنے کے مکان کی منڈیر پر سفید کبوتروں کا جوڑا آکر بیٹھا۔ کبوتری اپنی ننھی ننھی لال موتی جیسی آنکھیں بند کر کے منڈیر سے اپنے جسم کو لگا کر، کسی اندیشے اور اضطراب سے نیچے دبی جا رہی تھی۔ کبوتر اپنی روئی کی مانند پھولی ہوئی گردن کو اوپر اٹھا کر کبوتری کو اپنی پرچھائیں میں لے لینا چاہتا تھا۔ جوش سے پھٹتے ہوئے اپنے سینے کے نہایت قریب، لال کو پرمیلا کا شرم سے مضطرب چہرہ اور عاجز آنکھیں دکھائی دینے لگیں، جنہیں وہ آغوش میں لینے کے لئے بے قرار ہو گیا لیکن اس کے پاس وہ زبان نہیں تھی۔ جس سے وہ پرمیلا کو پکارتا۔ اگر لال اور پرمیلا، کبوتر اور کبوتری ہوتے تو کیا زبان کی حدیں انہیں اس طرح دور دور کیے رہتیں؟ کیوں نہیں پرمیلا اس کے سینے سے آکر لگ جاتی۔ وہ خود اسے کیوں نہیں بلا لیتا۔۔۔ اس کے پاس چلا جاتا! انسان ہو کر وہ ایک بے بس جانور کی طرح صرف اضطراب سے اس کی طرف دیکھ سکتا ہے۔

چھجے سے آواز آئی۔ پرمیلا نیچے آنگن میں کام کر رہی ماں سے کچھ کہہ رہی تھی۔ لال کی نظر اس پر گئی۔ پرمیلا بھیگے بال پیٹھ پر پھیلائے ہوئے، چٹائی ہاتھ میں تھام کر اپنی طرف چھت پر دھوپ میں بیٹھنے جا رہی تھی۔

پرمیلا اگر اوپر کی چھت پر کھڑی رہے تو لال سے آنکھیں چار ہو سکتی تھیں- وہ اوپر آئی- اس نے دیکھ لیا کہ لال اسے دیکھ رہا ہے- اب کھڑا رہنا بے شرمی کی بات تھی- چٹائی بچھا کر وہ اینٹوں کے جنگلے کی آڑ میں بیٹھ گئی- وہاں سے وہ لال کو دیکھ سکتی تھی لیکن لال کو اس کا ذرا سا عکس ہی مل سکتا تھا- لال اور بھی بے قرار ہو گیا- اس نے کاغذ کے ایک ٹکڑے پر لکھا-- "امید ہے آپ کی نظر میں' میں قصوروار نہیں ہوں!" ہندی میں لکھنے کے بعد' اس نے پھر وہی لائن انگریزی میں لکھی- وہ جسارت بے جا پر تلا ہوا تھا- ایک کنکر پر لپیٹ کر اس نے پڑیا بنائی اور پرمیلا کے پاس چھت پر پھینک دی- اسے معلوم ہو گیا کہ پرمیلا نے وہ پرچہ اٹھا لیا ہے- کچھ دیر بعد آہٹ سنائی دی- پرمیلا زینے سے اتر کر نیچے چلی گئی تھی اور ماں کو پکار رہی تھی-

لال کا دل کسی اندیشے سے لرز گیا' کیا پرمیلا غصے میں آکر اس کے برتاؤ کی شکایت ماں سے کرنے کے لئے نیچے گئی تھی لیکن پرمیلا کی فطری مسکراہٹ سے اس کا خوف دور ہو گیا- دوسرے ہی لمحے پرمیلا ایک ہاتھ میں کنگھی لے کر اور دوسرے ہاتھ کو ساڑی کے آنچل میں چھپا کر چھت پر لوٹ آئی-

لال دھک دھک کرتے دل سے اس کا انتظار کر رہا تھا- لگ بھگ آدھے گھنٹے بعد اس نے دیکھا کہ پرمیلا نے چھت کی منڈیر پر ایک کاغذ کنکر کے نیچے دبا دیا ہے- کنگھی سے کاڑھے ہوئے اپنے بال پیٹھ پر پھیلائے ہوئے اور چٹائی سنبھالے ہوئے وہ نیچے چلی جا رہی ہے- لال جلدی سے دوسری چھت پر گیا- پرچہ اٹھا کر اس نے دیکھا کہ اس کی دو سطروں کے جواب میں اس کاغذ پر پانچ لائنیں لکھی تھیں- لفظ چھوٹے چھوٹے' گول گول اور بہت خوبصورت تھے' لیکن تھے بنگلہ زبان میں- وہ بے بسی سے ایک گہری سانس لے کر اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گیا کہ کیا کرے؟ کیا ان سطروں کو کسی بنگلہ جاننے والے سے پڑھوا کر سنے- لیکن ایسا کرنے سے اس کے خلاف شک وشبہ کا جال پھیل جائے گا- وہ جانتا تھا کہ بنگالیوں میں صوبہ پرستی کم نہیں ہوتی-

بنگلہ زبان کا پہلا قاعدہ لا کر حرف پہچاننے کی کوشش بھی بے کار ثابت ہوئی- چھپے ہوئے حرف تحریر میں آنے پر کیا سے کیا ہو جاتے ہیں- اپنے لکھے پرزے کے جواب میں لال صرف اتنا سمجھ سکا کہ اس کی کوشش بے کار نہیں ہے- اسے کیا مل

سکتا ہے' یہ معلوم کرنے کی خواہش اسے پاگل کیے دے رہی تھی لیکن کوئی طریقہ نہیں تھا۔ دن میں کئی بار وہ پرزہ اس کے ہاتھ میں آجاتا تھا اور وہ دل مسوس کر رہ جاتا تھا۔

گھوش بابو اپنا وقت کاٹنے کے لئے ناریل کی گڑگڑی لیے' لال کی بیٹھک میں آکر بیٹھ جاتے تھے۔ ان کی باتوں میں لال کو کوئی دلچسپی نہیں ہوتی تھی۔ وہ روزانہ آکر سناتے تھے کہ مچھلی کتنی مشکل سے مل جاتی ہے۔ لال کو ان کی بات پر حیرت اور تعجب کا اظہار کرنا ہی پڑتا تھا تاکہ قرابت داری بنی رہے۔ یہ سب باتیں یا تو انگریزی میں ہوتی تھیں یا ریلوے اسٹیشن پر بولی جانے والی ہندوستانی میں۔ گھوش بابو' لال سے قرابت داری اس کی بیٹھک تک ہی محدود رکھنا چاہتے تھے' اپنے کمروں کی طرف نہیں بڑھنے دیتے تھے۔ لال کو اگر کہیں باہر نہ جانا ہو تو گھوش بابو دونوں پاؤں کرسی پر رکھ کر اکڑوں بیٹھ کر دن بھر مناسب اور غیر مناسب باتوں کا ذکر تو کرسکتے تھے لیکن اپنے کمروں کی طرف جہاں ان کی بوڑھی بیوی اور نوجوان بیٹی محفوظ تھیں' لال کو بلانے کی خواہش انہوں کی کبھی ظاہر نہیں کی۔

خوف زدہ ہوکر اپنی جان بچانے کے لئے وہ اپنے سانولے سلونے اور رسیلے ملک کی محبت کو چھوڑ کر مغرب کی طرف بھاگ آئے تھے۔ یہ خوف اب انہیں بیکار معلوم ہونے لگا تھا۔ روزانہ ہی واپس جانے کا ذکر کرتے تھے۔ مشکل یہ تھی کہ ۱۹۴۲ء میں سرکار کے خلاف بے اطمینانی ظاہر کرنے کے لئے عوام نے بے قابو ہوکر خود ہی اپنے آنے جانے کے ذرائع' ٹرینوں اور پلوں کو توڑ ڈالا تھا۔ اس وجہ سے مشرقی بنگال تک لمبا سفر کرنے کی سہولت کم ہوگئی تھی۔ ٹرین میں بہت بھیڑ رہتی تھی اور ٹکٹ بہت مشکل سے مل پاتا تھا۔ لال' یہ سب باتیں گھوش بابو سے سنتا تھا تو اس کا دل بے چین ہوجاتا تھا۔۔ ہائے' کیا پرمیلا اس سے دو باتیں کیے بغیر' اسے آگ میں سلگتا رہنے کے لئے چھوڑ کر چل دے گی لیکن وہ کیا کرسکتا تھا؟

بنگال واپس جانے کے لئے ماں باپ کا جوش دیکھ کر پرمیلا کا دل ڈوبنے لگتا تھا۔ لال کی کھڑکی کی طرف وہ تشنہ نظر سے دیکھتی تھی لیکن بے بس تھی۔ ماں کو باورچی

خانے میں مصروف دیکھ کر اور باپ کے سودا لانے کے لئے جانے پر وہ ہمت کر کے لال کی کھڑکی کے سامنے کھڑی ہو جاتی تھی۔ صبح سردی میں دھوپ میں بیٹھنے کے لئے کوئی رسالہ یا سلائی اور بنائی کا کام لے کر وہ سب سے اوپر کی چھت پر پہنچ جاتی تھی۔ اگر لال ہمت کرتا تو چپ چاپ اس کے پاس پہنچ سکتا تھا۔ لال کی نظر پڑنے پر وہ آڑ میں نہیں چھپتی تھی۔ سر جھکا کر ویسے ہی کھڑی رہتی تھی بلکہ کبھی کبھی کنکھیوں سے دیکھ لیتی تھی۔ لال کی بے چینی کو وہ قریب آنے کی دعوت سمجھ کر اس کی بانہوں میں سمٹ جانے کے لئے تیار تھی لیکن لال کی بانہیں اسے سنبھال لینے کے لئے آگے نہیں بڑھ پاتی تھیں۔

پرمیلا کو ایسا محسوس ہوتا جیسے اس کے لئے کہیں کوئی آسرا یا جگہ نہیں ہے۔ اس کا اپنا وجود تھا ضرور لیکن دنیا کے اتنے بڑے گھر میں، اس کے وجود کو رکھنے کے لئے کس بکس، صندوق، الماری یا طاق میں کوئی جگہ نہیں تھی۔ اسے رونا آجاتا تھا اور خواہش ہوتی تھی کہ وہ مر جائے۔

لال نہایت قریب سے ادھر ادھر گذرتی ہوئی پرمیلا کے جسم کے حجم کو محسوس کرتا تھا پرمیلا کے جسم کے لمس سے پر ہوا کی خوشبو سے اس کے جسم کی شریانیں تیز ہو جاتی تھیں۔

بے قراری کی حالت میں ٹوٹے پھوٹے ایک دو الفاظ، اس نے پرمیلا سے کہے۔ جواب میں اس نے صرف سر جھکا دیا۔ ان کا مطلب وہ کیا سمجھے؟ اور پرمیلا ہی اس کے الفاظ کا کیا مطلب سمجھی ہو گی؟

منڈیر پر گردن پھلائے کبوتر کے جذبات کو سمجھنے کے لئے جس طرح کبوتری قریب آکر دبک جاتی ہے، اسی طرح پرمیلا بھی اس کے قریب آکر ست ہو جاتی، لیکن لال تو کبوتر نہیں تھا؟ اس کا جذبہ صرف ہاتھ پیر ہلانے سے نہیں بلکہ الفاظ میں ظاہر ہونا چاہتا تھا۔ ان الفاظ کی پرمیلا تک رسائی نہیں تھی، اسی لئے لال ناکام رہ جاتا تھا۔

اس دن شام کی گاڑھی سے گھوش بابو بنگال جانے کے لئے، صبح سے بستر اور سامان باندھ رہے تھے۔ کچھ کچھ دیر بعد وہ لال کی بیٹھک میں آتے تھے اور خوشی اور امنگ سے چمکتی ہوئی آنکھیں جھپک کر، جو بڑھاپے کی وجہ سے پیلی پڑ گئی تھیں، کہہ

جاتے تھے' "اب تو جاتے ہیں۔ اتنے دن آپ کی رفاقت میں بہت راحت ملی۔" لال مسکرا دیتا تھا لیکن دل جل کر رہ جاتا تھا۔

دس بجے لال کالج تو چلا گیا لیکن اس کا دل قابو سے باہر ہو رہا تھا کہ آج پرمیلا چھن جائے گی۔ وہ پھر کبھی اسے نہیں دیکھ سکے گا۔ دل اور جسم کی بے چینی کی وجہ سے وہ گھر واپس آگیا۔ مکان کی مشرقی سمت سے آتے ہوئے' اس نے دیکھا کہ کچھ ہی دور آگے ایک یکے پر گھوش بابو اپنی بیوی کو لے کر بازار کی طرف چلے جا رہے تھے۔

لال نے گھر کے اندر آکر نوکر کو کسی کام سے باہر بھیج دیا۔ پرمیلا دروازے کی چوکھٹ میں سر جھکائے' اس کی آواز سن رہی تھی۔ لال نے دیکھا اور فوراً نیچے آگیا' بالکل پرمیلا کے پاس آتے ہی اس نے کہا' "آج آپ جا رہی ہیں' ایک بھی بات کیے بغیر؟"

لال کی بانہوں کی پناہ میں آنے کے شدید انتظار میں پرمیلا کا رواں رواں کانپ رہا تھا۔ ہمت یکجا کر کے سر جھکا کر اس نے روندھے گلے سے جواب دیا۔۔ "آمی شارب بھاوے انوگت!"

کچھ بنگلہ زبان' کچھ روندھے گلے اور دھیمی آواز کی وجہ سے لال کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔ ایک شدید کشش کے تحت وہ کھڑا رہا۔ مناسب اور نامناسب کا اندیشہ اس کے تھرتھراتے جسم کو ساکت کیے رہا۔ پرمیلا کے بالوں اور جسم کی خوشبو سے مضطرب ہو کر وہ آگے بڑھنے یا پیچھے ہٹنے سے معذور کھڑا رہا۔ پرمیلا بھی آنسو بہاتی ہوئی سر جھکائے خاموش کھڑی رہی۔

لال بے چین ہو رہا تھا' وہ ہمت کر کے کبوتر کی طرح گردن پھلا کر آگے کیوں نہیں بڑھ سکتا؟ لیکن وہ کبوتر نہیں انسان تھا۔ پرمیلا بھی کبوتری نہیں انسان تھی لیکن اظہار کے سب سے بڑے ذریعہ ـــــ زبان سے محروم۔

گلی میں کھلنے والے مکان کے دروازے پر کنڈی کھڑکانے کی آواز آئی' پھر گھوش بابو کی آواز سنائی دی۔ اس حالت سے خبردار ہو کر لال منہ میں بھرے کڑوے پن کو نگلنے کی کوشش کرتا ہوا' پنجوں کے بل اپنے زینے کی طرف چلا گیا۔ پرمیلا آنکھوں سے آنسو پونچھتی ہوئی اور گلے میں روندھی ہوئی آواز کا دم گھونٹتی ہوئی کنڈی کھولنے کے

لئے دروازے کی طرف بڑھی۔

وہ شام کے وقت گھوش کنبے کو ٹرین میں بیٹھانے بھی گیا۔ اس بھاری بھیڑ میں گھوش بابو لگ بھگ چلتی ٹرین میں پہلے خود اندر جاکر بیوی اور بیٹی کے ہاتھ تھام کر اندر کھینچ رہے تھے۔ لال ہونٹ دبائے دیکھتا رہا۔ گاڑی میں پیر رکھتے وقت بھی پرمیلا کی نظر لال کی طرف ہونے کی وجہ سے وہ لڑکھڑائی۔ "آیئی جے ساودھان" گھوش بابو نے کہا اور اسے اوپر کھینچ کر سنبھال لیا۔

لال ناامیدی سے دم سادھے ہوئے، کبوتر کی طرح گردن اونچی کیے پلیٹ فارم سے لوٹ آیا۔ اس سایے میں چھپنے کے لئے بے قرار کبوتری چھن چکی تھی۔ اس کو حاصل کرپانے کے لئے زبان کا ذریعہ نہیں تھا۔

پردہ

چودھری پیر بخش کے دادا چنگی کے محکمے میں داروغہ تھے۔ آمدنی اچھی تھی۔ ایک چھوٹا سا لیکن پکا مکان بھی انہوں نے بنوالیا تھا۔ لڑکوں کو اچھی تعلیم دلوائی تھی۔ دونوں لڑکے انٹرینس پاس کرکے ریلوے میں ڈاک خانے میں بابو ہوگئے تھے۔ چودھری صاحب کی زندگی میں لڑکوں کی شادی ہوئی' بال بچے بھی ہوئے لیکن عہدوں اور تنخواہ میں کوئی خاص ترقی نہیں ہو سکی' تیس چالیس روپے ماہانہ کے درجے پر ہی رہے۔

چودھری صاحب اپنے زمانے کو یاد کرکے کہتے تھے۔۔ وہ بھی کیا وقت تھا' لوگ مڈل پاس کرکے ڈپٹی کلکٹری کرتے تھے اور آج کل کی تعلیم ہے کہ انٹرینس تک انگریزی پڑھ کر لڑکے تیس چالیس سے آگے نہیں بڑھ پاتے۔ بیٹوں کو اونچے عہدے پر دیکھنے کا ارمان لیے ہوئے ہی انہوں نے آنکھیں بند کرلیں۔

خدا کے فضل سے چودھری صاحب کے کنبے میں ترقی ہوئی۔ چودھری فضل قربان ریلوے میں کام کرتے تھے۔ اللہ نے انہیں چار بیٹے اور تین بیٹیاں دی تھیں۔ چودھری الٰہی بخش ڈاک خانے میں تھے۔ انہیں بھی اللہ نے چار بیٹے اور دو بیٹیاں بخشی تھیں۔

چودھری خاندان اپنے مکان کو حویلی کہتا تھا۔ نام بڑا رکھنے کے بعد بھی جگہ تنگ ہی رہی۔ داروغہ صاحب کے زمانے میں زنانہ الگ تھا اور باہر بیٹھک میں وہ مونڈھے پر بیٹھ کر حقہ پیتے تھے۔ ان کے بعد جگہ کی کمی کے سبب بیٹھک بھی زنانے میں شامل ہوگئی تھی اور گھر کی ڈیوڑھی پر پردہ لٹک گیا تھا۔ بیٹھک نہ ہونے پر بھی گھر کی عزت کا خیال باقی تھا' اس لئے پردہ بوری یا ٹاٹ کا نہیں بلکہ عمدہ قسم کا لٹکایا جاتا تھا۔

بظاہر دونوں بھائیوں کے بچے ایک ہی مکان میں رہتے تھے لیکن اندر سب الگ الگ تھے۔ ڈیوڑھی کا پردہ کون سا بھائی لائے؟ اس پریشانی کا حل یہ ہوا کہ داروغہ

صاحب کے زمانے کی رنگین دریاں ایک کے بعد ایک ڈیوڑھی میں لٹکائی جانے لگیں۔

تیسری نسل کے شادی بیاہ ہونے لگے۔ آخر کار، چودھری خاندان کی اولا کو حویلی چھوڑ کر دوسری جگہ تلاش کرنی پڑی۔ چودھری الٰہی بخش کے بڑے صاحبزادے انٹرینس پاس کرکے بیس روپے ماہانہ پر کلرک ہوگئے۔ دوسرے صاحبزادے مڈل پاس کرکے اسپتال میں کمپاؤنڈر بن گئے۔ جیسے جیسے زمانہ گذرتا گیا، تعلیم اور نوکری دونوں ہی مشکل ہوتی گئیں۔ تیسرے بیٹے ہونہار تھے، انہوں نے وظیفہ حاصل کیا۔ جیسے تیسے مڈل پاس کرکے اسکول میں مدرس ہوکر دیہات چلے گئے۔

چوتھے بیٹے پیر بخش پرائمری سے آگے نہیں بڑھ سکے۔ آج کل کی تعلیم ماں باپ پر بوجھ کے سوائے اور ہے کیا؟ اسکول کی فیس، ہر مہینے اور کتابوں، کاپیوں اور نقشوں کے لئے روپے ہی روپے۔

چودھری پیر بخش کی شادی بھی ہوگئی تھی۔ مولیٰ کے کرم سے بیوی کی گود بھی جلدی ہی بھر گئی۔ پیر بخش نے روزگار کے طور پر خاندان کی عزت کے خیال سے، ایک تیل کی مل میں منشی گیری کرلی تھی۔ تعلیم زیادہ نہیں تھی تو کیا ہوا، سفید پوش خاندان کی عزت کا پاس تو تھا۔ مزدوری اور دست کاری، ان کے کرنے کی چیزیں نہیں تھیں۔ وہ چوکی پر بیٹھتے تھے، قلم دوات کا کام تھا۔

بارہ روپے مہینہ زیادہ نہیں ہوتا۔ چودھری پیر بخش کو مکان ستوا کی کچی بستی میں لینا پڑا۔ مکان کا کرایہ دو روپیہ تھا۔ آس پاس غریب اور کمین لوگوں کی بستی تھی۔ کچی گلی کے بیچوں بیچ لگے نل سے مسلسل ٹپکتے پانی کی دھار بہتی رہتی تھی، اس لئے کنارے پر گھاس اگ آئی تھی۔ نالی پر مچھروں اور مکھیوں کے بادل اڑتے رہتے تھے۔ سامنے رمضانی دھوبی کی بھٹی تھی جس میں سے دھواں اور بجی ملے ابلے کپڑوں کی بو پھیلتی رہتی تھی۔ دائیں طرف ناگرہ بنانے والے بیکانیری موچیوں کے مکان تھے۔ بائیں طرف ورکشاپ میں کام کرنے والے قلی رہتے تھے۔

اس پوری بستی میں چودھری پیر بخش ہی پڑھے لکھے اور سفید پوش تھے۔ صرف ان کے گھر کی ڈیوڑھی پر پردہ تھا۔ سب لوگ انہیں چودھری جی یا منشی جی کہہ کر سلام کرتے تھے۔ ان کے گھر کی عورتوں کو کبھی کسی نے گلی میں نہیں دیکھا تھا۔ ماشاء اللہ،

گھر میں اولاد تو تھی لیکن وہ بھی لڑکیاں۔ چار پانچ برس کی عمر تک کسی کام کاج سے باہر نکلتی تھیں، اس کے بعد گھر کی عزت کے خیال سے ان کا گھر سے باہر نکلنا غیر مناسب سمجھا جاتا تھا۔ پیر بخش خود ہی مسکراتے ہوئے صبح شام کمیٹی کے نل سے گھڑے بھر لاتے تھے۔

چودھری کی تنخواہ پندرہ برس میں بارہ سے اٹھارہ روپئے ہو گئی تھی۔ خدا کا فضل ہوتا ہے تو کبھی کبھی روپئے پیسے کی شکل میں نہیں بلکہ آس اولاد کی شکل میں ہوتا ہے۔ پندرہ برس میں پانچ بچے ہوئے۔ پہلے تین لڑکیاں، بعد میں دو لڑکے۔

دوسری لڑکی ہونے کو تھی تو پیر بخش کی والدہ مدد کے لئے آئی تھیں۔ والد صاحب کا انتقال ہو چکا تھا۔ دوسرا کوئی بھائی والدہ کو واپس لے جانے کے لئے نہیں آیا تو وہ چھوٹے لڑکے کے یہاں ہی رہنے لگیں۔

جہاں بال بچے ہوتے ہیں، گھر بار ہوتا ہے، وہاں سو قسم کے جھنجھٹ ہوتے ہی ہیں۔ کبھی بچے کو تکلیف ہے تو کبھی زچہ کو۔ ایسے وقت میں قرض کی ضرورت کیسے نہ ہو؟ گھر بار رہے تو قرض بھی ہو گا ہی۔

مل کی نوکری کا قاعدہ پکا ہوتا ہے۔ ہر مہینے کی سات تاریخ کو گن کر تنخواہ مل جاتی تھی۔ پیشگی سے مالک کو چڑ تھی۔ کبھی کبھی بہت ضرورت ہونے پر ہی مہربانی کرتے تھے۔ ضرورت پڑنے پر چودھری گھر کی کوئی چھوٹی موٹی چیز رہن رکھ کر ادھار لے آتے تھے۔ رہن رکھنے سے روپئے کے بارہ آنے ہی ملتے تھے۔ بیاج ملا کر سولہ آنے ہو جاتے تھے اور پھر چیز کے گھر واپس آنے کی امید ہی نہیں رہتی تھی۔

محلے میں چودھری پیر بخش کی عزت تھی۔ اس عزت کی بنیاد تھی، گھر کے دروازے پر لٹکا پردہ۔ اندر جو کچھ بھی ہو، پردہ سالم رہتا تھا۔ کبھی کبھی بچوں کی کھینچ تان سے یا بے درد ہوا کے جھونکوں سے اس میں سوراخ ہو جاتے تھے تو پردے کی آڑ میں زنانہ ہاتھ سوئی دھاگا لے کر اس کی مرمت کر دیتے تھے۔

وقت کا کھیل! مکان کی ڈیوڑھی کے کواڑ رفتہ رفتہ بالکل گل گئے تھے۔ کئی بار کسے جانے سے پیچ ٹوٹ گئے تھے اور سوراخ بھی ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ مکان مالک سرجو پانڈے کو اس کی فکر نہیں تھی۔ چودھری اگر کبھی جا کر کہتے سنتے تھے تو جواب ملتا

تھا۔ "کون سی بڑی رقم تھما دیتے ہو! دو روپلی کرایہ اور وہ بھی چھ چھ مہینے کا بقایا۔ جانتے ہو، لکڑی کا کیا بھاؤ ہے؟ برداشت نہ ہو تو مکان چھوڑ دو۔" آخر کواڑ گر گئے۔ رات میں چودھری انہیں کسی طرح چوکھٹ سے ٹکا دیتے تھے۔ رات بھر دہشت رہتی کہ کہیں کوئی چور نہ آجائے؟

محلے میں سفید پوشی اور عزت ہونے پر بھی، چور کے لئے گھر میں کچھ نہیں تھا۔ شاید ایک بھی ثابت کپڑا یا برتن لے جانے کے لئے چور کو نہیں ملتا، لیکن چور تو چور ہے۔ چھیننے کے لئے کچھ نہ بھی ہو، تو بھی چور کا ڈر تو ہوتا ہی ہے۔ وہ چور جو ٹھہرا۔

چور سے زیادہ فکر تھی آبرو کی۔ دروازہ نہ ہونے پر پردہ ہی آبرو کا رکھوالا تھا۔ وہ پردہ بھی تار تار ہوتے ہوتے، ایک رات آندھی کی وجہ سے کسی بھی حالات میں لٹکانے کے لائق نہیں رہ گیا تھا۔ دوسرے دن صبح گھر کی واحد پشتینی چیز یعنی دری، دروازے پر لٹکا دی گئی۔ محلے والوں نے دیکھا اور چودھری کو صلاح دی۔۔۔ "ارے چودھری، اس زمانے میں دری کو یوں کاہے کو خراب کروگے۔ بازار سے لاکر ٹاٹ کا ٹکڑا لٹکا دو!" چودھری پیر بخش ٹاٹ کی قیمت کئی دفعہ مل سے آتے جاتے پوچھ چکے تھے۔ دو گز ٹاٹ آٹھ آنے سے کم میں نہیں۔ مل سکتا تھا۔ ہنس کر بولے، "ہونے دو کیا ہے۔ ہمارے یہاں پکی حویلی میں بھی ڈیوڑھی پر دری کا ہی پردہ رہتا تھا۔"

کپڑے کی منگائی زمانے میں گھر کی پانچوں عورتوں کے جسم سے کپڑے پرانے ہوکر یوں گرتے جارہے تھے، جیسے پیڑ اپنی چھال چھوڑ دیتے ہیں لیکن چودھری صاحب کی آمدنی سے دن میں ایک بار کسی طرح پیٹ بھرنے کے لئے آٹا مل جاتا تھا۔ کپڑے کی گنجائش ہی کہاں تھی؟ خود انہیں نوکری پر جانا ہوتا تھا۔ کرتے پاجامے میں جب پیوند لگنے تک کی تاب نہیں رہی تو مارکین کا ایک کرتا پاجامہ بنانا ضروری ہوگیا تھا لیکن لاچار تھے۔

رہن رکھنے کے لئے گھر میں جب کچھ نہ ہو تو غریب کا واحد سہارا ہے، پنجابی خان! رہنے کی جگہ دیکھ کر ہی وہ روپیہ ادھار دے سکتا تھا۔ دس مہینے پہلے گود کے لڑکے برکت کی پیدائش کے وقت پیر بخش کو روپے کی ضرورت ہوئی تھی۔ کہیں اور کوئی انتظام نہ ہونے پر انہوں نے پنجابی خان، ببر علی خان سے چار روپے قرض لے

لیے تھے۔

ببر علی خان کا روزگار ستوا کے کچے گھروں کے محلے میں اچھا خاصا چلتا تھا۔ بیکانیری موچی، ورکشاپ کے مزدور اور کبھی کبھی رمضانی دھوبی بھی لوگ ببر میاں سے قرض لیتے رہتے تھے۔ کئی دفعہ چودھری پیر بخش نے ببر علی کو قرض اور سود کی قسط نہ ملنے پر اپنے دو ہاتھ کے ڈنڈے سے قرض دار کا دروازہ پیٹتے دیکھا تھا، انہیں قرض دینے والے اور لینے والے میں بیچ بچاؤ بھی کرنا پڑا تھا۔ خان کو وہ شیطان سمجھتے تھے لیکن لاچار ہوجانے پر انہیں اس کی ہی پناہ لینی پڑی۔ چار آنہ روپیہ ماہانہ پر چار روپیہ قرض لیا تھا۔ شریف خاندانی مسلمان بھائی کا خیال کرکے ببر علی نے ایک روپیہ ماہ وار کی قسط مان لی تھی۔ آٹھ مہینے میں قرض ادا ہونا طے ہوا تھا۔

خان کی قسط ادا نہ کرپانے کی حالت میں اپنے گھر کے دروازے پر رسوائی ہوجانے کے اندیشے سے چودھری کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے تھے۔ سات مہینے فاقہ کرکے بھی کسی طرح وہ قسط دیتے چلے گئے لیکن جب ساون میں باجرہ بھی روپے کا تین سیر ملنے لگا تو قرض کی قسط دینا ممکن نہیں رہا۔ خان سات تاریخ کی شام کو ہی آگیا۔ چودھری پیر بخش نے خان کی ڈاڑھی چھو کر اور اللہ کی قسم کھاکر ایک مہینے کی مہلت مانگی اور اگلے مہینے ایک کا سوا دینے کا وعدہ کرلیا۔ خان نے مان لیا۔

بھادوں میں حالت اور بھی پریشان کن ہوگئی۔ بچوں کی ماں کی طبیعت روز بروز گرتی ہی جارہی تھی۔ کھایا پیا اس کے پیٹ میں نہیں ٹھہرتا تھا۔ پرہیز کے لئے اسے گیہوں کی روٹی دینا ضروری ہوگیا تھا۔ گیہوں مشکل سے ملتا تھا اور وہ بھی روپے کا پونے دو سیر۔ مریض کا دل ٹھہرا، کبھی پیاز کے ٹکڑے یا دھنیا کی خوشبو کے لئے ہی مچل جاتا تھا۔ کبھی پیسے کی سونف، اجوائن کالے نمک کی ہی ضرورت ہو تو جیسے کی کوئی چیز ملتی ہی نہیں تھی۔ بازار میں تانبے کا نام ہی نہیں رہ گیا تھا، ناحق اکنی جاتی تھی۔ چودھری کو چار روپے مہنگائی بھتہ کے بھی ملے لیکن پیشگی لیتے لیتے تنخواہ کے دن صرف چار روپے حساب میں باقی نکلے۔

بچے پچھلے ہفتے میں لگ بھگ فاقے سے تھے۔ چودھری کبھی گلی سے روپے کی چورائی خرید لاتے تھے، کبھی باجرہ ابال کر، سب لوگ کٹورہ بھر کر پی لیتے تھے۔ بڑی

مشکل سے ملے چار روپیوں میں سے سوا روپیہ خان کے ہاتھ پر رکھ دینے کی ہمت، چودھری پیدا نہیں کر سکے۔

مل سے گھر لوٹتے وقت چودھری منڈی کی طرف چلے گئے۔ دو گھنٹے بعد اندازہ لگایا کہ خان ٹل گیا ہوگا تو اناج کی گٹھری لے کر وہ گھر پہنچے۔ خان کے ڈر سے دل ڈوب رہا تھا لیکن دوسری طرف چار بھوکے بچوں، ان کی ماں کے دودھ نہ اتر سکنے کی وجہ سے سوکھ کر کانٹا ہوئے گود کے بچے اور چلنے پھرنے سے لاچار اپنی ضعیف ماں کے بھوک سے بلبلاتے چہرے، چودھری کی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگتے تھے۔ دھڑکتے ہوئے دل سے وہ کہتے جا رہے تھے، مولا سب دیکھتا ہے، خیر کرے گا۔'

سات تاریخ کی شام کو ناکام رہ کر، خان آٹھ تاریخ کی صبح تڑکے ہی، چودھری کے ڈیوٹی پر جانے سے پہلے ہی اپنا ڈنڈا ہاتھ میں لیے دروازے پر پہنچ گیا۔

رات بھر سوچ سوچ کر چودھری نے خان کے لئے بیان تیار کر لیا تھا--- مل کے مالک لالہ جی، چار روز کے لئے باہر گئے ہیں۔ ان کے دستخط کے بغیر کسی کو بھی تنخواہ نہیں مل سکی۔ تنخواہ ملتے ہی وہ سوا روپیہ حاضر کر دیں گے۔

معقول وجہ بتانے پر بھی خان بہت دیر تک غراتا رہا--- "آم وطن چوڑ کر پردیس میں پڑا ہے، ایسے روپیا چوڑ دینے کے واسطے؟ امارا بھی بال بچہ ہے۔ چار دن میں روپیہ نئی دے گا تو ام تمہارا... کر دے گا۔"

پانچویں دن روپیہ کہاں سے آ جاتا! تنخواہ ملے ہفتہ بھر نہیں ہوا تھا۔ مالک نے پیشگی دینے سے انکار کر دیا۔ چھٹے دن قسمت سے اتوار تھا۔ مل میں چھٹی ہونے پر بھی چودھری، خان کے ڈر سے صبح ہی باہر نکل گئے تھے۔ جان پہچان کے کئی آدمیوں کے یہاں گئے۔ ادھر ادھر کی بات چیت کر کے وہ کہتے تھے، "ارے بھائی، ہوں تو بیس آنے پیسے، دو ایک روز کے لئے دینا۔ ایسے ہی ضرورت آپڑی ہے۔"

"ارے میاں، پیسے کہاں اس زمانے میں...." جواب ملتا تھا، "پیسے کا مول کوڑی کا نہیں رہ گیا۔ ہاتھ میں آنے سے پہلے ہی ادھار چکانے میں سب اٹھ گیا ہے...!"

دوپہر ہو گئی۔ خان آیا بھی ہوگا تو اس وقت تک بیٹھا نہیں رہے گا، چودھری نے

سوچا اور گھر کی طرف چل دیے۔ گھر پہنچنے پر معلوم ہوا کہ خان آیا تھا اور گھنٹہ بھر ڈیوڑھی پر لٹکے دری کے پردے پر ڈنڈے مار مار کر گالیاں دیتا رہا تھا۔ پردے کی آڑ سے بڑی بی کے بار بار خدا کی قسم کھا کر یقین دلانے پر کہ چودھری باہر گئے ہیں' روپیہ لینے گئے ہیں' خان نے گالی دے کر کہا' "نئی بدذات' چور بستر میں چپا ہے! ام چار گھنٹے میں پر آتا ہے۔ روپیا لے کر جائے گا۔ روپیا نئی دے گا تو اس کا کھال اتار کر بازار میں بیچ دے گا••• ہمارا روپیا کیا حرام کا ہے؟"

چار گھنٹے سے پہلے ہی خان کی آواز سنائی دی--- "چودری!" پیر بخش کے جسم میں جیسے بجلی کا کرنٹ لگ گیا اور وہ بالکل ساکت ہوگئے' ہاتھ پیر سن اور گلا خشک ہوگیا۔

گالی دے کر پردے کو ہٹاکر' خان کے دوبارہ پکارنے پر چودھری کا جسم بے جان ہوکر بھی ساکت نہیں رہ سکا۔ وہ اٹھ کر باہر آگئے۔ خان آگ بگولا ہو رہا تھا' "پیسہ نئی دینے کے واسطے چپتا ہے!" ایک سے ایک بڑی تین گالیاں ایک ساتھ خان کے منہ سے پیر بخش کے پرکھوں اور پیروں کے نام نکل گئیں۔ اس زبردست ضرب سے پیر بخش کا خاندانی خون پھڑکنے کے بجائے اور بھی بے جان ہوگیا۔ خان کے گھٹنے چھوکر' وہ اپنی مصیبت بتاکر معافی کے لئے خوشامد کرنے لگے۔

خان کی تیزی بڑھ گئی۔ اس کی اونچی آواز سے پڑوس کے موچی اور مزدور چودھری کے دروازے کے سامنے اکٹھے ہوگئے تھے۔ خان غصے میں ڈنڈا پٹخ کر کہہ رہا تھا' "پیسہ نہیں دینا تھا تو لیا کیوں؟ تنخواہ کدر میں جاتا؟ ارای امارا پیسہ مارے گا•••• ام تمہارا کھال کھینچ لے گا۔••• پیسہ نئی ہے تو گر پر پردہ لٹکا کے شریف زادہ کیسے بنتا؟••• تم ام کو بیوی کا گینا دو' برتن دو' کچھ بھی دو! ام ایسے نئی جائے گا•••۔"

چودھری پیر بخش نے بالکل بے بسی اور لاچاری میں دونوں ہاتھ اٹھاکر خدا سے خان کے لئے دعا مانگ کر قسم کھائی--- پیسہ بھی گھر میں نہیں' برتن بھی نہیں' کپڑا بھی نہیں۔ خان' چاہے تو بے شک ان کی کھال اتار کر بیچ لے۔

خان اور بھی بھڑک گیا۔ "ام تمہارا دعا کا کیا کرے گا' ام تمہارا کھال کیا کرے گا' اس کا تو جوتی بی نئی بنے گا۔ تمہارا کھال سے تو یہ ٹاٹ اچھا•••" خان نے

ڈیوڑھی پر لٹکا دری کا پردہ کھینچ لیا- ڈیوڑھی سے پردہ ہٹتے ہی جیسے چودھری کی زندگی کی ڈور ٹوٹ گئی- وہ ڈگمگا کر زمین پر گر پڑے-

چودھری میں اس منظر کو دیکھنے کی تاب نہیں تھی' لیکن دروازے پر کھڑی بھیڑ نے دیکھا-- گھر کی عورتیں اور لڑکیاں پردے کے دوسری طرف ہوتے واقعہ کی دہشت سے آنگن کے بیچوں بیچ خوف سے اکٹھی کھڑی ہو کر کانپ رہی تھیں- اچانک پردہ ہٹ جانے سے عورتیں ایسے سمٹ گئیں جیسے ان کے جسم سے لباس پر بچے چیتھڑے ان کے ایک تہائی جسم کو ڈھکنے کے قابل بھی نہیں تھے-

جاہل بھیڑ نے بیزاری اور شرم سے آنکھیں پھیر لیں- اس عریانیت کی جھلک سے خان کی سختی بھی پگھل گئی- پشیمانی سے تھوک کر اور پردے کو آنگن میں واپس پھینک کر' غصے بھری مایوسی میں اس نے کہا-- "لاحول ولا---" اور ناکام لوٹ گیا-

خوف سے چیخ کر آڑ میں بھاگتی ہوئی عورتوں پر ترس کھا کر بھیڑ دروازے کے سامنے سے ہٹ گئی تھی- چودھری بے سدھ پڑے تھے- جب انہیں ہوش آیا تو ڈیوڑھی کا پردہ آنگن میں سامنے پڑا تھا لیکن اسے اٹھا کر پھر سے لٹکانے کی طاقت ان میں باقی نہیں تھی- شاید اب اس کی ضرورت بھی نہیں رہی تھی-

پردہ جس جذبے کو سہارا دیتا تھا' وہ مر چکا تھا●●●●

چوری اور چوری

اس واقعے کے تذکرے میں شہر، بازار، محلے اور لوگوں کے نام نہ بتانا ہی مناسب ہے۔ اگر نام کی غیر موجودگی میں اسم ضمیر کے استعمال سے آپ کو الجھن یا پریشانی محسوس ہو تو بلحاظ مصلحت اسے لائق معافی سمجھیں۔

ہاوڑہ اسٹیشن پر اپنے شہر کا ٹکٹ خریدنے سے پہلے اس کے دل میں زبردست کشمکش اور ہچکچاہٹ سی تھی••• بیوی اور بیٹے کو چھوڑے ہوئے اکتیس برس ہوگئے تھے۔ اتنی مدت کے بعد ان کے سامنے پہنچنا ٹھیک ہوگا؟ اتنے برس کے بعد اپنے گھر، محلے اور شہر میں لوٹنا مناسب ہوگا؟••• باپ تو اب کیا رہے ہوں گے! تعارف کرانے پر بھی کیا وہ لوگ اسے پہچان سکیں گے؟••• پہچان کر حیرت زدہ تو ہوں گے••• ان کا برتاؤ کیسا ہوگا؟••• وہ بات کیا اب بھی لوگوں کو یاد ہوگی؟

اس نے برما پہنچ کر، گھر چھوڑنے کے دو برس بعد اپنے باپ اور بیوی کی پریشانی اور بے چینی کے پیش نظر ایک خط لکھ کر اپنی خیریت اور اچھی نوکری حاصل کرلینے کی خبر گھر بھیج دی تھی۔ باپ کا جواب بھی ملا تھا۔

برما پہنچ کر اس سے ایک اور غلطی ہوگئی۔ وہ غلطی اپنے باپ کو نہیں بتا سکتا تھا۔ شرم اور جھجک کی وجہ سے گھر پر دوسرا خط لکھنے کی ہمت نہیں کرسکا۔ جیسی نوکری وہ اپنے شہر میں، اپنے محلے کے مکانوں اور مندر کے مالک ٹھیکیدار کے یہاں کر رہا تھا، ویسا ہی کام اسے مانڈلے میں عمارتی لکڑی کے ایک بڑے تاجر کے یہاں مل گیا تھا۔

وہ چھبیس، ستائیس برس کی عمر میں اپنے گھر اور سماج سے ہزاروں میل دور رہ رہا تھا۔ یہاں اسے اپنے سماج اور پڑوسیوں کی تنقید کا خوف نہیں تھا۔ اسے اپنے اخلاقی عمل کے لئے کسی کی رضا مندی کی فکر نہیں تھی۔ ایسی حالت میں وہ برما کی ایک حسین اور مست شباب دوشیزہ کی مسحور کن نگاہوں کی دعوت سے نہیں بچ سکا۔

لیکن وہ اپنے پروہت باپ کو، اپنے پانچ برس کے بیٹے کی ماں کو، اس بات کی خبر کیسے دیتا کہ اس نے ایک غیر ذات کی عورت کو قبول کر کے دھرم اور ذات دونوں سے انحراف کیا تھا؟ اس کے باپ اور بیوی کے نزدیک ہی نہیں بلکہ خود اس کی نظر میں بھی ایک کم ذات عورت سے شادی، اس کی پہلی غلطی سے کہیں بڑی تھی۔ ایسی حالت میں وہ اپنے گھر سے کیا اور کیسے تعلقات رکھتا! وہ اپنے آبائی شہر اور گھر کو بھلا کر اپنا نیا جہاں بنانے میں لگ گیا۔ ناکام بھی نہیں رہا۔ دو برس کے بعد ہی وہ نوکری چھوڑ کر مانڈلے میں اپنا چھوٹا موٹا روزگار چلانے لگا۔ مکان خرید لیا تھا لیکن دل کی گہرائی میں کسی دن آبائی شہر اور پرائی دنیا میں پہنچ سکنے کا تصور قائم رہا، اس لئے وہ پردیس میں اپنی کمائی کو غیر منقولہ جائداد میں نہ لگا کر نقد اکٹھا کرتا رہا۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران جب برما پر جاپان نے حملہ کیا، تب اس کی دونوں بری لڑکیاں اپنا اپنا گھر بسا چکی تھیں۔ جاپانیوں کے پہلے ہی ہوائی حملے میں اس کا مکان گر گیا۔ اس کی بیمار بیوی دب کر مر گئی۔ وہ پردیس میں سب کچھ گنوا دینے اور جان دینے کے لئے کیوں ٹھہرتا؟ جو کچھ مل سکتا تھا، اسے سمیٹ کر اپنے ملک کی طرف بھاگا لیکن دل کشمکش میں مبتلا تھا۔

دنیا میں اپنے گھر کے علاوہ اس کے لئے اور جگہ کہاں تھی! لیکن جہاں سے وہ بھاگنے کے لئے مجبور ہو گیا تھا، وہیں کیسے واپس جائے؟... باپ شاید ہی رہے ہوں گے.... بیوی... بیٹا... بیٹا اب چھتیس برس کا جوان مرد ہونا چاہیے۔ اسے اپنا بھاگ جانے والا باپ یاد ہو گا؟... اکتیس برس بعد بھی محلے کے لوگوں کو وہ یاد ہو گا؟... اسے اپنے زمانے کے پڑوسیوں اور محلے والوں کے نام اور شکلیں یاد آنے لگیں۔... اس کی اس غلطی پر کیسی ملامت ہوئی تھی!... کسی کو منھ دکھانا ممکن نہیں رہا تھا۔... کیا اب بھی لوگوں کو میری اور اس کی بات یاد ہو گی؟ محلے میں ماضی کی یاد کا اندیشہ، اس کے گھر لوٹنے کی خواہش اور ہمت کو پست کر دیتا تھا۔ اس نے یقین کرنا چاہا--- اتنے برس تک محلے اور گھر سے میرا کوئی بھی تعلق نہیں رہا۔ وہ لوگ نہ جانے کب تک رو دھو کر مجھے بھول چکے ہوں گے۔

اس کے دل میں اندیشہ پیدا ہوتا تھا--- اگر لوگ نہیں بھولے ہوں گے، تو پھر

وہی چھی چھی اور لعنت ملامت، چور چور۔۔۔ بے عزتی اور بدنامی، جس کی وجہ سے گھر اور شہر چھوڑنا پڑا تھا۔

"اب جہاں پیسہ خرچ کروں، وہیں میرے لئے جگہ ہے، وہیں میرا گھر ہے۔۔۔ دوبار گھر بن کر بھی جب نہیں رہا تو گھر اور پناہ میرے نصیب میں ہے ہی نہیں۔"

لمبے دشوار سفر کے بعد اس کی ذہنی اور جسمانی حالت کچھ ایسی تھی کہ وہ سرائے اور ہوٹل میں آرام محسوس نہیں کر سکتا تھا۔ مکان یا کوٹھری کرائے پر لینے سے ہی کام نہیں چل سکتا تھا، اسے سنبھلنے کی اور پناہ کی ضرورت تھی۔

مجروح دل اور کمزور جسم کے ساتھ ساتھ اسے ایک اور فکر شہر کی طرف دھکیل رہی تھی۔ بگڑی ہوئی صحت میں کسی بھی وقت، موت آجانے پر وہ لاوارث مرجائے گا، پھر اپنی اکتیس برس کی کمائی کسے سونپ جائے گا؟ گھر میں چھوڑے ہوئے پانچ سال کے بیٹے کا چہرہ یاد داشت میں کوندھ جاتا تھا۔۔۔ وہ اس چہرے کو بھولا کب تھا؟ اس کے بیٹے کی جسمانی ساخت اور خوبصورتی کا تذکرہ آس پاس کے محلوں تک میں ہوتا تھا۔۔۔ گداز، گول مٹول جسم، سلونا گندمی پیارا پیارا چہرہ، بڑی بڑی آنکھیں، گھنگریالے بال۔ لڑکے کی ماں اور دادی نظر لگ جانے کے ڈر سے ہمیشہ فکر مند رہتی تھیں۔ ٹونے ٹوٹکے کرتی تھیں۔ منتیں مانتی تھیں۔ دل کے آسمان میں چھائے اذیت کے گھنے تاریک بادلوں میں سے پانچ برس کے بیٹے کا چہرہ چاند کی طرح جھانک لیتا تھا۔ ناامیدی کے اندھیرے میں بجلی سی چمک جاتی تھی۔۔۔ میرا کوئی کیسے نہیں ہے؟ میرا بیٹا ہے۔۔۔ چھتیس برس کا جوان ہوگا۔ اس کی ماں ہوگی، یہی پچاس اکیاون کی ہوگی۔ بیٹا کیا کر رہا ہوگا؟۔۔۔ اپنے دادا کی طرح پروہت یا پجاری ہی بنا ہوگا یا اس زمانے میں پڑھ لکھ کر کچھ اور۔۔۔ یہ وہاں پہنچ کر ہی معلوم ہوگا۔ وہ اپنے بیٹے اور اس کی ماں کو ایک بار دیکھے تو! چڑھتی جوانی میں اپنے بیٹے کی ماں سے حاصل کی ہوئی خدمت اور اطمینان ایک بار اور محسوس کر پانے کی امید تسلی دیتی تھی۔ میرے چلے آنے سے بے چاری کا رو رو کر کیا حال ہوا ہوگا؟ ہندو عورت۔۔۔ جس کی زندگی میں صرف ایک مرد ہوتا ہے! اسے بیٹے اور اس کی ماں سے صرف محبت اور سہارے کی ضرورت تھی وہ ان

سے کچھ پانے کے بہ نسبت انہیں اپنی کمائی سونپ کر سکون حاصل کرنا چاہتا تھا۔
ہاوڑہ میں اپنے شہر کا ٹکٹ خرید کر اس نے اس غیر یقینی کیفیت اور پریشانی کو ختم کر ڈالا۔

وہ اپنے شہر تک تیس گھنٹے کے سفر کے دوران تیس اکتیس برس میں ہوئی تبدیلیوں کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ اپنے شہر کا اسٹیشن زیادہ بدلا ہو ییں لگا، لیکن اسٹیشن کے باہر کافی تبدیلیاں نظر آئیں۔ ٹمٹم اور تانگوں کی جگہ، برما کے شہروں کی طرح سائیکل رکشا چلنے لگے تھے۔ اس نے رکشا والے کو اپنے مخصوص بازار اور محلے کا نام بتایا۔

"جانتا ہوں" رکشا والے نے ہامی بھری، "چور گوپال جی کا مندر، نا؟"

گوپال جی کا مندر اس کے محلے میں ضرور تھا۔ اس کے باپ ہی تو اس مندر کے پجاری تھے لیکن چور گوپال جی کا مندر اس نے نہیں سنا تھا۔ اس نام سے اسے حیرت ہوئی، بلکہ لفظ چور، سے دل کی گہرائی میں وسوسہ پیدا ہونے لگا۔۔ کس چوری کی طرف اشارہ ہے؟ اس نے چور گوپال جی کے نام کو نظر انداز کر کے پھر اپنے بازار اور محلے کا نام دہرایا۔

"ہاں، ہاں، ٹھیک ہے۔" رکشا والے نے اطمینان دلا کر رکشا چلا دیا۔ ہموار سڑک پر رکشا کی رفتار جیسے جیسے بڑھتی جارہی تھی، اس کے دل کی دھڑکن بھی بڑھ رہی تھی••• کیا ہوگا؟ کوئی پہچانے گا یا نہیں؟ پہچاننے پر؟••• اس کے پرانے شناسا لوگ؟

رکشا اس کے پرانے شناسا بازار میں گوپال جی کے مندر کی گلی کے سامنے آکر رک گیا۔ رکشا والا اس جگہ پہنچ کر گدی سے اتر گیا۔ واہ دائیں طرف گلی میں مندر اور نکڑ کے مکانات کو حیرت اور تجسس سے دیکھتا رہ گیا۔ ماحول اور جگہ یقیناً وہی تھے لیکن سائز اور ڈیزائن کے کرشمے سے بدل کر وسیع اور شاندار ہوگئے تھے۔ مندر اسی جگہ قائم تھا لیکن اس کے چاروں طرف خالی جگہ میں سنگ مرمر کا کالا سفید شطرنجی چبوترا بن گیا تھا۔ چبوترے کے چاروں طرف سینے تک اونچا جالی دار جنگلہ لگ گیا تھا۔

اکتیس برس پہلے کا چھوٹا اور عام سا مندر اب کافی صاف ستھرا لگ رہا تھا۔ مندر کے اوپر کئی کلسوں کا چمچماتا ہوا سنہرا شکھر لگ گیا تھا۔ مندر کے چبوترے پر عورت مرد بھگتوں اور بچوں کا میلہ سا لگا تھا۔ مندر کے چبوترے کی سیڑھیوں پر بیٹھے' پھول بتاشے والے اور خوانچے والے آوازیں لگا رہے تھے۔ گلی کے نکڑ پر حلوائی کی دکان اب بھی تھی لیکن شمالی مغربی خطے سے آئے بھگت کشن چند حلوائی کی ایک کڑھائی اور پراتوں والی چھوٹی سی دکان کی جگہ وسیع دو منزلہ مکان اور حلوائی کی کافی بڑی اور سجی دھجی دکان نظر آ رہی تھی۔ عمارت پر موٹے حروف میں لکھا تھا۔۔ بھگت بھون'۔

اس نے ہمت یکجا کر کے مختصر سا بستر اور ہلکا سوٹ کیس اٹھالیا اور گلی پار کر کے مندر کے دائیں طرف' اپنے مکان کی طرف بڑھ گیا۔ محلے کی حالت زیادہ نہیں بدلی تھی' لیکن اس کا اپنا مکان پکا بن گیا تھا۔ مکان کی ڈیوڑھی میں پیڑھی پر بیٹھی ایک بوڑھی عورت' چھ سات مہینے کے بچے کو سلانے کی کوشش کر رہی تھی۔

اس بوڑھی عورت کا چہرہ دیکھتے ہی اس کا دل لرز گیا۔ حافظے نے اس عورت کے چہرے کو اس کی عمر کے اکتیس سال کم کر کے دیکھا۔ وہی ناک نقشہ' وہی شکل۔۔ عمر کی وجہ سے اعضا پھول کر ڈھیلے ڈھالے سے ہو گئے تھے۔

اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور اپنے باپ کا نام لے کر پوچھا۔••• کا مکان یہی ہے؟"

اس سوال پر' اس کی آواز سے چونک کر عورت کی نظر اس کی طرف اٹھ گئی۔ پل بھر دیکھتی رہی' کچھ اس طرح جیسے اس کی طرف براہ راست نہیں دیکھ رہی ہو۔ حیرت سے اس کا منہ کھل گیا۔ اس کے چہرے پر نظریں گڑا کر گہری سانس لے کر بولی۔۔ "کسے پوچھتے ہو؟"

آنچل سنبھال کر اٹھنے کی کوشش میں بوڑھی عورت نے پوتے کو گود سے گرتے گرتے سنبھالا۔ وہ بچے کو باہوں میں لے کر اٹھ گئی اور اسے راستہ دینے کے لئے ایک طرف ہٹ گئی۔ وہ اپنے گھر کے اندر چلا گیا۔ ضعیف عورت نے پوتے کو ایک طرف سنبھال کر آنگن میں چارپائی بچھادی۔ وہ چارپائی پر بیٹھ گیا۔ ضعیف عورت باورچی خانے کی طرف گئی۔ بغیر کچھ بولے بچہ بہو کو دے دیا اور آ کر چارپائی کے قریب

فرش پر بیٹھ گئی۔ پھر اس کے گھٹنے کے قریب چارپائی کی پٹی پر سر رکھ کر رو پڑی۔ اس کے بھی آنسو بہنے لگے۔

باورچی خانے سے ایک نوجوان لڑکی نے جھانکا۔ وہ بوڑھی عورت کی گود سے لیے ہوئے بچے کو بانہوں میں سنبھالے ہوئے تھی۔ ساس کو نووارد کے گھٹنے کے قریب سر رکھ کر روتے ہوئے دیکھا۔ مہمان کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ وہ گھونگٹ ڈال کر پیچھے ہٹ گئی۔ نووارد نے اُمڈتے ہوئے آنسوؤں کا گھونٹ بھر کر سسکتی ہوئی بوڑھی عورت کے سر پر تسکین کے لئے ہاتھ رکھ دیا۔ دوسرے ہاتھ سے رومال نکال کر آنسو پونچھے اور بیٹے کا نام لے کر پوچھا۔۔۔ "•••کہاں ہے؟"

"مندر میں ہے۔ ابھی آتا ہوگا۔"

بیٹے کے مندر سے واپس آنے اور بہو کے گھر سے باہر جانے پر پڑوسیوں کو پتہ چلا۔ بچوں کے اسکول سے آجانے پر محلے بھر میں خبر پھیل گئی۔ اکتیس برس کے بعد واپس آئے پڑوسی کو دیکھنے کا اضطراب سب کو تھا۔ پڑوسنیں دوڑ دوڑ کر آئیں اور اس کی بیوی اور بہو کو مبارک باد دینے لگیں۔ اس کے ہم عمر پڑوسی خبر سن کر آئے اور گلے ملے۔ سبھی خوش تھے۔

"•••تم تو ایسے گئے کہ بھول ہی گئے۔ بھگوان کی ہی کرپا ہے جو لوٹ آئے۔ اپنا گھر تو اپنا ہی ہوتا ہے۔"

اس کے پرانے ہجولی منشی جی کے اضطراب اور جوش کی کوئی حد نہیں تھی۔ اس کے کندھے پر بار بار تھپکی دے کر خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ "تم گئے تو یہاں کیا تھا اور اب بھگوان کا کرشمہ دیکھا! ہم نے اپنی آنکھوں سے بنتے بدلتے دیکھا۔ یہ سب تمہارے پتا پنڈت جی کی بھکتی کا چمتکار سمجھنا چاہئے کہ مندر کی کایا پلٹ گئی' بھگوان خود ظاہر ہوگئے۔ بھائی' تمہارے پتا بھگوان کے بڑے بھگت تھے۔

دوسرے پڑوسیوں نے بھی منشی جی کی تائید کی۔۔۔ "ارے پنڈت جی' بھگت تو تھے ہی' گئے بھی تو کیسے! آرتی سے واپس آکر سوئے تو پھر جاگے ہی نہیں! منہ سے آہ بھی نہیں نکلی۔"

شام تک وہ پڑوسیوں سے گھرا رہا' اور پوتے اور پوتی کو گود میں لے کر ان کے

سر پر ہاتھ پھیرتا رہا۔

"یہ سب چمتکار ہو کیسے گیا؟ مندر میں کیسے نئی زندگی پیدا ہو گئی؟" اس نے کئی بار بیٹے سے پوچھا۔ اس کے تجسس کو روکنا ممکن نہیں تھا۔

"سب ان ہی کی مایا ہے!۔۔۔ سب ان ہی لیلا گھر کی لیلا ہے! بھگوان نے پرکٹ (ظاہر) ہو کر اپنی بال لیلا دکھائی۔۔۔ ماکھن چوری کرتے تھے' بھگتوں کے من ہرتے تھے' گوپیوں کے کپڑے ہرتے تھے۔ جس پر مہربان ہو جائیں' اس کی چوری کروا دیں۔ گوپال جی خوش ہوئے تو اپنا چور روپ دکھلا دیا۔"

نوجوان پجاری نے جھجکتے ہوئے کئی بار باپ کی بے قراری کو ٹالنا چاہا۔

اس سے بھی اکتیس برس پہلے زبردست ضرورت کی وجہ سے چوری کا جرم سرزد ہو گیا تھا۔ مالک کی رقم میں سے اس نے دس روپئے نکال لیے تھے۔ مالک نے اپنی مندر کے پجاری کا لحاظ کرتے ہوئے اسے پولیس کے حوالے نہیں کیا' البتہ نوکری سے نکال دیا تھا۔ وہ اس جرم اور بدنامی کی وجہ سے اکتیس برس کی گمنامی سہہ کر لوٹا تھا اور اس کی غیر حاضری میں بھگوان کی چور لیلا سے یہ کرشمہ ہو گیا تھا۔ اس کی بے قراری پاگل پن کی حد تک پہنچ گئی۔ بیٹے نے باپ کے تجسس اور بے قراری کو بہت ٹالا' لیکن آخر کار اسے بتانا ہی پڑا۔

جوان بیٹے نے رات کی تنہائی میں دھیمی آواز میں باپ کی بے قراری کو دور کیا۔۔۔ "جب آپ یہاں سے گئے تھے' تب گلی کے نکڑ پر بھگت کشن چند حلوائی کی دکان ہوتی تھی نہ! تب مندر میں بہت کم لوگ آتے تھے لیکن نکڑ والا کشن چند حلوائی دونوں ٹائم پابندی سے مندر آتا تھا۔ جانتے ہیں نا' بڑا بھگت آدمی تھا۔ نکڑ کی دکان چلائی تھی تو اس نے مورتی کے لئے زیور بنوا دیا تھا۔۔۔ بھگوان کی مورتی کے لئے کپڑے اور رادھا جی کی مورتی کے لئے ہار۔۔۔ رات میں وہ دکان بڑھانے سے پہلے وسرجن کی آرتی کے لئے بھی آتا تھا۔ وہ پابندی سے وسرجن کی آرتی کے لئے آنے لگا تو اسے پابندی سے پوجا کرتے دیکھ کر' محلے کے دو چار بڑے بوڑھے بھی آنے لگے تھے۔ کشن چند اپنی دکان سے بھگوان کے چرن امرت کے لئے مٹھائی کا چورا لے آتا تھا۔ بچے پرساد کی امید میں مندر میں اونگھنے لگتے تھے۔ ہم بھی وہیں بیٹھے رہ جاتے

تھے' تو آپ بگڑتے تھے نہ! آپ چلے گئے' تب ہماری عمر ہی کیا تھی--- بس یہی پانچ چھ برس۔ آپ چلے گئے تو دادا جی کچھ نہیں بولتے تھے۔ ہم پرساد کے لئے بیٹھے بیٹھے سو جاتے تھے اور دادا سوتے میں ہی ہمارے منہ میں پرساد بھر دیتے تھے۔"

"بھگوان کی لیلا! برسات کے دن تھے' لمبی جھڑی لگی تھی۔ دادا جی وسرجن کی آرتی کے لئے چلے تو ہم بھی پرساد کے لالچ میں ساتھ لگ گئے۔ داد کشن چند کے انتظار میں بیٹھ گئے۔ بہت دیر ہو گئی۔ کشن چند نہیں آیا تو دادا اونگھنے لگے۔ بارش جاری تھی۔ ہم بارش کے دوران دوپہر بھر سوئے تھے' اس لئے ہمیں نیند نہیں آ رہی تھی۔ سوچ رہے تھے' پرساد کب ملے گا۔"

"تب یہاں محلے میں ایک ریلوے کا بابو رہتا تھا۔ اس کا لڑکا ہم سے پانچ چھ برس بڑا تھا۔ وہ گھر سے پیسے چرا کر کشن چند کی دکان سے مٹھائی لے کر' ہمیں دکھا دکھا کر کھاتا تھا۔ ہمیں ترغیب دیتا تھا--- مندر سے مورتیوں کا سنگار اتار لاؤ خوب مٹھائی کھائیں۔"

"کوئی دیکھ نہیں رہا تھا۔ ہم نے چپکے سے بھگوان کی مورتی کا کنگن اتار لیا۔ دادا سوتے رہے۔ ہم مندر سے نکلے' اس وقت بھی بارش ہو رہی تھی۔ گلی کے نکڑ پر گئے۔ دکان میں روشنی تھی۔ کشن چند قلاقند' پیڑے اور دوسری مٹھائیوں کے تھالوں کے پیچھے پالتی مار کر بیٹھا تھا اور گود میں ترازو رکھے ہوئے اونگھ رہا تھا۔"

"ہم نے کہا' قلاقند دے۔' اور بھگوان کی مورتی سے اتارا ہوا کنگن ترازو میں پھینک دیا۔"

"آہٹ سے کشن چند کی پلکیں کھلیں۔ پیسے اٹھانے کے لئے ہاتھ ترازو پر گیا۔ ہاتھ میں آیا کنگن۔"

"یہ کیا؟" کشن چند نے کنگن ہاتھ میں لے کر خوابیدہ آنکھیں پھاڑ کر حیرت سے کہا۔

"ہم تو ڈر گئے تھے لیکن دونوں ہاتھ بڑھا کر مٹھی بھر قلاقند اٹھا لیا اور بھاگ نکلے۔ اور گھر میں آ کر چھپ گئے۔"

"کچھ دیر بعد کشن چند نے آ کر دادا کو آواز دی۔ مندر میں شور مچ گیا۔ کشن چند

اور دادا دوسرے لوگوں کو بلانے لگے۔ ہم ڈرے کہ بھگوان کی مورتی کا کنگن چرانے کے لئے بہت مار پڑے گی۔"

اس کے جوان پجاری بیٹے نے بڑے جوش سے کہا۔۔ "لیکن یہ تو بھگوان کی لیلا تھی۔ کشن چند اور دادا پکار پکار کر، خوشی سے مست ہو کر ناچ ناچ کر کنگن دکھا کر لوگوں بتانے لگے۔

"یہ دیکھا کنگن ؟ کنگن کیسے دکان پر پہنچ گیا! پجاری جی یہاں بھجن کرتے رہے۔ ان کے دیکھتے دیکھتے کنگن یہاں سے چلا گیا۔ برسات کی وجہ سے لوگوں نے وسرجن کی آرتی میں دیر کی تو بھگوان نے لیلا دکھا دی۔ بچے کی شکل میں آئے تھے۔ پرکشش سلونے گھنشیام، بال لہراتے ہوئے، بڑی بڑی رس بھری آنکھیں! ہمارے سامنے ہنس کر کلائی سے کنگن اتارا اور پھینک دیا۔۔ لا، پرساد دے۔ گورس تو پسند کرتے ہی ہیں، ہنس کر دونوں ہاتھوں سے قلا قند منھ میں بھر لیا اور غائب ہو گئے! ہم ہوشیاری سے جاپ کر رہے تھے۔ چاہا کہ پاؤں پکڑ لیں لیکن وہ تو نظروں سے اوجھل ہو گئے!" بھگتی میں محو کشن چند اور دوسرے لوگوں نے کھڑتال اور منجیرے سنبھال لیے اور ناچ ناچ کر کیرتن کرنے لگے۔ مندر میں بھیڑ لگ گئی۔ صبح تک کیرتن ہوتا رہا۔

"صبح ہوتے ہی شہر میں بات پھیل گئی کہ رات کو گوپال جی کے مندر میں بھگوان پرکٹ ہو گئے۔ مندر میں زبردست بھیڑ ہو گئی۔ کئی دن تک لگاتار کیرتن ہوتا رہا۔ میلہ سا لگا رہا۔"

"ہماری کسی سے کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی اور اس میں کہنے کی بات ہی کیا تھی! کشن چند کو تو درشن ہی ہو گئے تھے۔ وہ کھڑتالیں لے کر دن رات مندر میں کیرتن کرنے لگا۔ دکان کی پرواہ ہی نہیں رہی۔ دکان لڑکے سنبھالنے لگے۔ مندر میں جو آتا، پرساد ان کی دکان سے ہی لیتا تھا۔ مندر کا نام چور گوپال جی کا مندر، پڑ گیا۔ اتنا چڑھاوا آنے لگا کہ سنبھالنا مشکل تھا۔ لوگوں کو حسد تو ہونا ہی تھا، کچھ لوگ جھگڑا کرنے لگے۔ مندر کا ٹرسٹ بنوایا گیا۔ اب ہمیں تو دسواں حصہ ہی ملتا ہے۔ جسے بھگوان نے براہ راست درشن دیے تھے، اسے کس بات کی کمی رہتی! کشن چند کی زندگی جب اختتام کو پہنچی، تب تک وہ اپنی دکان اور ساتھ کے مکان خرید کر دو منزلہ مکان بنوا چکا تھا۔ اس

کی ارتھی کے ساتھ ہزاروں لوگ گئے۔"

وہ اکتیس برس کی گمشدگی کے بعد اپنے گھر لوٹا تھا۔ گھر کو امید سے زیادہ خوشحال اور آرام دہ پایا، لیکن اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ بیٹے سے بھگوان کے پرکٹ ہونے کے کرشمے کے ذریعے، مندر کی قسمت بیدار ہونے کا راز سن کر، اس کا دماغ گھوم رہا تھا۔ بھگوان کی لیلا! وہ ایک چوری کے جرم میں اکتیس برس گمنامی جھیلتا رہا اور اس کے بیٹے کی چوری کے نتیجے میں یہ کرشمہ! بھگوان کی لیلا کون سمجھ سکتا ہے؟ رات کے چوتھے پہر نیند آسکی۔ آنکھ کھلی تو کافی دن چڑھ چکا تھا۔

پچھلی رات پوتے پوتیوں کا لاڈ پیار کرکے اس کا دل نہیں بھرا تھا۔ گیارہ برس کی پوتی اور چھ برس کا پوتا، دونوں ہی اس کی گود میں سر رکھ کر سوگئے تھے۔ بہو سوتے ہوئے بچوں کو اٹھا کر لے گئی تھی۔ صبح اٹھتے ہی اس نے پوتے اور پوتی کو آواز دی۔

اس کی آواز سن کر پوتی آئی اور روہانسو آواز میں ٹھنک کر بولی۔۔۔ "دادا، پڑوسی کا للو ہمیں گالی دے رہا ہے۔ کہتا ہے کہ تمہارے دادا چوری کرکے بھاگے تھے۔"

پوتی کی بات سن کر اس کا جسم پسینے سے شرابور ہوگیا اور سر جھک گیا۔ دل سے ایک گہری سانس نکلی۔ اکتیس برس بعد بھی اس کی چوری کا کلنک نہیں دھل سکا! کیا وہ اپنے گھر اور محلے میں نہیں رہ سکے گا۔۔۔

اس کی چوری تو چوری تھی، کوئی بھگوان کی لیلا یا کرشمہ تو نہیں!

خچر اور آدمی

پورن کی زندگی کے اکیس برس دلی اور اس کے آس پاس ہی گذرے تھے۔ کبھی پہاڑ پر جانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ برف باری دیکھنے کے شدید اشتیاق کے ساتھ پہلی بار شملہ گیا تھا۔ وہاں کبھی کبھی اچھی برف باری ہوجاتی ہے۔ دو دن تک رات میں کئی بار زور دار برف باری ہوئی۔ ڈیڑھ دو فٹ برف گرنے کے بعد برف باری رک گئی اور ہوا چلنے لگی۔ اتنی برف دیکھ کر پورن کا دل پژمردہ ہوگیا وہ برف میں جوتے رکھ کر چلنے اور برف ہاتھوں میں اٹھا کر اس کے گولے بناکر پھینکنے کے اشتیاق کی بجائے سردی سے لرزش محسوس کرنے لگا۔ سرد ہوائیں چمڑے کے کوٹ کو پار کرکے اس کے جسم میں کپکپی پیدا کر رہی تھیں۔ برف میں گھومنے کی خواہش ہی ختم ہوگئی۔

بھارگو نے دوست کے استقبال میں کمرہ گرم کرنے کے لئے بجلی کے ہیٹر کے بجائے دیوار میں بنی پرانے ڈھنگ کی انگیٹھی میں لکڑی کے ٹکڑے سلگوا دیے تھے۔ خوب لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔ بھارگو نے صوفہ انگیٹھی کے قریب کھینچ لیا۔ دونوں صوفے پر بیٹھ گئے اور سگریٹ سلگا لیے۔ سامنے آگ تھی، جسم پر مناسب کپڑے تھے لیکن برفیلی ہوا میں گھومنے سے پورن کے جسم میں اتنی سردی بس گئی تھی کہ آدھے گھنٹے تک آگ کے سامنے بیٹھنے کے بعد بھی اسے جھرجھری محسوس ہو رہی تھی، وہ کہنے لگا۔۔۔۔ "اف، کتنی شدید سردی ہے!"

"یہاں سردی ہے؟ اچھا بھلا گرم کمرہ ہے۔" بھارگو نے حیرت سے کہا، "تمہیں عادت نہیں ہے، ورنہ شملہ میں زیادہ سردی نہیں ہوتی۔"

بھارگو گذشتہ پانچ برس سے برف باری کے دن شملہ میں گذارتا تھا۔ وہ ڈیپارٹمنٹ آف جیولاجیکل سروے کی ریسرچ ٹیم میں شامل تھا۔ اس پارٹی کے لوگوں کو سال میں چھ مہینے سطح سمندر سے بیس ہزار فٹ بلندی تک کے برفیلے علاقوں میں

معدنی اشیاء کی تلاش کا کام کرنا ہوتا ہے۔ صرف سات ہزار فٹ بلند شملہ کی سردی ان کے لئے کیا چیز ہے!

"مائی گاڈ!" پورن نے سخت حیرت کا اظہار کیا' "یہ کم سردی ہے' اور کتنی سردی ہوگی ؟" وہ بھارگو کو سردی کے بارے میں اس کے عجیب وغریب تجربات سنانے کی ترغیب دینا چاہتا تھا تاکہ ان تجربات کے تذکرے کے دوران خود کو محسوس ہوتی سردی کو بھلا سکے۔

بھارگو نے دوست کا مطلب سمجھ کر جواب دیا--- "تکلیف دہ سردی تو ہوتی ہے بارہ ہزار فٹ سے اوپر۔ جہاں چاروں طرف موٹی موٹی برف جمی ہو' کئی دن تک دھوپ نہ ملے' اور خاص طور پر جب گرمی حاصل کرنے کے لئے ایندھن بھی پاس نہ ہو۔ نہ کھانا گرم کیا جاسکے' نہ گرم کافی یا چائے مل سکے۔ ایسے وقت آگ کی چنگاری اور لو کے لئے جان ترس جاتی ہے۔"

"کیا تمہیں بھی کبھی ایسا تجربہ ہوا؟" پورن کی آنکھیں اضطراب سے پھیل گئی تھیں۔

"صرف ایک بار' سولہ دن تک۔"

"پلیز! کیسے' ضرور بتاؤ!"

بھارگو نے آسانی کے لئے پورن کی طرف کروٹ لے لی--- "ہماری پارٹی کے اس تجربے کے بارے میں کچھ خبریں تو اخباروں میں بھی چھپی تھیں۔ ارے وہی' لاہول وادی کا حادثہ۔ غیر متوقع طور پر یا موسم کی پیش گوئی کی رپورٹ کے خلاف وادی کے اوپری حصے میں شدید برف باری ہوگئی اور ہم لوگ پھنس گئے۔ اس علاقے کے لئے چوبیس گھنٹے میں ہونے موسم کی اطلاع منالی سے نشر کی جاتی ہے۔ منالی ہے سطح سمند سے پانچ چھ ہزار فٹ کی اونچائی پر۔ ہمیں تجربے کے لئے نمونے لینے تھے' بارہ ہزار فٹ کی اونچائی پر' چٹانیں توڑ کر--- ہمارے کوچ کا ڈیرا دس ہزار فٹ پر تھا۔ منزل تک کی مسافت پانچ میل سے زیادہ نہیں تھی۔ ہمیشہ برف سے ڈھکی رہنے والی' چودہ ہزار فٹ اونچی ایک دھار کو ہی پار کرنا تھا۔ دھار کو پار کرنے کے لئے صرف ایک درہ ہے' وہ بھی تیرہ ہزار فٹ پر۔ درے کے اس طرف ایک ہزار فٹ نیچے ایک بہت

چھوٹا سا میدان ہے۔ وہاں فوجی اہمیت کی ایک شے کی تلاش میں برما چلانے کا خیال تھا•••"

"وہ شے ملی؟" پورن نے ٹوک کر کہا۔

"نہیں، تین برس پہلے وہاں پھر کوشش کی گئی تھی۔ وہ اندازہ ٹھیک نہیں تھا۔" بھارگو سگریٹ سلگانے لگا۔"

"خیر اپنا تجربہ سناؤ۔"

بھارگو لمبا کش لے کر بولا---- "خیال تھا' دھار کے پار میدان میں سات آٹھ دن سے زیادہ ٹھہرنا ضروری نہیں ہوگا۔ کوچ پڑاؤ کے لوگوں نے صلاح دی---- خچروں کے لئے اوپر گھاس اور دانہ لے جانا ضروری نہیں ہے۔ ضروری سمجھیں تو تھوڑا بہت دانہ ان کے لئے لے جائیں۔ دشوار گذار چڑھائیوں پر بوجھ ڈھونے سے بچنے کا خیال بھی رکھنا چاہیے۔

"نئی جگہ پر غروب آفتاب سے جتنا جلدی پہنچا جاسکے' اچھا رہتا ہے۔ سورج کی روشنی میں جگہ کو سمجھنے اور اسے ضرورت کے مطابق تیار کرنے میں آسانی رہتی ہے۔ گروپ لیڈر نے علی الصبح کچھ اندھیرے میں ہی ناشتہ دلوا دیا۔ آلہ جات' راشن اور تنبو' چھ خچروں پر لدوا دیے اور ہم دس شیرپا لوگوں کو ساتھ لے کر پو پھٹتے ہی چل پڑے۔ خچروں کے لئے دانہ نو دس بجے تک ملنا تھا۔ شیرپاؤں کا مکھیا اپنے باقی نو آدمیوں اور چھ خچروں کے ساتھ پیچھے رہ گیا تاکہ دانہ مل جانے پر بڑی برما مشین اور مشینوں کے لئے ایندھن لے کر ہمارے پیچھے آجائے۔"

"ہم نے دھار کا غیر ہموار درہ ساڑھے گیارہ بجے پار کرلیا۔ موسم کی پیشین گوئی میں شمال مغرب میں آسمان صاف رہنے کی امید ظاہر کی گئی تھی۔ مقامی لوگوں کو بھی دو تین ہفتے تک بارش یا برف کا اندیشہ نہیں تھا' لیکن ہم درے سے میدان میں اترے ہی تھے کہ شمال مغرب کی طرف سے گھنے کالے بادل اٹھنے لگے۔ بادلوں نے صرف اتنی مہلت دی کہ ہم میدان کے کنارے اونچی جگہ دیکھ کر تنبو (ٹینٹ) لگالیں۔ اگر ہم کھونٹے گاڑھنے اور ٹینٹ لگانے میں شیرپا لوگوں کی مدد نہیں کرتے تو ٹینٹ بھی نہیں لگ پاتے۔ ہمارے ٹینٹ لگے ہی تھے کہ شدید کڑک کے ساتھ اولے برسنے لگے۔

اولے اتنی تیزی سے اور اتنی مقدار میں گرے کہ دس منٹ میں ہی گھنی اونچی گھاس سے ڈھکا ہوا میدان، چاندی کے بڑے تھال کی طرح نظر آنے لگا۔ اولے دھار کی ڈھلانوں پر اور اوپر درے میں بھیگ رہے تھے۔ ہمیں اندیشہ ہوا کہ اگر اولے دھار کے اس طرف نہیں گرے ہوں گے تب بھی پیچھے آتے شیرپاؤں اور خچروں کے لئے درہ پار کرنا اور میدان تک اترنا دشوار ہوگیا ہوگا۔ تھوڑی دیر بعد اولوں کی اس سے بھی بھاری بوچھاریں شام تک آتی رہیں۔ ہم لوگوں نے سمجھ لیا کہ ہمارا ساتھی باقی پارٹی کو لے کر درے تک آیا بھی ہوگا تو اسے واپس جانا پڑا ہوگا۔"

"سورج ڈوبنے سے گھنٹہ بھر بعد ہم لوگوں نے جما ہوا پیرافن جلا کر کھانا گرم کیا اور کھاکر سردی سے بچنے کے لئے رضائی کے تھیلوں میں لیٹ گئے۔ بھوکے خچر اپنے ٹینٹ میں ہنہنا کر چارا مانگ رہے تھے۔ رات بھر ٹینٹ پر بار بار کھٹ کھٹ ہونے سے برف گرنے کا گمان ہوتا رہا۔ صبح اٹھ کر دیکھا کہ واقعی رات میں کافی برف باری ہوئی تھی۔ میدان میں بانس گاڑھنے پر وہ ڈیڑھ فٹ تک برف میں گھس جاتا تھا۔ میدان کے چاروں طرف ڈھلانوں پر بھی کافی برف جم گئی تھی۔ دھار کے درے میں بھی کافی برف بھر گئی تھی۔ خچر اپنے ٹینٹ میں اور زیادہ ہنہنا کر بھوک اور سردی کی شکایت کررہے تھے۔ ان کے ٹینٹ میں کچھ گرمی پیدا کرنے کے لئے تیل اور اسٹوو بھی نہیں تھے۔ وہ سہولت تو ہمارے لئے بھی نہیں تھی۔ ایندھن بعد میں آنے والا تھا۔ بارہ ہزار فٹ اونچی سطح پر ایندھن کے لائق جھاڑیاں یا درخت تو ہوتے ہی نہیں۔ آسمان میں اب بھی برفانی بادل چھائے ہوئے تھے۔ ایسی حالت میں کیا امید ہوتی کہ شیرپاؤں کا مکھیا دانا اور ایندھن لے کر آجائے گا۔

دوپہر سے پہلے ہی پھر برف باری ہونے لگی اور کم وبیش شام تک ہوتی رہی۔ وقت کاٹنے کے لئے کچھ چٹانوں پر گری ہوئی برف کھرچ کر دیکھتے رہے لیکن کام تو ہو نہیں سکتا تھا۔ صرف سردی ہی محسوس کرتے رہے۔ خچروں کی قابل رحم حالت، ان کی چارا مانگتی مضطرب نگاہیں اور اپنی لاچاری ہمیں اور بھی مایوس کر رہی تھی۔"

"رات میں پھر برف باری ہوئی۔ دوسرے دن صبح کے وقت بار بار برف گرتی رہی۔ میدان کے مقابلے میں دھار کی اونچائی پر اور درے میں زیادہ برف گر رہی

تھی۔ درہ چوڑے بھالے کی طرح، اوپر سے کھلا اور نیچے سے تنگ تھا۔ صاف دکھائی دے رہا تھا کہ درے کے اندر کی ڈھلانوں سے کچی برف کے گولے پھسل پھسل کر درے کو بھرتے جا رہے تھے۔ تیسرے دن تو رضائی کے تھیلے سے نکلنے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ اس اونچائی پر کمیاب ہوا میں معمولی حرکت سے بھی سانس پھولنے لگتی ہے۔ جسم کی طاقت کو قائم رکھنے کی فکر لگی رہتی تھی۔"

"تیسری رات بھی برف باری ہوئی اور صبح کو بھی بادل چھائے رہے۔ سردی کا کیا کہنا! تھرمامیٹر صفر سے پینتالیس درجے نیچے تھا۔ پورے کپڑے پہنے، رضائی کے تھیلوں میں لپیٹ کر کچھ پڑھ کر وقت گذارنے کی کوشش کی لیکن ناک بہے جا رہی تھی۔ سردی سے کنپٹی میں درد ہو رہا تھا۔ اندیشہ ہونے لگا کہ نیچے سے امداد آنے کی بات تو درکنار، واپس جانے کا راستہ بھی کم سے کم چار پانچ دن تک نہیں ملے گا۔ خچروں کی ہنہناہٹ سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ان کی گردنیں لٹک گئی تھیں۔ زیادہ سردی میں جسمانی قوت کے لئے زیادہ خوراک اور کیلوریز کی ضرورت ہوتی ہے اور خچر بے چارے، سخت محنت کے بعد بھی بالکل بھوکے تھے۔ اس وقت خچروں کے ٹینٹ سے عجیب وغریب خبر ملی کہ ایک خچر بھوک سے بے قرار ہو کر دوسرے خچروں کو کاٹنے کے لئے جھپٹ رہا تھا اور اس نے اپنے قریب کھڑے خچر کا کان کاٹ کر کھالیا تھا۔"

"کمال ہے!" پورن نے ٹوکا' گھوڑے یا خچروں کی گوشت خوری کی بات تو کبھی نہیں سنی!"

"کہہ تو رہا ہوں کہ عجیب وغریب خبر ملی!" بھارگو موقع پا کر نیا سگریٹ سلگانے لگا۔

پورن ہنس پڑا۔۔۔ "ارے آپ لوگ اپنے راشن میں سے ہی بے چارے خچروں کو کچھ دے دیتے!"

"یعنی ہمارے مقابلے خچروں کی جان زیادہ قیمتی تھی اور ہم سب کے آٹھ دن کے راشن سے ایک خچر کا ایک بار بھی پیٹ نہیں بھرتا!"

"میں نے صرف مذاق میں کہا تھا۔"

"ہاں، پانچویں دن برف باری نہیں ہوئی لیکن اگلے دن بھی گھنے بادل ہونے کی

وجہ سے برف باری کا امکان رہا۔ ناشتے کے دوران ہم لوگ سوچ رہے تھے کہ ایسے حالات میں جان بچانے کے لئے کیا کیا جاسکتا ہے اچانک خچروں کے ٹینٹ کے ایک شیرپانے آکر پریشانی ظاہر کی۔۔۔ کٹے ہوئے کان والا خچر لڑکھڑا کر گر پڑا ہے۔ خچر ابھی زندہ ہے اور اس کا کان کھا جانے والا خچر اسے کھانے کے لئے لپک رہا ہے۔ اسے روکتے ہیں تو وہ ہمیں کاٹتا ہے۔"

"ہم لوگ تجسس کے تحت اسے دیکھنے کے لئے گئے۔ شیرپا کی بات ٹھیک تھی۔ گوشت خور بن جانے والا خچر گرے ہوئے خچر کو کھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ سوچا' جو خچر گر پڑا ہے' اسے تو بچایا نہیں جاسکتا اگر دوسرا خچر اس سے اپنا پیٹ بھر سکتا ہے تو بھر لے۔"

"گروپ لیڈر نے خچر کے گوشت خور بن جانے کی بات پر مذاق کرتے ہوئے کہا۔۔ "کہیں ہم لوگوں کی بھی ایسی ہی حالت نہ ہوجائے!"

"عام اصول کے مطابق ہم لوگوں کے پاس ضرورت سے دوگنا راشن رہتا ہے۔ ہمارے راشن کا اسٹاک سولہ دن تک چل سکتا تھا۔ گروپ لیڈر نے حکم دیا کہ راشن اس طرح خرچ کیا جائے کہ کم از کم چار دن اور چل سکے۔ پیرافن بھی کم جلایا جائے اور شام کی چائے بند کردی جائے۔ اس خیال سے کہ ہمیں کم کھانے کا دھیان رکھنا ہے' سردی اور کمزوری زیادہ محسوس ہونے لگی۔"

"چھٹے دن دھوپ نکل آئی' لیکن درہ برف سے بھر جانے کی وجہ سے پار کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ ایک دن بعد ایک اور خچر بھوک سے لڑکھڑا کر گر پڑا۔ گوشت خور بن جانے والا خچر تب تک پہلے خچر کو ختم کر چکا تھا۔ وہ گوشت خور جانوروں۔۔۔۔ شیر چیتوں کی طرح خچر کے ڈھانچے کو توڑ نہیں سکا تھا' اوپر سے جتنا گوشت کھا سکتا تھا' کھا گیا۔ اس کو خوراک مل گئی۔ آٹھویں دن سے باقی خچر بھی گرنے لگے۔ گوشت خور بن جانے والا خچر ان سے گذر کرتا رہا۔ خچروں کے جسم بھوک کی وجہ سے سوکھ گئے تھے' ان میں گوشت ہی کتنا تھا!"

"چھ دن تک اچھی دھوپ لگ جانے سے ڈھلانوں پر جگہ جگہ برف پگھل گیا تھا لیکن درہ اب بھی پار نہیں کیا جاسکتا تھا اور میدان پر بھی چار انچ گہری برف کی تہہ

موجود تھی۔ درے کے داہنی طرف کچھ فاصلے پر سطح باقی دھار سے نیچی تھی۔ ہم لوگ دوربینیں لے کر اس جگہ کے بارے میں سوچ رہے تھے کہ اس برف کی تھالی میں بھوک سے جم کر مرجانے کے مقابلے نجات کی کوشش میں مرنا بہتر ہوگا۔"

"پچھلی شام کو اولے کے بادل پھر دکھائی دیے تھے۔ یہ غنیمت ہوا کہ تیز ہوا انہیں اڑا کر لے گئی لیکن ایسے بادل کسی بھی لمحے برس سکتے تھے۔ موسم کے خیال سے ایسا اندیشہ روز بہ روز بڑھ رہا تھا۔ اس سے ایک برس پہلے ہم سترہ ہزار فٹ کی اونچائی تک چڑھ چکے تھے۔ حالانکہ دھار صرف چودہ ہزار فٹ اونچی تھی پھر بھی وہ پار کرنے کے لائق نہیں رہتی تھی۔ برف تازہ اور کچا ہونے سے خچر یا دوسرے مویشی نہیں چڑھ سکتے تھے۔ اگر وہاں جانا ممکن ہے تو صرف انسان کا' کیوں کہ انسان جسمانی قوت سے ہی کام نہیں لیتا بلکہ اس میں غور و فکر کی صلاحیت بھی ہوتی ہے۔"

"ہم لوگوں نے گروپ لیڈر کے سامنے تجویز رکھی۔۔ ممکن ہے کوچ پڑاؤ میں لوگوں نے ہمیں ختم سمجھ کر ہماری تلاش بے کار سمجھ لی ہو۔ یہاں خچروں کی طرح بھوکے مرجانے سے بہتر ہے کہ ہم لوگوں میں سے دو آدمی درے کے نزدیک کسی نیچی جگہ سے دھار پار کرنے کی کوشش کریں اور اس طرف خبر دیں۔ وہ جگہ سوا میل سے زیادہ دور نہیں ہوگی۔ اگر ہم لوگ تین گھنٹے میں دھار کے اس پار نہ جاسکے تو لوٹ آئیں گے۔"

"گروپ لیڈر نے تجویز منظور نہیں کی۔ وہ اتنی کوشش سے تربیت دیے گئے اور اسپیشلسٹ لوگوں کو حتی الامکان پریشانی میں ڈالنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اس نے ہمارے سامنے تجویز رکھی کہ اس کام کے لئے شیرپا لوگوں کو منھ مانگے انعام کا یقین دلا کر آمادہ کیا جائے لیکن شیرپا ہمیں ساتھ لئے بغیر چلنے کو تیار نہیں تھے۔

"گیارہویں دن ایک نئی مصیبت کھڑی ہوگئی۔ گوشت خور خچر مردہ خچروں کو ختم کرچکا تھا۔ گھاس پر اب بھی ڈیڑھ دو انچ برف کی سخت تہہ تھی۔ اب وہ خچر بھوک سے بے قرار ہو کر آدمیوں پر جھپٹ رہا تھا۔ شیرپاؤں نے کہا کہ اسے گولی ماردی جائے ورنہ وہ آدمیوں کو گرا کر کھا جائے گا۔"

"گروپ لیڈر نے خچر کو گولی مارنے کی اجازت نہ دیتے ہوئے حکم دیا۔۔۔ اس

کے چاروں سموں (پیروں) میں بندھن ڈال دیے جائیں- یہ لگاتار کھاتا رہا ہے' اس لئے ابھی تین چار دن تک نہیں مرے گا- دھوپ رہی تو دو دن بعد اسے گھاس مل جائے گی-" اس نے اپنا مطلب بتایا--- پیچھے کے ڈیرے پر برامیٹ' بہت بھروسے کے لائق آدمی ہے- ممکن ہے' اسے خیال ہو کہ ہمارے پاس ابھی چار دن کا راشن ہے اس لئے اپنے آدمیوں کو کچے برف میں پھنسانے کا خطرہ مول نہیں لے رہا ہو- چار دن کی دھوپ بہت مددگار ہو سکتی ہے! وہ اس دن دوپہر بعد تک نہ آیا تو ہم اگلی صبح بھگوان کے بھروسے دھار کو پار کرنے کی کوشش کریں گے ہی' لیکن ہو سکتا ہے اس دوران پھر موسم دھوکا دے جائے اور ہمیں دو تین یا چار دن یہاں رکنا پڑ جائے- اس وقت یہ خچر ہماری خوراک بنے گا- اس کا گوشت پکانے کے لئے کافی ایندھن کی ضرورت ہوگی- اس کے لئے پیرافن بچاؤ' ڈبوں میں بند راشن گرم کرنے کی ضرورت نہیں- صرف ناشتے کے وقت ایک ایک پیالہ کافی بنائی جائے-"

"دو دن تک خوب دھوپ نکلی- میدان میں جگہ جگہ گھاس نظر آنے لگی- خچر کو گھاس کی طرف چھوڑ دیا گیا- وہ جلدی جلدی گھاس کھا رہا تھا اور ہم ٹینوں میں جما ہوا راشن نگل نگل کر جھرجھری محسوس کر رہے تھے- ہر ایک دن پہاڑ کی مانند محسوس ہو رہا تھا- دل چاہتا تھا کہ دھار کو پار کرنے میں جان ہی چلی جائے لیکن یہ پریشانی ختم ہو-"

"سولہویں دن ہم لوگوں نے گیارہ بجے سے ہی دھار کی طرف دوربینیں لگا دیں- درہ اب بھی پار کرنے لائق نہیں تھا- ہم لوگ اس کے قریب دھار پر نیچے کی سطح کی طرف دیکھ رہے تھے- تین بج گئے تو گروپ لیڈر نے مایوسی سے کہہ دیا--- "ان لوگوں نے اندازہ لگا لیا ہے کہ ہم لوگ برف میں دب چکے ہیں- وہ کچھ دیر تک دوربین سے دھار کی طرف دیکھتا رہا اور پھر بولا' "لیکن میری گذارش ہے کہ دو دن اور ٹھہرا جائے- ان لوگوں کے انتظار میں نہیں بلکہ صرف اس لئے کہ دو دن کی دھوپ سے وہاں جانے میں خطرہ کم ہو جائے گا-" اس نے دھار پر ایک جگہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا-"

"ہمارے لئے سردی اور پریشانی میں دو دن اور گذارنے کا تصور بھی ناقابل

برداشت تھا۔ دو ساتھی اتاؤلے ہو گئے۔۔۔ "ہم یہاں کھائیں گے کیا؟ دو دن بھوکے رہ کر اس دھار پر چڑھ پانے کی طاقت رہے گی؟"

"اسی وقت کے لئے تو وہ خچر ہے۔" گروپ لیڈر نے جواب دیا' "اب اس کا وقت آگیا ہے۔ چلو اسے ختم کردیں تاکہ روشنی میں ہی اسے چیرا جا سکے۔" وہ ریوالور لینے کے لئے ٹینٹ کے اندر گیا اور ہمیں دھار کے قریب ریڑھ پر' درے کے پاس دو شیرپا دکھائی دیے۔"

پورن چیخ پڑا۔۔۔ "واٹ لک! خچر بچ گیا!"

"لک کیا؟" بھارگو نے پوچھا' "باقی خچروں کو کیا ہم نے گولی مار دی تھی؟ اس خچر نے اس حالت میں کوشش کی اور بچ گیا۔"

"لیکن خچر گوشت خور نہیں ہوتے۔" پورن نے اصرار کیا' "یہ بات غیر قدرتی تھی۔"

"غیر قدرتی؟" بھارگو کے ماتھے پر بل آگئے' "کیا دنیا کے آغاز سے جانداروں کی شکل اور برتاؤ ہمیشہ ایک سے ہی رہے ہیں؟ جاندار اپنے وجود کی حفاظت کے لئے سبزی خور سے گوشت خور اور گوشت خور سے سبزی خور بنتے رہے ہیں۔ اتنا ہی نہیں' وہ پانی سے زمین کے اور زمین سے ہوا کے جانور بنتے رہے ہیں۔ جو جاندار حالات کے مطابق اپنی عادتیں نہیں بدل سکے' ان کا وجود مٹ گیا۔ ان کے ڈھانچے عجائب خانوں میں ملیں گے۔ جانداروں کا اپنے وجود کے تحفظ کی خاطر اپنے آپ کو اس طرح بدلتے رہنا ایک قدرتی عمل ہے۔"

"پھر بھی بات عجیب و غریب ضرور ہے۔"

"عجیب و غریب بات سننا چاہتے ہو! وہ بھی سناتا ہوں۔" بھارگو نئی سگریٹ سلگا کر سنانے لگا۔ "وہ میرے ٹریننگ کے زمانے کی بات ہے۔ ہم لوگ 'کنچن' کی دھاروں میں تھے۔ اس وقت بھی ہمارا کیمپ دس ہزار فٹ کی اونچائی پر تھا۔ ہمارا ٹرینر ایک جرمن تھا۔ ہم لوگ صبح کے وقت کوہ پیمائی کے لئے کیمپ سے ساڑھے تین ہزار فٹ اور اوپر گئے تھے۔ واپس آتے وقت زور دار بارش ہونے لگی۔ اس بارش میں نیزوں اور [illegible] اولوں کی بوچھاڑ سے دو دو' چار چار انچ کر کے اترنا پڑا۔ سورج غروب ہونے کے بعد ہی

کیمپ میں پہنچ سکے۔ بارش ایسی تھی کہ موٹے اونی واٹر پروف کپڑے ہونے پر بھی جلد کے سہارے پانی اندر بھر جاتا تھا۔ بیلٹ کھینچنے پر پانی پینٹ میں سے بہہ جاتا تھا۔ سردی ایسی تھی کہ جبڑے اینٹھ جانے کی وجہ سے منھ سے آواز نہیں نکلتی تھی۔ انگلیاں نیلی پڑ کر اینٹھ گئی تھیں۔ جوتے کے فیتے کاٹ کر ہی انہیں اتار سکے۔"

"کیمپ میں واپس آنے پر ٹرینر نے آرڈر دیا۔۔۔۔ سب لوگ پورے کپڑے اتار کر پروں کی رضائیوں کے تھیلوں میں گھس کر چار چار گھونٹ برانڈی پی لیں اور جسم کو جتنا رگڑا جاسکے، رگڑ لیں۔"

ہمارے گروپ میں جنوب کے ایک دھارمک رسوم کے پابند ویشنو براہمن بھی تھے۔ دوسروں کے سامنے بے لباس ہوجانا انہیں منظور نہیں تھا۔ وہ بھیگے بنیان، قمیض اور پینٹ پہنے ہوئے ہی رضائی کے تھیلے میں گھس گئے۔ پرم ویشنو آدمی تھے، برانڈی کیسے پی لیتے۔ برانڈی بھی انہوں نے نہیں پی۔ سردی کی وجہ سے چہرہ بھی تھیلے میں کرلیا۔ دوسرے دن سب کے اٹھ جانے کے بعد بھی وہ نہیں اٹھے۔ آواز دینے پر بھی ان کی آنکھ نہیں کھلی کافی کا پیالہ دینے کے لئے تھیلے کا منھ کھول کر دیکھا گیا تو ان کا منھ کھلا تھا۔"

"ویشنو وشنو لوک سدھار گئے؟"

"سیدھے۔" بھارگو نے سگریٹ کا لمبا کش لیا۔

"خیر!" پورن نے طنز سے ان کی تعریف کی، "اپنا دھرم وسواس تو نہیں چھوڑا۔"

بھارگو کا، ہونٹوں کی طرف سگریٹ لے جاتا ہاتھ رک گیا۔ "دھرم وشواس کیوں سنکار کہو! دیکھ لو، خچر نے حالات سے سمجھوتا کرکے اپنی حفاظت کرلی اور اور سنکار سے بندھا انسان حالات کے مطابق عمل نہیں کرسکا۔"

J.K. Offset Printers, Jama Masjid, Delhi-110006

ہمارے سماج میں ذات پات اور کم آمدنی کی بنیاد پر لوگوں کی تقسیم، دکھ اور مصیبتوں کو اس حد تک پہنچادیتی ہے جہاں خودکشی اور آتم گھات کے علاوہ اور کوئی راستہ باقی نہیں رہ جاتا۔ غیر انسانی اور بے رحمی کی یہی تصویر سماج کے ڈھانچے کے خلاف نفرت پیدا کرتی ہے۔ ہندی ادب کے مشہور کہانی کار یش پال کی کہانیوں کا سفر انہیں قدروں، مانیتاؤں، یقین اور حالات کے بگڑنے سے شروع ہوتا ہے۔ اسی لئے یش پال کی کہانیاں خدا، سماج اور جنسیات سے متعلق عملی مسائل پر بحث کرتی ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ یش پال جنسیات پر مبنی کہانیوں میں اپنے عروج پر ہیں لیکن عریانیت کا شائبہ بھی دیکھنے کو نہیں ملتا ہے۔ یش پال کے لئے سیکس، ایک ایسا سماجی مسئلہ ہے جو نہ جانے کتنی انفرادی برائیوں کو جنم دیتا ہے۔ مرد اور عورت کے تعلقات میں اخلاقیات کے استیصال کی صاف تصویر شاید یش پال کے یہاں ہی ملتی ہے۔ یش پال جنوبی ہندوستان کے درمیانی درجہ کے سماجی، سیاسی اور نفسیاتی مشکلات اور کرب کے مانے ہوئے کہانی کار ہیں۔

زیر نظر مجموعہ ان کی چنیدہ کہانیوں میں سے چھانٹ کر تیار کیا گیا ہے۔ شری راجندر یادو جنہوں نے کہانیوں کا انتخاب کیا اور کتابی شکل دی، خود ہندی کہانی کے میدان میں صف اول کے کہانی نگار ہیں۔ ان کی کوشش ہے کہ یش پال کی بہترین کہانیوں کا مجموعہ قاری کو پڑھنے کو مل سکے اور یش پال کے فن کو پہچاننے میں مدد ملے۔

سرورق تصویر: جتن داس

ISBN 81-237-2783-6

قیمت : 95.00

نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا

एकम् सूत्रे सकलम्